ہندوستان میں نفاذ شریعت

(ہندوستان میں احکام شریعت کے نفاذ پر ایک تحقیقی اور دستاویزی کتاب)

مولانا عتیق احمد بستوی

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیہ

ہندوستان میں نفاذ شریعت

مولانا عتیق احمد بستوی

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Printed by Maktaba Ahsan, Lucknow Mob: 9335982413

ناشر:

مجلس تحقیقات شرعیہ

ہندوستان
میں
نفاذ شریعت

(ہندوستان میں احکام شریعت کے نفاذ پر ایک تحقیقی اور دستاویزی کتاب)

مولانا عتیق احمد بستوی

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیہ

ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب : ہندوستان میں نفاذ شریعت

مصنف : مولانا عتیق احمد بستوی

ناشر : مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

موبائل: 09839776083

09236500677

صفحات : ۳۲۸

کمپوزنگ : عطاء الرحمٰن ندوی 6307505775

اشاعت دوم: اکتوبر ۲۰۲۲ء

قیمت : .....

تقسیم کار

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء، لکھنؤ

المکتبۃ الندویۃ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مکتبہ احسان مکارم نگر، لکھنؤ

انتساب

میں اپنی اس حقیر علمی کاوش کو والد گرامی جناب حاجی محمد رفیق مرحوم کی طرف منسوب کرتا ہوں، جن کی خالص دینی تربیت اور سحر گاہی، دعاؤں کی برکت سے احقر اس دینی خدمت کے لائق ہوا، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور آخرت میں بلند درجات سے نوازے۔

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم گل بہار توام

اجمالی فہرست

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا ایک اقتباس	۱۶
مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی تقریر سے ایک اقتباس	۱۷
حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا ارشاد گرامی	۱۸
مقدمہ: از: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم	۱۹
پیش لفظ (جدید): از مصنف	۲۳
پیش لفظ، از مصنف	۲۵
(۱) اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں موجودہ عدالتی رویہ	۳۱-۴۴
(۲) سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششیں	۴۶-۸۰
(۳) شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کی مخالفت کیوں؟	۸۲-۹۶
(۴) چند بنیادی باتیں	۹۸-۱۱۱
(۵) پس چہ باید کرد (اپنا جائزہ واحتساب اور راہِ عمل)	۱۱۳-۱۲۴
(۶) تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ کا جائزہ	۱۲۵-۱۳۵
(۷) متبنیٰ بل اور اسلامی تعلیمات	۱۳۶-۱۵۶
(۸) نفقۂ مطلقہ کے بارے میں پروفیسر مشیر الحق صاحب کے مقالہ کا جائزہ	۱۵۷-۱۷۹
(۹) عارف محمد خاں کے پارلیمانی بیان کا تجزیہ	۱۸۰-۲۰۱

(۱۰) اصغر علی انجینئر کے مضمون ''قرآن میں عورت کا درجہ'' کا علمی جائزہ ۲۰۲-۲۲۳
(۱۱) طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے فیصلے: ایک جائزہ ۲۲۵-۲۴۴
(۱۲) خاندانی اور گھریلو نزاعات کے حل میں دارالقضاء کا کردار ۲۴۶-۲۵۹
(۱۳) ہندوستان میں شریعت اسلامی کا تحفظ کیسے ہو؟ ۲۶۱-۲۶۸
(۱۴) بابری مسجد کی قانونی شہادت ۲۷۰-۲۷۵
(۱۵) قاضی ایکٹ ۔ضرورت ومقاصد: از مولوی محمد احمد کاظمی مرحوم ۲۷۶-۲۸۶
(۱۵) دستور ہند کی چند دفعات ۲۸۷-۲۹۱
(۱۷) مسلم پرسنل لا سے متعلق پارلیمنٹ سے منظور شدہ متفرق ایکٹ ۲۹۲-۳۲۳

☆☆☆☆

تفصیلی فہرست

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا ایک اقتباس ۱۶
مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی تقریر سے ایک اقتباس ۱۷
حضرت مولانا حسینؒ احمد مدنی کا ارشاد گرامی ۱۸
مقدمہ از حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ۱۹
پیش لفظ (جدید): از مصنف ۲۳
پیش لفظ: از مصنف ۲۵
(۱) اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں موجودہ عدالتی رویہ ۳۱
ہندوستانی عدلیہ کا طرز عمل ۳۱
موجودہ عدالتی رویہ پر تشویش وفکرمندی ۳۳
عدلیہ غلط فیصلوں سے مبرّا نہیں ہوتی ۳۴
فیصلہ کی بنیاد معاشی اور معاشرتی حالات ۳۵
سماج میں مردوں کے غلبہ کا شکوہ ۳۷
کیا شادی سے عورت کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے؟ ۳۷
ازدواجی رشتوں کا عدم استحکام ۳۸
اسلام کا نقطۂ نظر ۳۹
کیا رشتہ ٹوٹنے کے ہر کیس میں شوہر ہی قصوروار ہوتا ہے؟ ۴۰
عدلیہ سے کیا امید کی جائے ۴۱
فیصلے کا تضاد ۴۱

(۲) سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششیں ۴۸
فیصلہ کا خلاصہ ۴۸
فیصلہ کا تجزیہ ۵۰
سپریم کورٹ کا فیصلہ اور نومسلموں کی مشکلات ۵۲
بنیادی حقوق کی پامالی ۵۴
یکساں سول کوڈ کے مسئلہ کا قانونی اور تاریخی جائزہ ۵۴
دفعہ ۴۴ دستور ہند میں کس طرح شامل ہوئی ۵۵
دستور کی دفعہ ۲۵ اور دفعہ ۴۴ میں تضاد ۵۷
شریعت ایکٹ کا پس منظر ۵۹
تحریک آزادی اور مسلم پرسنل لا ۶۰
دستورِ ہند اور مسلمان ۶۰
یکساں سول کوڈ کی تشکیل وتنفیذ کی کوشش ۶۱
مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کی تشریح ۶۲
یکساں سول کوڈ اور مسلمان ۶۳
ہندو عائلی قوانین میں اصلاح کا مقصد ۶۴
چور دروازوں سے مسلم پرسنل لا میں مداخلت ۶۵
یکساں سول کوڈ اور بھاجپائی حکومتیں ۶۵
کیا صوبائی حکومتیں مسلم پرسنل لا میں مداخلت کرسکتی ہیں؟ ۶۶
جدوجہد کے چار میدان ۶۷
۱۔ دستوری وقانونی جدوجہد ۶۸
دفعہ ۴۴ کی منسوخی کے لئے جدوجہد ۶۸
یکساں سول کوڈ اور اقلیتیں ۶۸

یکساں سول کوڈ اور قومی یک جہتی ۶۹
ایک ناگزیر عمل ۷۲
پرسنل لاز کو دستوری تحفظ دینے کا مطالبہ ۷۲
مجوزہ قوانین کا جائزہ ۷۳
۲۔ علمی اور فکری محاذ (اسلام کے عائلی قوانین کی برتری) ۷۴
تصویر کا دوسرا رخ ۷۵
اہم ترین ذمہ داری ۷۵
یورپین کلچر اور عائلی قوانین ۷۶
۳۔ اصلاح معاشرہ ۷۷
۴۔ اسلامی نظام عدل کا قیام ۷۹
(۳) شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کی مخالفت کیوں؟ ۸۳
فکرمندی اور اضطراب کے اسباب ۸۴
اسلام پر دلخراش حملہ ۸۴
شرعی قوانین پر ضابطہ فوجداری کی بالادستی ۸۵
قرآن وسنت کی من مانی تشریح ۸۷
دوہرا عدالتی معیار ۸۸
قدیم عدالتی روایات سے انحراف ۸۹
یکساں سول کوڈ کی حمایت ووکالت ۹۲
لاشعور کی گواہی ۹۳
قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کا طریقہ ۹۴
حاصل کلام ۹۵
(۴) چند بنیادی باتیں ۹۹

خاتم النبیین محمد مصطفیٰ ﷺ محض ایلچی نہیں	۹۹
اسلامی قانون میں حدیث نبوی کا مقام	۱۰۰
قرآن سمجھنے کے لئے عربی زبان کی معمولی واقفیت کافی نہیں	۱۰۳
تفسیر قرآن کا طریقہ	۱۰۴
فتنۂ انکار حدیث کی پرچھائیں	۱۰۶
ہر فن میں اس کے ماہرین ہی کی رائے معتبر ہے	۱۰۸
قرآن کے آسان ہونے کا مطلب	۱۰۹
(۵) پس چہ باید کرد (اپنا جائزہ واحتساب اور راہِ عمل)	۱۱۴
اپنی زندگی اور سماج میں احکامِ شریعت کا اجراء	۱۱۵
نکاح کے بارے میں اسلامی ہدایات	۱۱۶
حسن معاشرت کا حکم	۱۱۷
رشتۂ نکاح ختم کرنے کے بارے میں ہدایات	۱۱۷
طلاق کا طریقہ	۱۱۸
احکام اسلامی سے روگردانی پریشانیوں کا اصل سبب	۱۱۹
مسلمانوں کی دو ذمہ داریاں	۱۱۹
ہر ضلع میں مسلمان قاضی کا تقرر	۱۱۹
ہندوستان اور نظام قضاء	۱۲۰
مسلمانوں کی قربانیوں کا بڑا محرک	۱۲۲
آزادی کے بعد	۱۲۳
مسلمانوں کی جانب سے قاضی کا تقرر	۱۲۳
(۶) تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ کا جائزہ	۱۲۶
کیا یہ دفعہ مسلم نادار مطلقہ کے درد کا مداوا ہے؟	۱۲۶

تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵	۱۲۶
تشریح اس باب کے تعلق سے	۱۲۷
ایک بنیادی بات	۱۲۸
دفعہ ۱۲۵ اسلام سے متصادم ہے	۱۲۸
عدت کے بعد دلایا جانے والا نفقہ عورت کے لئے حرام ہے	۱۳۰
موجودہ عدالتی نظام اور نادار مطلقہ عورت	۱۳۰
ناداری اور افلاس کا بدترین استحصال	۱۳۲
کیا طلاق ہر حال میں قابل تعزیر جرم ہے؟	۱۳۳
(۷) متبنیٰ بل اور اسلامی تعلیمات	۱۳۷
یتیم اور نادار بچوں کی کفالت	۱۳۷
یتیم اور نادار بچوں کے مسئلہ کا حل	۱۴۰
غریب پروری کے نام پر ورثا کی حق تلفی	۱۴۱
متبنیٰ بل کا تجزیہ	۱۴۳
چند اسلامی تصورات	۱۴۵
مال دراصل اللہ کی ملکیت ہے	۱۴۵
روزی اور اولاد کے فیصلے اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں	۱۴۶
نسبی اور نسلی رشتوں کو تبدیل کرنے کا انسان کو اختیار نہیں	۱۴۷
قانون تبنیت کے حامیوں کے دلائل	۱۴۹
پہلی دلیل کا جائزہ	۱۵۰
قانون تبنیت کے مفاسد	۱۵۱
بچوں کی تجارت	۱۵۲
کیا قانون تبنیت بچوں کی مشکلات کا حل ہے؟	۱۵۵

(۸) نفقۂ مطلقہ کے بارے میں پروفیسر مشیر الحق صاحب کے مقالہ کا جائزہ ۱۵۸
مقالہ کا خلاصہ ۱۵۸
زیر بحث مسئلہ قیاسی نہیں بلکہ منصوص ہے ۱۵۹
ایک مغالطہ ۱۶۱
مغالطہ کا ازالہ ۱۶۲
ایک سنگین اور خطرناک بات ۱۶۳
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں ۱۶۵
کیا نادار مطلقہ کا مسئلہ نیا ہے؟ ۱۶۵
نادار مطلقہ کا مسئلہ حدیث اور فقہ میں ۱۶۶
ایک بات جو بار بار دہرائی جاتی ہے ۱۶۷
قیاس کا تجزیہ ۱۶۸
اس قیاس کا دلچسپ پہلو ۱۶۹
دور قدیم میں ظالمانہ طلاق کے واقعات ۱۶۹
ایک ضروری وضاحت ۱۷۰
زیر بحث مسئلہ میں امام مالک اور امام احمد کے مسلک کی بنیاد ۱۷۱
امام مالک کے مسلک کی تفصیل ۱۷۲
یہ قیاس درست نہیں ہے ۱۷۳
سابقہ گفتگو کا خلاصہ ۱۷۳
ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم ۱۷۴
بعض غلطیاں ۱۷۵
پاکستان عائلی کمیشن کی رپورٹ کا حوالہ ۱۷۶

نادار مطلقہ کی مشکل کا حل ۱۷۶
موجودہ عدالتی نظام میں اصلاحات کی ضرورت ۱۷۸
(۹) عارف محمد خاں کی پارلیمانی بیان کا تجزیہ ۱۸۱
بیان کا پس منظر ۱۸۱
ژولیدہ بیانی کا اعلیٰ نمونہ ۱۸۳
پارلیمانی بیان ناقابل التفات ۱۸۳
بیان کا حاصل ۱۸۳
عارف محمد خاں کے مصادر اجتہاد ۱۸۵
عذر اور توجیہ ۱۸۵
عارف محمد خاں کا اپنے موقف پر اصرار ۱۸۷
سستی شہرت مہنگی پڑے گی ۱۸۷
وزیر صاحب کی خوش فہمی ۱۸۸
عارف محمد خاں کے استدلال کی بنیاد ۱۸۸
ترجمہ اصل قانون کی جگہ نہیں لے سکتا ۱۸۹
ترجمہ کی نزاکت ۱۹۰
متاع کا ترجمہ ''مینٹی نینس'' (نان نفقہ) کرنا سنگین غلطی ہے ۱۹۱
اس ترجمہ کے نتائج واثرات ۱۹۱
جمہور مفسرین کی تفسیر وتشریح ۱۹۲
مولانا دریابادی کے ترجمہ سے استدلال ۱۹۳
تین طلاق کی غیر متعلق بحث ۱۹۴
احکام شریعت میں تبدیلی کا اختیار کسی کو نہیں ۱۹۵
ذرا غور کیجئے ۱۹۶

صحابہ سے بے اعتمادی ۱۹۶
ایک مجلس کی تین طلاق کا حکم ۱۹۷
تین طلاق کا مسئلہ خیر القرون میں ۱۹۸
بنیادی اصطلاحات سے بے خبری ۲۰۰
(۱۰) اصغر علی انجینئر کے مضمون ''قرآن میں عورت کا درجہ'' کا علمی جائزہ ۲۰۳
قرآن قیامت تک کے لئے کتابِ ہدایت ۲۰۴
نبی اکرم ﷺ قرآن کے مفسر وشارح ۲۰۴
محض رائے وقیاس اور صرف لغت کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر ۲۰۵
انجینئر صاحب کے دو اصول ۲۰۶
آیات قرآنی کی ایک نئی تقسیم ۲۰۶
دائمی آیات اور ہنگامی آیات ۲۰۷
اسلام میں عورت کا مقام اور مرد وعورت کا باہمی رشتہ ۲۰۸
مرد اور عورت میں تقسیمِ کار ۲۰۹
وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم انسانی ذہن ۲۱۰
عورت کے منصب ومقام کی نئی حد بندی ۲۱۰
عورت پر دوہری ذمہ داری ۲۱۱
مغربی ممالک میں عورت کی صورت حال ۲۱۲
آزادئ نسواں کا فریب ۲۱۳
آیات قرآنی کے معانی میں تحریف ۲۱۳
دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر کیوں؟ ۲۱۴
انجینئر صاحب کی دوسری قینچی ۲۱۶

آیات قرآنی کی ایک اور نئی تقسیم ۲۱۷
انجینئر صاحب کی مشقِ اجتہاد ۲۱۹
فقہ اسلامی کے خلاف تبرا بازی ۲۲۰
دانشوری کا ایک نمونہ ۲۲۱
(۱۱) طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے فیصلے: ایک جائزہ ۲۲۵
سپریم کورٹ کے فیصلہ کا جائزہ ۲۲۷
طلاق سے متعلق مختلف غلط فیصلوں جائزہ ۲۳۲
(۱۲) خاندانی اور گھریلو نزاعات کے حل میں دار القضاء کا کردار ۲۴۶
نظام قضاء اور مسلمان ۲۴۶
ہندوستان میں قضاء شرعی کا نظام ۲۴۶
انگریزی دور میں نظام قضاء ۲۴۷
شریعت ایکٹ کے بعد ۲۴۹
علماء کا کارنامہ ۲۵۰
آزادی کے بعد ۲۵۱
نظام قضاء کی ضرورت ۲۵۲
نصب قاضی کا شرعی حکم ۲۵۳
ہندوستان میں قضاء شرعی کی ضرورت ۲۵۴
دار القضاء قائم کرنے کی کوششیں ۲۵۶
بورڈ کی طرف سے دار القضاء قائم کرنے کی کوششیں ۲۵۷
(۱۳) ہندوستان میں شریعتِ اسلامی کا تحفظ کیسے ہو؟ ۲۶۱
(۱۴) بابری مسجد کی قانونی شہادت ۲۷۰

(۱۵) قاضی ایکٹ-ضرورت ومقاصداز: مولوی محمد احمد کاظمی مرحوم ۲۷۸
قاضی القضاۃ ۲۸۲
مسلمانوں کی موجودہ ضرورت ۲۸۶
(۱۶) دستور ہند کی چند دفعات ۲۸۸
(۱۷) مسلم پرسنل لا سے متعلق پارلیمنٹ سے منظور شدہ متفرق ایکٹ ۲۹۴
۱۔ مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء ۲۹۴
۲۔ مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء (۱۹۳۷ء کا ۲۶ واں ایکٹ ۲۹۶
۱۔ فسخ نکاح (خلع) ایکٹ ۱۹۳۹ء ۲۹۹
۲۔ فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء (۱۹۳۹ء کا آٹھواں ایکٹ) ۳۰۲
۱۔ قاضی ایکٹ ۱۹۸۰ء ۳۰۶
۲۔ قاضی ایکٹ ۱۸۸۰ء (۹/جولائی ۱۸۸۰ء) ۳۱۰
۱۔ مسلم خواتین (طلاق کی صورت میں حقوق کا تحفظ) ۳۱۲
۲۔ مسلم خواتین (طلاق ہونے پر حقوق کا تحفظ) ایکٹ ۱۹۸۶ء ۳۱۵
(۱۹۸۶ء کا ۲۵ واں ایکٹ)
۱۔ کچی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء (۱۹۳۸ء کا دسواں ایکٹ) ۳۲۱
۲۔ کچی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء ۳۲۲

☆☆☆☆

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا

ایک اقتباس

اسلام کے احکام کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو، چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں، اور مدرسوں کے اندر شب و روز لوگ ان کا درس دیتے ہیں، پس گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں۔ یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو، یا پھر اعلان کر دے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پروا نہیں ہے، نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی۔

اس کے بعد مسلمانوں کے لئے نہایت آسان ہو جائے گا کہ اپنا وقت بے سود شور و فغاں میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کریں۔

(مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب ص ۲۰۴-۲۰۵، طبع ثانی، تصنیف: مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم)

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی تقریر سے ایک اقتباس

مجھ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ ہندو یا کسی اور ترقی پسند مذہب کے پیرو اپنے مذہب کے لئے کوئی قانون منظور کرائیں، لیکن میرا مذہب ترقی پسند نہیں، اس کا قانون خدا کی طرف سے بنا ہوا ہے، جیسا کہ میں نے اپنے بیان میں بتایا ہے، جو ۹ر نومبر ۱۹۲۹ء کو مسلمان علماء کے اس وفد کی طرف سے ہز اکسلنسی وائسرائے (Excellency) کو پیش کیا جس کی قیادت میں نے کی، اس کی ایک نقل میں یہاں منسلک کرتا ہوں، اس قسم کے اہم مسائل کا فیصلہ جلد بازی میں نہ کرنا چاہئے اور جب کوئی ایسا موقع آئے گا تو میں اس پر نگاہ رکھوں گا کہ کم از کم مسلمانوں کے مذہب کو انسان کے بنائے ہوئے قوانین سے بالاتر رکھنا چاہئے، خواہ قوانین ہندوستان یا برطانیہ کے پارلیمنٹ میں کیوں نہ بنائے جائیں، اس کے بغیر مسلمان کسی دستور کے وفادار نہیں ہو سکتے۔

(مولانا محمد علی کی یاد میں، ص: ۲۵۶، مصنفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم)

حضرت مولانا حسینؒ احمد مدنی کا ارشاد گرامی

اس بارے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے جو لکھنؤ کی آل مسلم پارٹیز میں پیش آیا، وہ اگرچہ مسلمانوں کی خالص آزاد خیال جماعتوں کا اجتماع تھا، تاہم ان کے مباحثوں اور حجتوں میں پورے چار روز صرف ہو گئے تھے، ادھر الہ آباد میں آل پارٹیز کانفرنس کے لوگ لکھنؤ مسلم کانفرنس کے نمائندوں کے منتظر تھے جو کسی فیصلہ پر نہ پہنچ پاتے تھے، اسی اثناء میں کسی نے مولانا سید حسین احمد مدنی سے جو چاروں دنوں کے جلسوں میں خاموش بیٹھے رہے تھے پوچھا کہ حضرت آپ فرمائیے کہ اس بارے میں جمعیۃ العلماء کی رائے کیا ہے؟ آپ نے بڑے سکون سے فرمایا:

> ''ہمارا تو ایک مطالبہ ہے جو ہم کانگریس کو دے چکے، وہ یہ کہ ملک کو اختیارات ملنے پر مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات طے کرنے کے لئے قاضی مقرر کرنے کا حق عطا کیا جائے، اور ہم نے کہہ دیا ہے کہ جب تک کہ ملک کو آزادی حاصل نہ ہو ہم خاموشی کے ساتھ آزادی کی جنگ میں شریک رہیں گے، البتہ آزادی ملنے پر ہمیں یہ حق نہ ملا تو پھر اگر اس وقت ہم میں قوت ہوگی تو ہم اسے منوالیں گے۔''

(مسلمانوں کا روشن مستقبل، دوسرا ایڈیشن، ص ۵۱۶-۵۱۷، مصنفہ سید طفیل منگلوری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين، خاتم النبيين، سيدنا محمد، وعلى آله وصحبه وعلى من تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أما بعد:

مذہب اسلام انسانی زندگی کو مناسب اور صحت مندانہ عمل رکھنے والی زندگی بنانے کا جامع مذہب ہے، وہ اپنی جامعیت کے تحت زندگی کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے، اور ان پہلوؤں کو پروردگار عالم کی عطا کردہ ہدایات کا پابند بناتا ہے، اسلام کا لفظ اسی مفہوم پر مشتمل ہے، یہ اپنے کو حوالہ کردینے کا مفہوم ہے، یعنی اپنے کو اپنے پروردگار اللہ تعالیٰ کے حوالے کردینا جو کہ ساری کائنات کا خالق و مالک ہے، اور ساری مخلوقات کا رب واحد ہے، زندگی اسی کی دی ہوئی ہے، سب اس کے بندے ہیں، لہٰذا اسی کی بندگی کرنے کی ان پر ذمہ داری ہے۔ بندگی کی یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آسان رکھی ہے تاکہ انسان بسہولت اس کو انجام دے سکے، اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''دین پر عمل کرنا آسان ہے''، اس کے احکام کو مشکل نہیں رکھا گیا ہے، لیکن ان پر عمل ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس پر جزا و سزا

طے فرمائی ہے، لہٰذا سزا کے ڈر سے اور جزا کے شوق میں ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

جو لوگ دین کے متعلق یہ باتیں نہیں جانتے وہ اسلام کے مذہبی احکام کو اسی طرح کے احکام سمجھ کر جو انسانی دستور ساز بناتے ہیں، ان میں وقت اور زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کی بات کرتے ہیں، حالانکہ یہ احکامات خدائی احکامات ہونے کی بنا پر قابل تغیر و تبدل نہیں ہیں۔

اس ملک میں چونکہ مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں، اور اکثریت غیر مسلموں کی ہے، اور ملک نے جو راستہ سیکولرازم کا اختیار کیا ہے، اس کی رو سے یہاں کے باشندوں کو مذہب کے معاملے میں اپنے اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کا اختیار ہے، یہ اختیار اسلام میں خدائی احکام کا پابند ہے، لہٰذا بعض آوازیں جو تغیر و تبدل کی اٹھتی ہیں، ناواقف لوگوں پر ان کا غلط اثر پڑسکتا ہے کہ ان کو صحیح سمجھ کر حکومت ان کے رجحان کو قبول نہ کرلے، یا عدالت اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہ کردے، اس لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم کیا گیا، جس میں اسلام کے ہر مسلک والوں کی نمائندگی ہے تاکہ تحفظ شریعت کے سلسلہ میں رائے متفقہ رہے، اور الحمدللہ اس کا فائدہ ہو رہا ہے، لیکن موجودہ دور میں جدید تعلیم یافتہ لوگ زیادہ ہیں، جو عموماً دین کی باتیں وضاحت کے ساتھ نہیں جانتے، اس لئے کسی بات کی تشریح یا کسی کے خیال کی تردید مناسب دلائل کے ساتھ انجام دینا ہے، اس لئے شریعت اسلامی کے تحفظ کی فکر کرنے والے اہل علم وقتاً فوقتاً ایسے مضامین پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن سے شریعت کی اہمیت کا اظہار ہو اور اعتراضات کا صحیح فکر کے مطابق نہ ہونے کی وضاحت ہو۔

اس طرح کے مضامین شائع کرنے والوں میں مولانا عتیق احمد صاحب بستوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء و کنوینر دارالقضاء کمیٹی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ ان کے مضامین میں سلجھے انداز میں شریعت اسلامی کی اہمیت و ضرورت کا اظہار ہوتا ہے، انہوں نے اپنے مضامین کا انتخاب ایک کتابی صورت میں کردیا ہے، جو بعض تو شریعت اسلامی کے بعض پہلوؤں کی وضاحت میں ہیں، اور بعض معترضین کے جواب میں ہیں، یہ کتاب ''ہندوستان میں نفاذ شریعت'' کے نام سے شائع ہونے جارہی ہے، امید ہے

کہ کتاب بہت مفید ہوگی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور نافع بنائے۔ آمین!

مجھے مسرت ہے کہ ''ہندوستان میں نفاذ شریعت'' کا تازہ ایڈیشن کافی اضافوں کے ساتھ مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کی طرف سے شائع ہونے جارہا ہے، میری دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولت سے نوازے، اور اسلام کے عائلی قوانین پر کئے جانے والے اعتراضات وشبہات کے ازالہ میں یہ کتاب کامیاب ثابت ہو۔

(حضرت مولانا سید) محمد رابع حسنی ندوی (دامت برکاتہم)
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

۱۴/ربیع الاول ۱۴۴۴ھ
۱۱/۱۰/۲۰۲۲ء

☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ (جدید)

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی خاتم الأنبیاء والمرسلین، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین، أما بعد!

اسلام کے عائلی قوانین واسلامی شریعت کی تشریح اور مدافعت میں میرے مضامین کا ایک مجموعہ ''ہندوستان میں نفاذ شریعت'' کے نام سے شائع ہوا تھا، جسے اہل علم نے خاص طور سے بہت پسند فرمایا، ان میں سے متعدد مضامین ہندوستان کی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کے بعض فیصلوں کے جائزہ اور تنقید پر مشتمل تھے، اس کتاب کی اشاعت پر دس سال سے زیادہ کا عرصہ گذرا، اس کے بعد سپریم کورٹ کے مزید مخالف شریعت فیصلے آئے، جن پر تنقید اور جائزہ کا کچھ کام احقر کو کرنا پڑا، ان میں سے بعض مضامین کو وکلاء اور علماء پر مشتمل بعض جلسوں میں پیش کیا گیا، حاضرین نے اسے پسند فرمایا، اور ان کی اشاعت پر اصرار کیا۔

ان تازہ مضامین کو کتاب میں شامل کر کے ''ہندوستان میں نفاذ شریعت'' کا تازہ ایڈیشن مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کی طرف سے شائع ہو رہا ہے، امید ہے کہ اہل علم وفکر کے حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا، اور یہ کتاب اسلام کے بعض عائلی قوانین کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگی۔

اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کا گرانقدر مقدمہ ہے، جو بعینہٖ اس ایڈیشن میں بھی شامل

اشاعت ہے، اور اسی مقدمہ میں تازہ ایڈیشن کے لئے حضرت موصوف کی طرف سے چند سطروں کا اضافہ بھی شامل ہے، اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی عمر اور صحت میں برکت دے، اور ان کے فیوض کا سلسلہ ہم پر جاری رکھے، آمین ثم آمین۔

۹/ اکتوبر ۲۰۲۲ء

عتیق احمد بستوی
(ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ)
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا
صدر معہد الشریعۃ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کا مسئلہ انتہائی نازک اور فیصلہ کن دور سے گذر رہا ہے، انگریزوں کی غلامی کے دور میں ہمارے بزرگوں نے تحفظِ شریعت کے میدان میں جو کچھ حاصل کیا تھا ملک کی آزادی کے بعد مسلمانانِ ہند کے لئے ان کامرانیوں کو باقی رکھنا انتہائی مشکل ہو رہا ہے۔

۱۹۳۷ء کا اطلاق شریعت ایکٹ جو موجودہ ہندوستان میں تحفظ شریعت کی اساس ہے عدالتوں کے مختلف فیصلوں اور حکومتوں کے وضع کردہ قوانین اور احکام کی زد میں آکر حرف بے معنی ہوتا جا رہا ہے، طلاق کے بارے میں مختلف ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے فیصلے اسلام کے قانون طلاق کو لہولہان کر رہے ہیں اور اسلام کے عائلی قوانین کو کتاب وسنت کے صراط مستقیم سے ہٹا رہے ہیں۔

مسلمان پورے ملک میں اپنے طور پر اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے کی جو کوششیں نظام قضاء، شرعی پنچایت، دارالافتاء وغیرہ کے ذریعہ کر رہے ہیں ان پر قانونی پابندی عائد کرنے کی پوری تیاری ہے، چنانچہ سپریم کورٹ میں ایک کیس دارالقضاء، دارالافتاء پر پابندی عائد کرانے اور انہیں غیر قانونی قرار دینے کے لئے دائر ہے، مدھیہ پردیش ہائی کورٹ (جبل پور) نے چند ماہ قبل دارالقضاء بھوپال کی سرگرمیوں پر عارضی امتناع کا آرڈر جاری کر دیا ہے۔

شبنم ہاشمی نامی ایک خاتون نے مسلمانوں پر تبنیت (لے پالک) کا قانون نافذ

کرانے کے لئے سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر رکھی ہے، کیرالا کی ایک نام نہاد مسلم تنظیم نے کیرالا ہائی کورٹ میں اسلام کے قانون میراث کو چیلنج کیا ہے، اس طرح کے متعدد مقدمات میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مسلمانوں کی طرف سے پیروی کر رہا ہے۔

شاہ بانو کیس کے فیصلہ سے جو طوفان اٹھا وہ تھمنے کا نام نہیں لیتا، بلکہ اس کی طغیانی بڑھتی جا رہی ہے، مسلمانوں نے مطلقہ بل (۱۹۸۶ء) کی صورت میں جو حصولیابی کی تھی اسے سپریم کورٹ نے دانیال لطیفی کیس کے فیصلے میں پلٹ کر رکھ دیا، اس طرح شاہ بانو کیس کا فیصلہ پھر سپریم کورٹ کی راہ سے واپس آ گیا۔

سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت کم مسلمانوں کو اس سنگین اور نازک صورت حال کا علم واحساس ہے، عامۃ المسلمین ہی نہیں، خواص امت کی بہت کم تعداد اس سے باخبر اور اس کے بارے میں فکرمند ہے۔

حالات کا صحیح ادراک اور تجزیہ مستقبل کی منصوبہ بندی کے لئے پہلی شرط ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے اگر اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کو درپیش خطرات کا ادراک واحساس ملت اسلامیہ ہندیہ کے ایک بڑے طبقے کو ہو جائے تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری یہ محنت ٹھکانے لگی۔

''تندیِ بادمخالف'' سے ہمت ہارنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ امت کی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے حالات سے نبرد آزما ہونے اور مضبوط عمل نیز منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، ایک شاعر نے بالکل سچ کہا ہے ؎

تندیِ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

زیر نظر کتاب میرے مختلف نئے پرانے مضامین کا مجموعہ ہے، موضوع کے اشتراک اور یکسانیت نے انہیں ایک کتاب کی شکل دیدی ہے، زیادہ تر مضامین شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ آنے کے بعد لکھے گئے ہیں، پارلیمنٹ میں مطلقہ بل (۱۹۸۶ء) پاس ہونے

اوراس کی مخالفت میں اٹھنے والے طوفان نے بھی کچھ مضامین لکھوائے، کتاب میں شامل پہلا مضمون (اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں عدالتی رویہ) بالکل نیا ہے، بعض مضامین پہلے کے لکھے ہوئے ہیں لیکن ان کی اشاعت پہلی بار ہورہی ہے، (مثلاً ''چند بنیادی باتیں''، ''پس چہ باید کرد'')۔

چند تنقیدی مضامین اسلامی شریعت کے دفاع وحمایت میں اس وقت لکھے گئے تھے جب پارلیمنٹ اور عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں قانون شریعت کا معرکہ گرم تھا، ممکن ہے کہ ان مضامین کے اسلوب وانداز میں ان حالات کا کچھ عکس نظر آئے، پھر بھی ان مضامین میں اسلامی قوانین کی تشریح اور دفاع سے متعلق جو اہم نکات آگئے ہیں ان کی وجہ سے ان مضامین کی افادیت دائمی ہے، اس لئے انہیں بھی کتاب کا حصہ بنالیا گیا۔

اس کتاب میں میرے مضامین کے علاوہ تین مزید چیزیں شامل ہیں (۱) دستور ہند کی کچھ دفعات (۲) مسلم پرسنل لا کے بارے میں پارلیمنٹ سے منظور شدہ مختلف ایکٹ (۳) محمد احمد کاظمی مرحوم کی ایک تحریر جس میں ہندوستان میں نظام قضا کے قیام کی کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، امید ہے کہ ان تینوں چیزوں کی شمولیت سے کتاب کی افادیت اور قدر وقیمت میں کافی اضافہ ہوجائے گا۔

میں بارگاہ رب العزت میں سراپا شکر وسپاس کہ اس نے محض اپنے فضل سے اپنے دین وشریعت سے ایک نسبت عطا کی اور دین وشریعت کی خدمت اور اس کی نصرت ودفاع میں کچھ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔

مخدوم گرامی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کے لئے میرے پاس شکریہ کے الفاظ نہیں ہیں، انہوں نے میری ادنیٰ گذارش پر اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود بہت تھوڑے وقت میں کتاب کے لئے قیمتی مقدمہ تحریر فرمایا، اللہ تعالیٰ ان کی عمر وصحت میں برکت عطا فرمائے اور انکا سایہ امت مسلمہ کے سروں پر تادیر قائم رکھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو شرف قبولیت سے نوازے، تمام انسانوں کے لئے نافع بنائے اور مصنف کے لئے ذخیرہ آخرت بنائے۔

عتیق احمد بستوی

۱۴۳۱/۰۳/۲۵ھ — استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۲۰۱۰/۰۳/۱۲ء — سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

صدر معہد الشریعۃ لکھنؤ

☆☆☆☆

اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں موجودہ عدالتی رویہ

اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں موجودہ عدالتی رویہ

ہندوستانی عدلیہ کا طرز عمل

احقر نے ۱۹۸۷ء میں اپنی کتاب ''ہندوستان اور نظام قضاء'' کے مقدمہ میں ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کو لاحق خطرات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا تھا:

''ادھر چند برس سے ہندوستانی عدلیہ کا طرز عمل بھی اسلامی عائلی قوانین کے تعلق سے مسلمانوں کے لئے خاصا پریشان کن اور اضطراب انگیز ہوگیا ہے، ہندوستان کا یہ معزز ادارہ جس نے متعدد موقعوں پر عدل وانصاف کا نام روشن کیا، اور انتہائی نازک موقعوں پر بڑے عادلانہ اور جرأت مندانہ فیصلے دیے مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں گومگو میں مبتلا نظر آتا ہے اور مسلم پرسنل لا کے قضیہ میں اس کی حیثیت جج کے بجائے فریق کی ہوگئی ہے، ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ کی آئینی بنچ نے شاہ بانو کیس میں جو فیصلہ دیا اس نے عدلیہ کے اس خطرناک رجحان کو واضح کر دیا، اس فیصلہ میں ایک طرف بڑے صریح اور تیکھے انداز میں حکومت کو یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مشورہ دیا گیا، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ''شریعت ایکٹ'' کی پابندی عدلیہ کو سخت ناگوار ہے،

دوسری طرف نفقۂ مطلقہ اور حقوقِ مطلقہ کے سلسلہ کی قرآنی آیات کی ایسی من مانی تشریح کی گئی جس کی تائید چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں کسی مفسر، فقیہ وعالم کے قول سے نہیں ہوتی، اس فیصلے میں قرآنی آیات کی من مانی تعبیر وتشریح کی جو نظیر قائم کی گئی تھی اگر وہ باقی رہتی تو ''شریعت ایکٹ'' حرفِ بے معنی ہوکر رہ جاتا اور ہمارے دقیقہ سنج، نکتہ رس، ماہرین قانون جس قانون پر چاہتے کھینچ تان کر قرآن وسنت کی قباف کر دیتے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے بالکل بروقت اس فیصلے کے خلاف رائے عامہ بیدار کی، بورڈ کی قیادت نے بڑی جرأت ودانشمندی سے اس فیصلے کے خلاف تحریک چلائی، مسلمانان ہند نے بڑے جوش وخروش سے اس تحریک کا استقبال کیا اور اسے تعاون دیا، بالآخر مسلمانوں کی سنجیدہ اور بامقصد جدوجہد رنگ لائی، مسلمانوں کی ہندوستان گیر تحریک اور دانشمندانہ افہام وتفہیم کے نتیجہ میں شاہ بانو کیس کے تباہ کن اثرات زائل کرنے کے لئے ہندوستان کی پارلیمنٹ نے مطلقہ بل منظور کیا، مطلقہ بل کے خلاف سپریم کورٹ میں متعدد رٹ دائر ہیں، اس لئے مطلقہ بل ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے، اس کے علاوہ مسلم خواتین کے دائر کردہ متعدد مقدمات مختلف ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہیں، جن میں مسلم پرسنل لا کو کلاً یا جزءاً چیلنج کیا گیا ہے۔''

(ہندوستان اور نظام قضاء ص ۱۶ تا ۱۸، دوسرا ایڈیشن)

احقر نے تقریباً ۲۳ سال پہلے ہندوستانی عدلیہ کی جس روش کا شکوہ کیا تھا، اس میں ماہ بہ ماہ، سال بہ سال اضافہ ہی ہوتا گیا، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس تک کے فاضل ججز ایسے فیصلے دے رہے ہیں جن میں اسلامی قانون کو پامال کیا گیا ہے اور قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی من مانی تشریح کی گئی ہے، فاضل ججز کا پورا احترام کرنے کے باوجود ہم یہ لکھنے پر مجبور

ہیں کہ اسلامی قانون کے اصل مصادر جس زبان میں ہیں (عربی زبان) اس سے وہ حضرات ناواقف ہیں، قرآن کریم، کتب احادیث اور فقہ کی بنیادی کتابوں تک ان کی رسائی نہیں ہے، نہ انہیں اسلامی قانون تفصیل سے پڑھنے کا موقع ملا ہے، پھر بھی وہ ایسے ایسے فیصلے کر رہے ہیں جو قرآن وسنت اور اسلامی قانون کے سراسر خلاف ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ یہ فیصلے قرآن وحدیث اور اسلامی قانون کے نام پر کیے جارہے ہیں۔

ان فیصلوں سے پہلے اگر ہماری عدالتوں نے کچھ وکلاء اور ماہرین سے مدد لی ہو اور ان کی فراہم کردہ معلومات اور بحثوں کی بنیاد پر یہ فیصلے کیے ہوں تو ہم پورے ادب کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قرآن وحدیث اور اسلامی قانون کے بارے میں ان وکلاء اور ماہرین کا مطالعہ بڑا غلط بلکہ گمراہ کن ہے۔

موجودہ عدالتی رویہ پر تشویش وفکرمندی

اس گلوبل دور میں اسلامی شریعت کے بارے میں ہماری معزز عدالتوں کے یہ فیصلے پوشیدہ نہیں رہ سکتے، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے فیصلے تو کتابی صورت میں شائع ہوتے ہیں اور اب تو انٹرنیٹ کا دور ہے جس میں بڑی سرعت کے ساتھ علوم وافکار یہاں سے وہاں منتقل ہوتے رہتے ہیں، ہم بڑی تشویش اور فکرمندی کے ساتھ سوچتے ہیں کہ جب اس طرح کے فیصلے مسلم اور غیر مسلم ممالک کے علماء اور ماہرین اسلامی قانون کے نگاہوں سے گذرتے ہوں گے تو وہ ہماری عدالت ہائے عالیہ کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہوں گے۔

اسلام کے عائلی اور معاشرتی قوانین (نکاح، طلاق، میراث وغیرہ) ہماری اسمبلیوں یا پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین نہیں ہیں جن کی مختلف تعبیر وتشریح کرنے کی عدالتوں کے لئے بڑی گنجائش ہو بلکہ اسلام کے عائلی اور معاشرتی قوانین کی بنیادیں کتاب وسنت میں استوار ہیں، چودہ سو سال سے یہ قوانین دنیا کے مختلف براعظموں اور ملکوں میں نافذ

ہیں، انسانی تاریخ کے بہترین دماغوں (صحابہ، تابعین، مجتہدین وغیرہ) نے ان قوانین کی تشریح وتعبیر کا فریضہ انجام دیا ہے، اس قانون میں ایسا کوئی ابہام اور خلا نہیں ہے جسے دور کرنے اور پُر کرنے کے لئے ہماری عدالتوں کے فاضل ججوں کو محنت اور مغز ماری کرنی پڑے۔

اسلامی شریعت کے تعلق سے ہر وہ رائے اور فیصلہ ناقابل قبول ہے جس کا ثبوت نہ قرآن وسنت سے ہے اور نہ اسلامی فقہ کے ذخیرہ میں اس کا کوئی سراغ لگتا ہے، ملک کی آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی ایک مدت تک ہماری عدلیہ بھی اس کی پابند تھی کہ اسلامی قانون اور کتاب وسنت کی تشریح من مانے طریقے پر نہ کرے۔

عدلیہ غلط فیصلوں سے مبرّا نہیں ہوتی

بمبئی ہائی کورٹ (اورنگ آباد برانچ) کے فاضل ججز نے رٹ پٹیشن ۹۴-۲۰۰۰ (ڈگرو ولد چھوٹو پٹھان بہ نام رحیم بی) کے فیصلہ میں طلاق کے ایک مسئلہ میں مختلف ہائیکورٹس اور پریوی کونسل کے فیصلوں سے اختلاف کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات لکھ دی ہے۔

> ''غلط فیصلوں سے مبرّا ہونا عدلیہ کی صفت نہیں ہے، مسلم علماء نے یہ رائے دی ہے کہ اسلامی قانون کی ہند برطانوی عدلیہ نے جو تشریح کی ہے وہ قرآن مجید یا ارشاد نبوی (حدیث) کی منصفانہ ترجمانی نہیں کرتی، جب ڈاؤننگ اسٹریٹ (لندن) کی جوڈیشیل کمیٹی میں ہندوستان کی منو اور عرب کے (حضرت) محمد ﷺ کے قوانین کی تشریح کی جائے گی تو تھوڑی بہت تحریف وتبدیلی لازمی ہے، کسی ثقافت کی روح شرعی قانون اس فرقہ کے تہذیبی اصول ومعیار کا تشکیلی اور نافذ العمل ہونے کا اظہار ہوتا ہے جسے اجنبی ذہن پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔'' (پیراگراف نمبر ۱۸، مسلم پرسنل لا اور عدالتوں کے فیصلے ص ۸۳)

ہمیں انتہائی تکلیف اور افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ بمبئی ہائی کورٹ (اورنگ آباد بنچ) کے فاضل ججز نے اسلامی قانون کی ہند برطانوی عدلیہ کے ذریعہ جس قسم کی تشریح کا شکوہ کیا ہے اس سے دسیوں گنا زیادہ شکوہ علماء اسلام اور ماہرین قانون شریعت کو خالص ہندوستانی عدلیہ کے بہت سے فیصلوں سے ہے جن میں ہائی کورٹس ہی نہیں سپریم کورٹ کے مختلف فیصلے بھی شامل ہیں، ان فیصلوں میں اسلامی قانون کی تشریح کرنے کے بجائے من مانی قانون سازی کی گئی ہے اور اپنے من پسند نظریہ وخیال پر کھینچ تان کر شریعت کی قبافٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بمبئی ہائی کورٹ کے زیر بحث فیصلہ سے پہلے ہم سپریم کورٹ کے ایک فیصلہ کا ایک اقتباس پیش کررہے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے فاضل ججز اسلامی قانون کی تعبیر وتشریح کن بنیادوں پر کرنے لگے ہیں، مطلقہ بل ۱۹۸۶ء کے خلاف دانیال لطیفی وغیرہ کے دائر کردہ مقدمات رٹ پٹیشن سول نمبر ۸۶۸ سال ۱۹۸۶ء (جن میں مطلقہ بل کے آئینی جواز کو چیلنج کیا گیا تھا) کا فیصلہ کرتے ہوئے پیرا گراف نمبر ۲۰ میں معزز ججز نے لکھا ہے۔

فیصلہ کی بنیاد معاشی اور معاشرتی حالات

''۲۰- ایسے معاملات ودفعات کی تشریح کرتے ہوئے جن میں ازدواجی تعلقات زیر بحث آئیں ہمیں اپنے سماج میں مروج معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھنا ہوگا، ہمارے سماج (خواہ اس کا تعلق اکثریت کے فرقے سے ہو یا اقلیت سے) میں جو بات نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان معاشی وسائل کے اعتبار سے بہت زیادہ عدم یکسانیت ہے، ہمارے سماج میں معاشی اور معاشرتی طور پر مردوں کا غلبہ ہے، اور عورتوں کو خواہ وہ سوسائٹی کے کسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہوں ہمیشہ ایک ماتحت کا رول (کردار) ادا کرنا پڑتا ہے، شادی ہوجانے کے بعد اکثر اعلی تعلیم یافتہ عورتوں کو بھی اپنے تمام دیگر مشاغل سے دستبردار ہوجانا پڑتا ہے اور وہ اپنے خاندان کی دیکھ بھال اور فلاح کے لئے خود کو وقف کردیتی ہیں،

خصوصاً اپنے شوہر کے تعلق سے، اس کے جذبات واحساسات اور ذہنی وجسمانی صلاحیتیں سب شادی شدہ زندگی میں تحلیل ہوجاتی ہیں اور وہ اپنی انفرادیت کی ایک ایسی عظیم اور مقدس قربانی دیتی ہے جس کی قیمت واہمیت کو دولت کی میزان پر نہیں تولا جاسکتا، جب اس نوعیت کا یہ رشتہ ٹوٹتا ہے تو اس کی جذباتی شکستگی اور شادی شدہ زندگی پر اپنا سب کچھ لٹا دینے کے نقصان کی تلافی کے لئے ہم کیا کرتے ہیں؟ کسی کے پاس اس کا جواب نہیں ہے، یہ کہنا صرف ایک تھوڑا سا بہلاوا ہے کہ ایسی عورت کو اس کی گذر بسر کے لئے رقم ادا کی جائے، اور اس قسم کی راحت جو صنفی مساوات اور سماجی انصاف کے حصول کی بنیادی حقوق کا حصہ ہے اسے عالمی طور پر ہر مذہب کے لوگ تسلیم کرتے ہیں۔

اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مسلم لا ایک مختلف قسم کی ذمہ داری ایسے عناصر کو سونپنا چاہتا ہے جو عائلی زندگی سے غیر متعلق ہیں، جیسے وہ لوگ جو اس خاتون کی جائداد واثاثے کے وارث ہوں گے یا پھر وقف بورڈ، اس قسم کا انداز فکر ہمارے نزدیک ایک طرح سے سماجی حقائق کو مسخ کرنا ہے، ایسے عالمی وسعت واہمیت رکھنے والے سماجی مسائل جو بنیادی انسانی حقوق، ثقافت، زندگی کے وقار وشائستگی اور سماجی انصاف حاصل کرنے کے ضروری تقاضوں سے تعلق رکھتے ہوں، ان کو مذہب یا مذاہب، عقیدہ، قومیت مسلک، نسل یا فرقہ وارانہ عوامل کو چھوڑ کر دیگر پہلوؤں سے حل کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے، اس پہلو کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم زیر بحث ایکٹ کی دفعات کی تشریح کریں گے۔'' (مسلم پرسنل لا اور عدالتوں کے فیصلے ص ۲۴-۲۵ شائع کردہ لیگل سل آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نئی دہلی)

رٹ پٹیشن سول نمبر ۸۶۷ سال ۱۹۸۶ء بعدالت سپریم کورٹ آف انڈیا (دانیال لطیفی ودیگر بہ نام یونین آف انڈیا) میں سپریم کورٹ کی آئینی بنچ (جو پانچ ججز پر مشتمل تھی) نے ستمبر ۲۰۰۱ء میں جو فیصلہ دیا اس کا ایک تمہیدی حصہ اوپر نقل کیا گیا، اس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ہماری عدالت عالیہ کے فاضل جج صاحبان کا انداز فکر یہ ہے کہ وہ اسلامی قانون بابت نکاح وطلاق کی تعبیر وتشریح میں قرآن وحدیث اور بنیادی کتب فقہ کو زیادہ

اہمیت دینے کے بجائے اصل اہمیت سماجی ومعاشی حالات کو دیں گے اور اسی عینک سے آیات واحادیث اور قانون اسلامی کی تشریح کریں گے، سماجی ومعاشی حالات کے بارے میں ان کا مطالعہ ان کے فیصلوں کی بنیاد بنے گا۔

آئینی بنچ کے فاضل ججز نے مذکورہ بالا پیراگراف میں جو جذباتی گفتگو کی ہے اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے پر اس کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے اور استدلال انتہائی کمزور نظر آتا ہے، فاضل ججز کا ارشاد ہے۔

سماج میں مردوں کا غلبہ کا شکوہ

''ہمارے سماج میں معاشی اور معاشرتی طور پر مردوں کا غلبہ ہے اور عورتوں کو خواہ وہ سوسائٹی کے کسی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں ایک ماتحت کا رول ادا کرنا پڑتا ہے۔''

سوال یہ ہے کہ کیا یہ صرف ہمارے ملک اور سماج کی بات ہے؟ دنیا کا کون سا ملک یا سماج ہے جس میں معاشی اور معاشرتی طور پر مردوں کے بجائے عورتوں کا غلبہ ہے یا دونوں بالکل برابر پوزیشن میں ہیں؟ کیا دنیا کے کسی بڑے سے بڑے ترقی یافتہ ملک (امریکہ اور یورپ کے ممالک) کے بارے میں بھی بتایا جاسکتا ہے کہ وہاں معاشی اور معاشرتی طور پر عورتوں کا غلبہ ہے، غلبہ تو ہمیشہ مردوں کا رہے گا، لیکن مردوں کے غلبہ کا مطلب عورتوں کی مظلومیت نہیں، اللہ سے ڈرنے والے مرد غالب ہونے کے باوجود عورتوں کے ساتھ انصاف کرتے ہیں، ان کے ساتھ عادلانہ ہی نہیں بلکہ فیاضانہ برتاؤ کرتے ہیں۔

کیا شادی سے عورت کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے؟

فاضل ججز لکھتے ہیں:

''شادی ہوجانے کے بعد اکثر اعلی تعلیم یافتہ عورتوں کو بھی اپنے تمام دیگر مشاغل سے دستبردار ہوجانا پڑتا ہے اور وہ اپنے خاندان کی دیکھ بھال اور

فلاح کے لئے خود کو وقف کردیتی ہیں خصوصاً اپنے شوہر کے تعلق سے، اس کے جذبات واحساسات اور ذہنی وجسمانی صلاحیتیں سب شادی شدہ زندگی میں تحلیل ہوجاتی ہیں اور وہ اپنی انفرادیت کی ایک ایسی عظیم اور مقدس قربانی دیتی ہے جس کی قیمت واہمیت کو دولت کی میزان پر تولا نہیں جاسکتا۔''

جس وقت ہمارے فاضل ججز نے مذکولاہ بالا سماجی تجزیہ پیش کیا تھا اس وقت ممکن ہے کہ ان کا تجزیہ بڑی حد تک درست رہا ہو، اب تو صورت حال اس سے کافی مختلف ہے، اب تو ہمارے نوجوانوں کا ایک طبقہ اعلی تعلیم یافتہ عورتوں سے بلکہ برسرروزگار عورتوں سے نکاح اسی لئے کرتا ہے کہ ان کی تنخواہوں سے ٹھاٹ کے ساتھ گھر کا خرچ چل سکے اور اگر خود بھی ملازمت اور کاروبار سے جڑ سکے تو معیار زندگی مزید بلند ہوجائے، ماں باپ دونوں کی ملازمت اور مصروفیات نے گھر کو ویران کردیا ہے، بچوں کو ماں کی شفقت ومحبت اور باپ کی مشفقانہ تربیت سے محروم کردیا ہے اس کی وجہ سے ایسا تربیتی اور سماجی بحران پیدا ہوگیا ہے جس نے ماہرین سماجیات کی عقلوں کو حیران وپریشان کردیا ہے، معاش کی اس دوڑ کی وجہ سے نئی نسل کی ذہنی تربیت کا کام بری طرح متاثر ہوا ہے اور بچے مختلف قسم کی جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوتے جارہے ہیں، معصوم اور بے زبان بچے تو اس قابل نہیں ہیں کہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹا سکیں اور عدالت عالیہ تک اپنا درد وکرب پہنچا سکیں۔

ازدواجی رشتوں کا عدم استحکام

دوسری طرف میاں بیوی دونوں کی معاشی خود کفالتی اور معاشی دوڑ بھاگ نے ازدواجی رشتوں کے استحکام کو بری طرح متاثر کیا ہے، میاں بیوی جب دونوں اچھی ملازمت سے جڑے ہوتے ہیں، دونوں معاشی لحاظ سے پورے طور پر خود کفیل ہوتے ہیں اور دونوں معاش کی دوڑ سے تھکے ہارے گھر واپس آتے ہیں تو دونوں کے ازدواجی تعلقات میں گرم

جوشی باقی نہیں رہتی، ایک دوسرے کی بات برداشت کرنے کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے اس کے نتیجے میں ازدواجی رشتوں میں دراڑ پڑنے لگتی ہے اور خوشگوار ازدواجی زندگی کا خواب چکنا چور ہونے لگتا ہے اور انتہائی تلخی کے ساتھ رشتہ ختم ہونے کی نوبت آجاتی ہے، ایسی صورت میں جب قانون اور عدالت زبردستی اس رشتے کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو ان کی زندگی میں زہر گھل جاتا ہے اور دونوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

میاں بیوی کا بعض معاملات میں ایک دوسرے پر انحصار ازدواجی رشتے کو قوت بخشتا ہے اور رشتے کو ٹوٹنے سے بچاتا ہے، آج کل ہمارے ملک میں عورتوں کو ملازمت اور کاروبار میں لانے اور مردوں کو بے روزگاری کے دلدل میں پھینکنے کی جو ہوڑ چل رہی ہے اس کے تباہ کن اثرات سامنے آنے شروع ہو گئے ہیں اور چند سالوں میں اس کی ہولناکی بالکل عیاں ہو جائے گی، مردوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا ہے جو عورتوں کی کمائی پر عیش کر رہا ہے، ان میں سے کچھ تو امور خانہ داری کسی طرح سنبھال لیتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو امور خانہ داری بھی انہیں عورتوں کے سر پر لادتے ہیں جو کاموں کے بوجھ سے تھک کر گھر واپس آتی ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر

ہماری عدالت عالیہ سماجی صورتحال کی جو بھی عکاسی کرے لیکن اسلام اس نقطۂ نظر کو بالکل مسترد کرتا ہے کہ شادی کرنے سے عورت اپنی انفرادیت کھو دیتی ہے، ''اپنی انفرادیت کی عظیم اور مقدس قربانی'' کا نظریہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض دوسرے مذاہب اور اقوام کے تعلق سے درست ہو (مثلاً ہندو مذہب) لیکن اسلام اس نظریہ کی سختی سے تردید کرتا ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق نکاح سے نہ عورت اپنے خاندان سے (جہاں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی) کٹ جاتی ہے اور نہ ہی وہ انفرادیت کھو دیتی ہے جیسا کہ ہندو مذہب کی تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے، شادی کے بعد بھی تمام خاندانی رشتے اور ان سے جنم لینے والے

حقوق و فرائض برقرار رہتے ہیں اور شادی سے عورت کی انفرادیت تحلیل نہیں ہوتی بلکہ میاں بیوی دونوں کی شخصیت اور انفرادیت میں نکھار آتا ہے، بیوی کے مالی، سماجی اور معاشرتی حقوق میں شادی کے بعد اضافہ ہی ہوتا ہے، شادی کے ذریعہ ''انفرادیت کی عظیم اور مقدس قربانی'' ہی کا نظریہ تھا جس نے ستی جیسی رسم کو ہندو مذہب میں قابل قبول بلکہ کارِ ثواب بنا دیا تھا، کاش کہ ہماری عدالت عالیہ کے قلم سے اس نظریہ کی تحسین نہ ہوتی۔

کیا رشتہ ٹوٹنے کے ہر کیس میں شوہر ہی قصوروار ہوتا ہے؟

رشتہ ٹوٹنے کا ذکر ہمارے قابل احترام فاضل ججز نے جس جذباتی انداز میں کیا ہے اسے ہم عدلیہ کا لب ولہجہ تو نہیں کہہ سکتے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رشتہ ٹوٹنے کے ہر کیس میں شوہر ہی کی زیادتی ہوتی ہے، عورت ہمیشہ مظلوم ہی ہوتی ہے، حالانکہ یہ صورت حال کی صحیح عکاسی نہیں ہے، بہت سے کیسز میں عورتوں کی زیادتیاں ہوتی ہیں بلکہ عورتوں کے اصرار ومطالبہ پر رشتہ ختم کیا جاتا ہے، اگر ایسے معاملات بیس فیصد ہی ہوں تو بھی عدلیہ کو اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

عدالت عالیہ کے فاضل ججز لکھتے ہیں:

> ''اور اس قسم کی راحت جو صنفی مساوات اور سماجی انصاف کے حصوں کے بنیادی حقوق کا حصہ ہے اسے عالمی طور پر ہر مذہب کے لوگ تسلیم کرتے ہیں اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مسلم لا ایک مختلف قسم کی ذمہ داری ایسے عناصر کو سونپنا چاہتا ہے جو عائلی زندگی سے غیر متعلق ہیں جیسے وہ لوگ جو اس خاتون کی جائداد واثاثے کے وارث ہوں گے یا پھر وقف بورڈ اور اس قسم کا انداز فکر ہمارے نزدیک ایک طرح سے سماجی حقائق کو مسخ کرتا ہے، ایسے عالمی وسعت واہمیت رکھنے والے سماجی مسائل جو بنیادی انسانی حقوق، ثقافت، زندگی کے وقار اور شائستگی اور سماجی انصاف حاصل کرنے کے

ضروری تقاضوں سے تعلق رکھتے ہوں، ان کو مذہب یا مذاہب، عقیدہ، قومیت، مسلک، نسل یا فرقہ وارانہ عوامل کو چھوڑ کر دیگر پہلوؤں سے حل کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے، اس پہلو کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم زیر بحث ایکٹ کی دفعات کی تشریح کریں گے۔''

عدلیہ سے کیا امید کی جائے

جب ہماری عدالت عالیہ بلند بانگ دعووں کے ساتھ مسلمانوں کے نکاح وطلاق کے مسائل کو اسلامی قانون کی روشنی میں حل کرنے کے بجائے صنفی مساوات، سماجی انصاف اور بنیادی حقوق کے حوالہ سے حل کرنا چاہتی ہے اور یہ تلقین کررہی ہے کہ ''ان مسائل کو مذہب، عقیدہ، قومیت، مسلک، نسل یا فرقہ وارانہ عوامل کو چھوڑ کر دیگر پہلوؤں سے حل کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے'' تو اب اس سے کوئی شکوہ شکایت بیکار ہے، سپریم کورٹ نے اپنے متعدد فیصلوں میں حکومت ہند پر زور دیا ہے کہ دستور کی دفعہ نمبر ۴۴ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے یونیفارم سول کوڈ (یکساں شہری قانون) مرتب کرکے نافذ کرے، ہماری عدالت عالیہ نے محسوس کیا کہ اتنے اہم کام سے حکومتیں اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر پہلو تہی کررہی ہیں تو ہمارے فاضل ججز نے طے کرلیا کہ اپنے فیصلوں کے ذریعہ قانون سازی کے اس مقدس کام کو ہمیں انجام دینا ہے اور یونیفارم سول کوڈ کو ایک حقیقت واقعہ بنا کر رہنا ہے۔

۱۹۳۷ء کا شریعت ایکٹ جو ہماری عدلیہ کو سنگ گراں محسوس ہورہا تھا اسے اپنے فیصلوں کی ٹھوکر سے ریزہ ریزہ کرنے کا عمل جاری ہے، عدالت عالیہ کا سگنل پاکر نیچے کی عدالتوں نے بھی اسلام کے عائلی قوانین کو پامال کرنے والے فیصلوں کی جھڑی لگادی۔

فیصلے کا تضاد

طرفہ تماشا یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے فاضل ججز ایک طرف یہ ریمارک کرتے ہیں:

''یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مسلم لا ایک مختلف قسم کی ذمہ داری ایسے عناصر کو سونپنا

چاہتا ہے جو عائلی زندگی سے غیر متعلق ہیں جیسے وہ لوگ جو اس خاتون کی جائداد واثاثے کے وارث ہوں گے یا پھر وقف بورڈ، اور اس قسم کا انداز فکر ہمارے نزدیک ایک طرح سے سماجی حقائق کو مسخ کرنا ہے۔''

دوسری طرف اسی فیصلہ کے پیراگراف نمبر ۳۶-۱۱۱- میں لکھتے ہیں:

''ایک مسلم مطلقہ عورت جس نے دوسری شادی نہیں کی ہے اور جو عدت کے بعد اپنا خرچہ خود برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے تو دفعہ نمبر ۴ کے تحت ان رشتہ داروں کے خلاف استغاثہ کرسکتی ہے جو اسی مطلقہ عورت کی موت کے بعد مسلم قانون کے مطابق ان کی جائداد اثاثوں وغیرہ کے تناسب کے اعتبار سے وارث ہوں گے اور جن میں اس کے بچے بھی شامل ہیں اور جن کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مطلقہ عورت کی وراثت کے تناسب کے اعتبار سے کفالت کا بار برداشت کریں، اگر ان رشتہ داروں میں سے کسی رشتہ دار میں کفالت کا بار اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو مجسٹریٹ اس ایکٹ کے تحت وقف بورڈ کو ہدایت جاری کرسکتا ہے کہ وہ یہ خرچہ ادا کرے۔'' (مسلم پرسنل لا اور عدالتوں کے فیصلے ص ۳۸، ۳۹)

سپریم کورٹ کی یہ آئینی بنچ مسلم مطلقہ خاتون پر اتنی مہربان ہے کہ عدت کے بعد اس عورت کے نان ونفقہ کا دوہرا نظم کردیا ہے، ایک طلاق دینے والے شوہر کی طرف سے، دوسرا رشتہ داروں یا وقف بورڈ کی طرف سے۔

سپریم کورٹ کی آئینی بنچ کے فیصلہ کا ایک اقتباس یہ بتانے کے لئے نقل کیا گیا کہ ہمارے فاضل ججز اب اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور خالص اسلامی قانون سے متعلق ایک بل (مسلم مطلقہ بل) کی تشریح کن بنیادوں پر کررہے ہیں، فی الحال تو ہم بمبئی ہائی کورٹ (اورنگ آباد بنچ) کے طلاق سے متعلق ایک فیصلہ کا مختصر اقتباس نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، بمبئی ہائی کورٹ کا فیصلہ طلاق کے لئے ایسی شرطیں

عائد کرتا ہے جس کا کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں ملتا، یہ عدالت کی طبع زاد شرطیں ہیں جس کے لئے بعض آیات قرآنی کا سہارا لیا گیا ہے۔

فیصلہ کے پیراگراف نمبر ۲۶ میں ہے:

''اوپر کی بحث سے واضح ہوجاتا ہے کہ شوہر کی طرف سے صرف طلاق کے الفاظ ادا کرنا یا طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کرنا یا اس کا یہ قول کہ وہ پہلے ہی طلاق دے چکا ہے کافی نہیں ہیں، اور قانون کے مطلوبات کو پورا نہیں کرتے، طلاق کا حق استعمال کرنے کے لئے شوہر کو لازم ہے کہ وہ پہلے مصالحت کے لئے ثالثوں کی کوشش کی شرط پوری کرے، اور طلاق کے لئے معقول وجہ بیان کرے، بیوی کو طلاق دینے کے ارادے سے مطلع کرنا ہی قانونی مطلوبات کے لئے کافی نہیں ہے، اگر کوئی عورت عدالت میں طلاق کے خلاف استغاثہ دائر کرے تو شوہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ طلاق کے بارے میں جملہ شرائط پر عمل کرے یعنی بیوی کو اپنے ارادے سے مطلع کرے، ثالثوں کی تقرری، ثالثوں کے ذریعہ مصالحتی کوششوں کا آغاز، فریقین کے درمیان مصالحت ناکام ہونے کی وجوہات، طلاق کی معقول وجہ اور تمام کوششوں کی ناکامی کے بعد طلاق دینے کے ثبوت فراہم کرے، محض عدالت میں تحریری یا اور کسی شکل میں بیان دینے یا زبانی طور پر گواہی دینے سے کہ شوہر ماضی قریب میں اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔'' (مسلم پرسنل لا اور عدالتوں کے فیصلے ص ۹۸، ۹۹)

بمبئی ہائی کورٹ (اورنگ آباد بنچ) کے مذکورہ بالا فیصلہ کا مختصر جائزہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری اور خانقاہ رحمانیہ مونگیر کے سجادہ نشیں حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے اپنے رسالہ (طلاق کے متعلق بمبئی ہائی کورٹ کا تازہ فیصلہ عدالتی روایات کے

پس منظر میں) لیا ہے۔

مولانا موصوف کا جائزہ مختصر ہونے کے باوجود بڑا عالمانہ اور دانشورانہ ہے لیکن اس فیصلہ کے تفصیلی جائزہ کی ضرورت اب بھی باقی ہے، خصوصاً اس لئے کہ سپریم کورٹ نے شمیم آراء کیس (کریمنل اپیل ۴۶۵ (۱۹۹۶ء) فیصلہ ۱/اکتوبر ۲۰۰۲ء) میں جو فیصلہ صادر کیا ہے اس میں زیادہ تر بمبئی ہائی کورٹ کے فیصلہ میں ذکر کردہ دلائل اور حوالوں کو بنیاد بنایا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہی سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے کچھ اس طرح کے فیصلوں کا علمی تجزیہ پیش کیا جائے گا، تاکہ علمی اور قانونی حلقے ان فیصلوں کی کمزوریوں اور بھیانک غلطیوں سے واقف ہوسکیں۔

☆☆☆☆

سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ
اور
یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششیں

سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ

اور

یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششیں

۱۰ رمئی ۱۹۹۵ء کو سپریم کورٹ کے دو ججوں جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس آر، ایم سہائے پر مشتمل ایک بنچ نے تبدیلیٔ مذہب کے بعد دوسری شادی کے بارے میں جو فیصلہ دیا اس کے نتیجہ میں ایک بار پھر یکساں سول کوڈ کا مسئلہ قومی صحافت کی شاہ سرخی بن گیا، اس فیصلہ نے ہندوستان کے مسلمانوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں میں بجا طور پر اضطراب کی لہر دوڑا دی۔

فیصلہ کا خلاصہ

چار ہندو عورتوں نے اپنے شوہروں کے خلاف یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کے شوہروں نے اسلام قبول کیا اور دوسری شادیاں کرلیں، لہٰذا ان کے شوہروں پر تعزیرات ہند کی دفعہ نمبر ۴۹۴ کا اطلاق کرتے ہوئے دوسری شادی کو باطل ٹھہرایا جائے اور سزا نافذ کی جائے۔

سپریم کورٹ نے حالیہ فیصلہ میں ہندو عورتوں کی دادرسی کرتے ہوئے ان کے نومسلم شوہروں کی دوسری شادی کو باطل اور غیر قانونی قرار دیا اور کہا کہ ایک ہندو شوہر کا مذہب اسلام قبول کرلینے کے بعد دوسری شادی کرلینا انصاف، مساوات اور نیک چلنی کی صریح خلاف ورزی ہے، اور انصاف کی اصل روح کی بنیاد پر شادی ناجائز ہے۔

سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے زیر بحث مقدمہ کے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے اپنے فیصلوں میں سارا زور یکساں سول کوڈ کے نفاذ پر دیا ہے، ان کے اس فیصلہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورتوں پر ہونے والے مظالم اور دوسری سماجی خرابیوں کا اصل سبب یکساں سول کوڈ کا عدم نفاذ ہے، اور جس دن یکساں سول کوڈ ملک میں نافذ ہوجائے گا تمام سماجی خرابیاں دور ہوجائیں گی اور عورتوں پر مظالم کا سلسلہ یکسر موقوف ہوجائے گا۔

فاضل ججوں کو شکوہ ہے کہ اب تک کی تمام حکومتوں نے دستور کی دفعہ نمبر ۴۴ (جس میں یکساں سول کوڈ جاری کرنے کی سفارش کی گئی ہے) کو نظر انداز کیا اور اس سمت میں قدم نہیں اٹھائے، حالیہ فیصلہ میں حکومت ہند کو یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور حکومت کو ہدایت دی گئی ہے کہ اگست ۱۹۹۶ء تک ایک حلف نامہ داخل کرے جس میں اس بات کی وضاحت ہو کہ تمام شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کے سلسلہ میں اس نے کیا کیا اقدامات کئے۔

جسٹس کلدیپ کے نزدیک یکساں سول کوڈ سے مراد ہندو کوڈ بل ہے ان کے نزدیک یکساں سول کوڈ کے نام پر ہندو کوڈ بل تمام شہریوں پر نافذ کردینا چاہئے، موصوف لکھتے ہیں:

> ''جب ہندوستان کے اسی فیصد سے زیادہ شہری ایک پارلیمنٹ کے ذریعہ مدون شدہ پرسنل لا کے تحت لائے جاچکے ہیں (اشارہ ہے ہندو قانون نکاح، ہندو قانون وراثت، ہندو قانون طفولیت وولدیت اور ہندو قانون تبنیت، ہندو کوڈ بل کی طرف جو ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۶ء میں پارلیمنٹ نے مدون کئے) تو کوئی وجہ نہیں کہ یونیفارم سول کوڈ کیوں نہ نافذ کردیا جائے۔''

دستور ہند کی دفعہ نمبر ۲۵ میں ہندوستان کے ہر شہری کو اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق دیا گیا ہے، نکاح، طلاق وغیرہ کا مذہبی عمل ہونا اتنی بدیہی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، دنیا کے تقریباً ہر

سماج میں اسے مذہبی عمل تصور کیا جاتا ہے، اسی لئے جسٹس آر، ایم سہائے نے بھی اپنے علیحدی فیصلہ میں اعتراف کیا ہے، ''نکاح، طلاق، وراثت اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسے ہی مذہبی ہیں جیسے مذہبی اعتقادات اگنی کے ساتھ سات پھیرے، یا قاضی کے سامنے ایجاب وقبول ایسے ہی اعتقادی اعمال ہیں جیسے کہ خود عملی عبادت، لیکن پرسنل لاز کو سبوتاژ کرنے کے حد درجہ شوق میں جسٹس کلدیپ نے مذکورہ بالا بدیہی حقیقت کا بھی انکار کردیا ہے، موصوف لکھتے ہیں:

> ''آرٹیکل چوالیس اس تصور پر مبنی ہے کہ ایک مہذب اور متمدن سوسائٹی میں مذہب اور پرسنل لا کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا دستور کا آرٹیکل پچیس مذہبی آزادی کی ضمانت تو ضرور دیتا ہے لیکن آرٹیکل چوالیس معاشرتی تعلقات اور پرسنل لا کو مذہب کے دائرہ سے خارج کردیتا ہے۔''

فیصلہ کا تجزیہ

سپریم کورٹ کے زیر بحث فیصلہ کی روشنی میں یکساں سول کوڈ کے مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم نومسلموں کے نکاح ثانی پر عائد پابندی اور اس کے سنگین نتائج کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں:

ہندو کوڈ بل مرتب اور منظور ہونے سے پہلے ہندو سماج میں طلاق کا تصور موجود نہیں تھا، ہندو مذہب میں نکاح اٹوٹ مقدس رشتہ تھا جسے کسی حال میں ختم نہیں کیا جاسکتا، حتی کہ شوہر کی وفات کے بعد بھی بیوی متوفی شوہر کی بیوی تصور کی جاتی تھی، بیوہ عورتوں کے لئے دوسری شادی کی گنجائش نہیں تھی یا تو بیوہ عورت شوہر کے ساتھ ''وفاداری'' کا ثبوت دیتے ہوئے شوہر کی چتا میں کود جائے اور اپنے کو نذر آتش کرلے یا اپنی جوان عمری کے باوجود شوہر کے بغیر ذلت اور کسمپرسی کی زندگی گذارے۔

۵۶-۱۹۵۵ء میں ہندو کوڈ بل پارلیمنٹ میں منظور ہوا تو اس میں طلاق کی دفعات

شامل کی گئیں، ہندو کوڈ بل میں طلاق کی گنجائش انتہائی محدود دائرہ میں رکھی گئی ہے جس سے طلاق کی واقعی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، طلاق عدالت ہی کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے، عدالت میں عورت کے بارے میں بدکاری اور ناجائز تعلق کا الزام ثابت کرنے کے بعد ہی ناپسندیدہ بیوی سے رہائی حاصل کی جاسکتی ہے، ہندو کوڈ بل میں طلاق کا دائرہ اس قدر تنگ کردینے کی وجہ سے بہت سے ہندو شوہر جو ہر حال میں اپنی ناپسندیدہ بیویوں سے رہائی چاہتے ہیں تین راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اپناتے ہیں۔

۱۔قانون کے ڈر سے بیوی کو علیحدہ تو نہیں کرتے لیکن کسی دوسری عورت یا عورتوں سے ناجائز تعلق قائم کرلیتے ہیں، داشتہ رکھ لیتے ہیں اور شوہر بیوی کی ازدواجی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔

۲۔بعض شوہر بیوی پر عدالت میں بدکاری کے جھوٹے الزامات عائد کرکے اور جھوٹے گواہ کھڑے کرکے طلاق حاصل کرلیتے ہیں اور اگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی یا عدالت میں جھوٹا مقدمہ قائم کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تو کسی طرح بیوی کو قتل کرڈالتے ہیں، یا زہر کھلا دیتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ کسی اتفاقی حادثہ میں بیوی کی موت ہوگئی یا اس نے خود زہر کھا کر اور پھندا لگا کر خودکشی کرلی، ایسے مجرم کبھی قانون کی زد میں آ بھی جاتے ہیں اور اکثر اپنا جرم چھپانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

۳۔بعض ہندو شوہر اپنی ناپسندیدہ بیویوں سے رہائی کے لئے مذہب تبدیل کرنے کا راستہ اختیار کرتے ہیں، وہ اپنے عقائد واعمال کے اعتبار سے ہندو مذہب پر قائم رہتے ہیں لیکن بیوی سے رہائی کے لئے عدالت میں اسلام قبول کرنے کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ قانون کی نگاہ میں ہندو رہتے ہوئے نہ وہ اپنی ناپسندیدہ بیوی سے رہائی پاسکتے ہیں نہ دوسری شادی کرسکتے ہیں۔

اگر ہمارے جج صاحبان غیر جانبداری سے صورت حال کا جائزہ لیتے تو اس نتیجہ تک پہنچتے کہ ہندو کوڈ بل کے قانونِ طلاق میں تبدیلی لانے اور اسباب طلاق کا دائرہ وسیع

کرنے کی ضرورت ہے، شوہر جب بیوی سے اس قدر متنفر اور بیزار ہو کہ اس سے رہائی کے لئے وہ تبدیلیٔ مذہب جیسا آخری قدم اٹھانے پر آمادہ ہے ایسی حالت میں قانونی جبر سے دونوں کو نکاح کی رسی میں باندھے رکھنا انتہائی نامعقول بات ہے، رشتہ نکاح الفت ومحبت اور اعتماد کی فضا میں پروان چڑھتا ہے نا کہ نفرت، عداوت اور بے اعتمادی کی فضا میں، جو ہندو شوہر اپنی بیویوں سے آخری درجہ میں متنفر اور بیزار ہیں اگر ہماری عدالت عالیہ نے ان کے لئے تبدیلیٔ مذہب کے ذریعہ ناپسندیدہ بیویوں سے رہائی کا راستہ بند کردیا تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ عورتوں پر مظالم ڈھانے، انہیں قتل کرنے اور جلانے کے اعداد وشمار بڑھ جائیں گے، ایسا کرنا عورتوں کے ساتھ خیر خواہی اور انصاف نہیں بلکہ ان پر بدترین ظلم وستم ہے۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ اور نومسلموں کی مشکلات

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کی زد صرف ان ہندو شوہروں پر نہیں پڑتی جنہوں نے تبدیلیٔ مذہب کو صرف ایک قانونی حربہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور حقیقت میں انہوں نے ہندو مذہب ترک نہیں کیا ہے بلکہ وہ نومسلم بھی اسی فیصلہ کی زد میں بری طرح آگئے ہیں جنہوں نے پورے غور وفکر کے بعد صدق دل سے اسلام قبول کیا ہے، ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی مظلومیت اور کسمپرسی کے باوجود بہت سے برادران وطن مختلف مذاہب میں سچائی کی تلاش کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہوتے ہیں، اسلام کے عقائد عبادات، اخلاق واحکام کی خوبیاں انہیں اپنی طرف کھینچتی ہیں، برادران وطن میں جس قدر تعلیم عام ہورہی ہے، مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے، ان کی سعید روحوں میں تلاش حق کا جذبہ بیدار ہورہا ہے، قومی پریس کی اسلام دشمن مہم کے باوجود بہت سے بندگان خدا اسلام قبول کررہے ہیں۔

سپریم کورٹ کے زیر بحث فیصلہ نے نومسلموں کے لئے بڑی مشکلات کھڑی کردی ہیں، اگر ایک ہندو غور وفکر اور مطالعہ وتحقیق کے بعد اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ اسلام ہی سچا

مذہب ہے، اور اپنے اس مطالعہ واحساس کے نتیجہ میں اس نے اسلام قبول کرلیا تو اس نے کوئی خلاف قانون اور غیر آئینی کام نہیں کیا بلکہ اپنے آئینی حق کا استعمال کیا، دستور ہند کی دفعہ ۲۵ ہندوستان کے ہر شہری کو اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق دیتی ہے۔

ہندو شوہر کے اسلام قبول کر لینے کے بعد اگر عدت کے اندر اس کی ہندو بیوی بھی اسلام قبول کر لیتی ہے تو دونوں کا نکاح شرعاً اور قانوناً دونوں طرح باقی رہتا ہے اور اگر اپنے قدیم مذہب پر عورت قائم رہتی ہے اور تبدیلیٔ مذہب کے لئے آمادہ نہیں ہوتی تو اسلام کی نظر میں عدت گذرتے ہی نومسلم شوہر سے اس کا نکاح ختم ہوجاتا ہے، نومسلم مرد کے لئے وہ ہندو بیوی حرام ہوگئی، اگر شوہر اس سے جنسی تعلق قائم کرے گا تو یہ حرام کاری ہوگی لیکن سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے مطابق ہندو کوڈ بل کی نظر میں دونوں کا نکاح حسب سابق باقی ہے، نومسلم شوہر پر اس معنی میں ہندو کوڈ بل نافذ ہے کہ اگر اس نے دوسرا نکاح کیا تو یہ نکاح ناجائز اور باطل نیز قابل سزا تصور کیا جائے گا، تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۹۴ کے تحت اسے سزا دی جائے گی، لیکن شوہر چونکہ خود اسلام قبول کر چکا ہے لہذا ہندو کوڈ بل کے تحت طلاق حاصل کرنے وہ عدالت نہیں جاسکتا قانوناً اس کا نکاح ختم ہونے کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ اس کی ہندو بیوی شوہر کے مذہب تبدیل کر لینے کی وجہ سے طلاق کا مطالبہ لے کر عدالت جائے اور عدالت اس کا یہ مطالبہ تسلیم کر کے دونوں کا نکاح ختم کردے پھر نومسلم مرد کہیں اور نکاح کرسکتا ہے۔

نومسلم کی ہندو بیوی اگر طلاق کا مطالبہ لے کر عدالت نہیں جاتی تو نومسلم شوہر بڑی قانونی پیچیدگی میں مبتلا ہوجاتا ہے، ہندو کوڈ بل کی وجہ سے وہ دوسری شادی نہیں کرسکتا اگر دوسری شادی کرتا ہے تو تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۹۴ کا اس پر نفاذ ہوتا ہے اور اگر وہ قانون کے ڈر سے دوسری شادی نہیں کرتا اور پہلی بیوی ہی سے ازدواجی تعلقات قائم رکھتا ہے تو اپنے عقیدہ ومذہب کے اعتبار سے زناکاری اور بدکاری کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ اسلام کی نظر میں

پہلی بیوی سے اس کا نکاح باقی نہیں رہا۔

اس پیچیدہ صورت حال میں اگر نومسلم شخص اپنے مذہب اور قانون ملک دونوں کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ عملاً تجرد کی زندگی گذارے دوسرے شادی نہ کرے اور پہلی بیوی سے ازدواجی تعلق نہ رکھنے کے باوجود اس کا مالی بوجھ برداشت کرے، میں نہیں سمجھتا کہ اپنے ایک آئینی حق کو استعمال کرنے کی اس سے سخت کوئی سزا ہوسکتی ہے۔

بنیادی حقوق کی پامالی

سپریم کورٹ کے زیر بحث فیصلہ سے دستور ہند کی دفعہ ۲۵ میں دیا ہوا آزادی مذہب کا بنیادی حق بری طرح مجروح ہوا ہے اور اسلام قبول کرنے پر بالواسطہ پابندی عائد کردی گئی ہے، ورنہ اس کا کوئی عقلی جواز نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی نومسلم شخص پر ہندو کوڈ بل کا نفاذ کیا جائے اور اسے اپنے مذہب کے مطابق نکاح کا اختیار نہ دیا جائے۔

یکساں سول کوڈ کے مسئلہ کا قانونی اور تاریخی جائزہ

یونیفارم سول کوڈ (یکساں شہری قانون) کا حساس اور نازک مسئلہ دستور ہند سے جڑا ہوا ہے اس لئے سب سے پہلے دستور ہند کی روشنی میں اس مسئلہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

آزاد ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں خواندگی اور بحث وتمحیص کے بعد موجودہ دستور ہند ۲۹ر نومبر ۱۹۴۹ء کو منظور ہوا، کچھ دفعات فوری طور پر نافذ کردی گئیں اور باقی آئین کے نفاذ کے لئے ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کی تاریخ طے پائی۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تقسیم ملک کے نام پر پیدا ہونے والے لرزہ خیز حالات نے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں سوالیہ نشان لگادیا، برادران وطن کا ذہن یہ تھا کہ جب مسلمانوں نے پاکستان بنوالیا تو اب انہیں ہندوستان میں رہنے کا کیا حق ہے، ہندوستان کے بچے کھچے مسلم قائدین اس کوشش میں شب وروز لگے ہوئے تھے کہ

ہندوستان میں مسلمانوں کے پاؤں جم جائیں ان کے دلوں سے خوف وہراس دور ہو۔

ان ہنگامہ خیز غیر معتدل حالات میں دستور ہند مرتب اور منظور ہوا۔

دفعہ ۴۴ دستور ہند میں کس طرح شامل ہوئی

یکساں سول کوڈ کا تصور ہماری جدوجہد آزادی کے دور میں کہیں بھی موجود نہیں تھا، بلکہ اس کے برعکس جمعیۃ علماء ہند نے کانگریس کا ساتھ اسی شرط پر دیا تھا کہ مسلمانوں کو آزادی کے بعد اپنے دینی معاملات شریعت کے مطابق طے کرنے کا اختیار ہوگا اور ان کے پرسنل لا (عائلی قوانین) میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔

یونیفارم سول کوڈ کا تصور اچانک ابھر کر اس وقت سامنے آیا جب کہ آئین ساز اسمبلی ملک کا آئین تیار کرنے میں مصروف تھی، اس مرحلہ میں بنیادی حقوق سے متعلق ذیلی کمیٹی کی ۲۸/مارچ ۱۹۴۷ء کی میٹنگ میں مسٹر ایم، آر مسانی کی طرف سے ایک تجویز رکھی گئی کہ بنیادی حقوق میں ایک شق یکساں سول کوڈ کی بھی شامل کی جائے جس کا اطلاق بلاتفریق مذہب تمام شہریوں پر ہو پہلے مرحلہ میں کمیٹی کی اکثریت نے یہ تجویز مسترد کردی لیکن ۳۰/مارچ ۱۹۴۷ء کی میٹنگ میں تجویز پھر پیش ہوئی، اس کے بعد ذیلی کمیٹی نے معمولی اکثریت سے یہ فیصلہ کیا کہ یکساں سول کوڈ کی ایک کلاز سماجی پالیسی کے رہنما اصولوں میں شامل کرلی جائے۔

پارلیمنٹ میں جب دستور ہند کی خواندگی ہوئی اور دفعہ ۴۴ جو یکساں سول کوڈ پر مشتمل ہے زیر بحث آئی تو بہت سے مسلم ممبران نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، اور دفعہ ۴۴ کے مضر اثرات کو ختم کرنے کے لئے مختلف ترمیمات پیش کیں لیکن یہ ترمیمات منظور نہ ہوسکیں، مثلاً محمد اسماعیل صاحب مرحوم کی پیش کردہ بعض ترمیمات یہ ہیں:

(۱) دفعہ ۳۵ میں درج ذیل شق کا اضافہ کردیا جائے ''کسی گروپ یا فرقہ کو اپنے پرسنل لا سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا، اگر اس کے پاس ایسا قانون

موجود ہے۔'' (آئین ساز اسمبلی ڈیبٹ جلد ۷ ص ۵۴۰)

(۲) دفعہ ۱۳ کی کلاز (۱) کی سب کلاز (جی) میں یہ نیا سب کلاز جوڑ دیا جائے ''کوئی شخص جس گروپ یا فرقے سے تعلق رکھتا ہو یا اس سے تعلق کا اظہار کرتا ہو اس کے پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی۔'' (آئین ساز اسمبلی ڈیبٹ جلد ۷ ص ۷۲۱)

طویل بحثوں کے باوجود مسلم ممبران پارلیمنٹ کی پیش کردہ ترمیمات جن کا مقصد پرسنل لا کو دفعہ ۴۴ کی زد سے بچانا تھا منظور نہ ہوسکیں، ترمیم کا مطالبہ کرنے والوں کو ڈاکٹر امبیڈکر نے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی:

''یہ محض حکومت کو اختیار دیا جارہا ہے کہ جس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہبی شخصی قوانین کو ختم کردینا ضروری ہوگا، خواہ ملک کے مسلمان، عیسائی یا کوئی اور فرقہ اس سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کرے، کسی کو یہ خطرہ نہ ہونا چاہئے کہ صرف اختیار کے مل جانے کی وجہ سے حکومت اس پر عمل کے لئے اصرار کرے گی۔

حکومت کے اختیار عملاً محدود ہوا کرتے ہیں، خواہ لفظی طور پر آپ انہیں کتنا ہی غیر محدود کرلیں، کیونکہ حکومت اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرسکتی جس کے نتیجہ میں مسلمان بغاوت پر آمادہ ہوجائیں، اگر حکومت کسی وقت ایسا کرنے کی سوچے تو اسے فاتر العقل کہنا چاہئے۔''

خلاصہ یہ کہ بہت سے ممبران پارلیمنٹ کی زوردار مخالفت کے باوجود دفعہ ۴۴ بلا کسی ترمیم واضافہ کے منظور کرلی گئی ہے، اس طرح ہمارا دستور ایک کھلے ہوئے تضاد کا شکار ہوگیا۔

ایک طرف اس دستور کے حصہ سوم میں بنیادی حقوق کے تحت دفعہ ۲۵ میں لکھا گیا ''تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے اس کی پیروی اور اس کے تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے بہ شرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیحات متاثر نہ ہوں۔'' (ص ۴۶)

دوسری طرف حکومت کو اختیار دیا گیا بلکہ ہدایت دی گئی کہ یکساں سول کوڈ نافذ

کر کے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی سلب کرے۔

دستور کی دفعہ ۲۵ اور دفعہ ۴۴ میں تضاد

دستور کی ان دو دفعات ۲۵، ۴۴ کا تضاد سمجھنے کے لئے ہمیں کچھ تفصیل سے دستور ہند پر نظر ڈالنی ہوگی۔

دستور ہند بائیس حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں مملکت اور اس کے علاقوں کی تعیین وتفصیل بیان کی گئی ہے، حصہ دوم میں ہندوستانی شہریت کے قوانین بیان کئے گئے ہیں۔

دستور کے حصہ سوم میں ہندوستانی شہریوں کے آئینی حقوق تفصیل سے درج کئے گئے ہیں، دستور ہند کے اس حصہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بنیادی حقوق کے تحت دفعہ ۱۳ میں تحریر ہے۔

۱۳-(۱) وہ سب قوانین جو اس آئین کی تاریخ نفاذ سے عین قبل بھارت کے علاقہ میں نافذ ہوں، جہاں تک وہ اس حصہ کے متناقض ہوں تناقض کی حد تک باطل ہوں گے۔

(۲) مملکت ایسے قانون نہ بنائے گی جو اس حصہ سے عطا کئے ہوئے حقوق کو چھین لے یا ان میں کمی کرے اور کوئی قانون جو اس فقرہ کی خلاف ورزی میں بنایا جائے خلاف ورزی کی حد تک باطل ہوگا۔

بنیادی حقوق کے اس حصہ میں بہت سے حقوق ہیں مثلاً مساوات کا حق، حق آزادی، آزادئ مذہب کا حق، ثقافتی اور تعلیمی حقوق، آئینی چارہ جوئی کا حق وغیرہ۔

دفعہ ۲۵ تا ۲۸ کا تعلق مثبت یا منفی طریقہ پر آزادی مذہب سے ہے دفعہ ۲۵ میں کہا گیا ہے۔

دفعہ ۲۵ (۱) تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے، بہ شرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ

اور اس حصہ کی دیگر توضیحات متأثر نہ ہوں۔

(۲) اس دفعہ کا کوئی امر کسی ایسے موجودہ قانون کے نفاذ کو متأثر نہ کرے گا اور نہ وہ ایسے قانون کے بنانے میں مملکت کا مانع ہوگا۔

(الف) کسی معاشی، مالیاتی، سیاسی یا دیگر غیر مذہبی سرگرمی کو جس کا تعلق مذہبی عمل سے ہوسکتا ہو منضبط کرے یا اس پر پابندی لگائے۔

زیر بحث دفعہ ۲۵ میں آزادی مذہب کے حق کو امن عامہ، اخلاق عامہ، اور صحت عامہ کی زنجیروں سے جکڑ کر عدلیہ اور انتظامیہ کو لامحدود اختیارات دے دیئے گئے ہیں کہ جس مذہبی عمل اور سرگرمی کو چاہیں اخلاق عامہ، امن عامہ، صحت عامہ کے لئے مضرت رساں ہونے کے بہانے روک دیں اور اس پر قانونی پابندی عائد کردیں۔

دستور کا چوتھا حصہ مملکت کی حکمت عملی کے رہنما اصول پر مشتمل ہے اس حصہ کی دفعات کے بارے میں دفعہ ۳۷ میں تحریر ہے۔

اس حصہ کی دفعات کو کوئی عدالت نافذ نہ کرسکے گی لیکن اس کے باوجود وہ اصول جو اس میں قلمبند کئے گئے ہیں مملکت کی حکمرانی کے لئے بنیادی ہیں اور مملکت کا فرض ہوگا کہ قوانین بنانے میں ان اصولوں کا اطلاق کرے۔

دستور کے حصۂ چہارم (دستور کے رہنما اصول) کی دفعہ ۴۴ میں کہا گیا ہے۔

ریاست کوشش کرے گی کہ پورے ملک میں شہریوں کے لئے یکساں شہری قانون ہو۔

اوپر تفصیل سے یہ بات گذر چکی ہے کہ مسلمان ممبران پارلیمنٹ کی شدید ترمخالفتوں کے باوجود یکساں سول کوڈ کی دفعہ (۴۴) مملکت کے رہنما اصولوں میں شامل کرلی گئی، آئین ساز اسمبلی میں ایک طاقتور لابی موجود تھی جو مذہب کی عملداری انتہائی محدود کرنے بلکہ اسے ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی، زندگی کے دوسرے میدانوں سے مذہب کی عملداری پہلے ہی ختم ہوچکی تھی۔

شریعت ایکٹ کا پس منظر

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ عدلیہ کا پورا ڈھانچہ تبدیل کر کے رکھ دیا، ۱۸۶۲ء میں اسلامی تعزیرات کو منسوخ کر کے تعزیرات ہند کا نفاذ عمل میں آیا، ۱۸۶۴ء میں زبردست قدم اٹھاتے ہوئے برطانوی حکومت ہند نے مسلمان قاضیوں کی تقرری موقوف کر دی، ۱۸۶۴ء سے قبل ہر علاقہ میں حکومت کی طرف سے مسلمان قاضی مقرر کیے جاتے تھے جو مسلمانوں کے خانگی اور عائلی تنازعات میں شریعتِ اسلامی کے مطابق فیصلے دیا کرتے تھے، ۱۸۷۲ء میں اسلامی قانون شہادت کی حکمرانی عدالتوں سے ختم کر دی گئی، اس کی جگہ انسانی ذہنوں کا تراشا ہوا قانونِ شہادت نافذ کیا گیا، غرضیکہ ایک ایک کر کے اسلامی قصر عدالت کی ساری اینٹیں جدا کر کے پورے عدالتی نظام کو غیر اسلامی خطوط پر استوار کیا گیا اور یہ سب کچھ سنگینوں کی نوک پر اور جبر تشدد کے سہارے کیا گیا، مسلمانوں کی آہ وفریاد نالہ واحتجاج نے کوئی اثر نہیں کیا۔

انگریزوں نے یہ سب کارروائیاں جوشِ غضب اور جذبۂ انتقام میں کیں، انہیں اس بات کا بے پناہ غصہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے برطانوی سامراج کا استقبال کرنے کے بجائے قدم قدم پر اس کی شدید مزاحمت کی اور ہندوستان سے انگریزوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے ہر خطرہ مول لیا۔

امتداد زمانہ کے ساتھ انگریزوں کے جذبۂ انتقام میں کچھ کمی کوئی، انگریز حکام نے محسوس کیا کہ برطانوی حکومت ہند سے مسلمانوں کی نفرت وعداوت کا سب سے اہم سبب ان کے دینی معاملات میں صریح مداخلت ہے، بالآخر مرکزی مجلس قانون ساز کے مسلم اراکین کی تحریک اور کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں شریعت ایکٹ منظور ہوا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''وراثت، نکاح، فسخ نکاح بشمول طلاق، ایلاء، ظہار، لعان، خلع، مبارات، نفقہ، مہر، ثبوتِ نسب، امانت، جائداد، حقِ شفعہ، ہبہ، اوقاف کے معاملات میں مسلمان لازمی طور پر پرسنل لا کے تابع ہوں

گے وصیت اور تبنیت کے معاملات میں مسلم پرسنل لا کا اطلاق اختیاری ہوگا۔''

شریعت ایکٹ منظور ہونے سے ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین کو بڑی حد تک تحفظ حاصل ہوا۔

تحریک آزادی اور مسلم پرسنل لا

بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں پورا ہندوستان تحریکِ آزادی کے نعروں سے گونج رہا تھا، ہندوستان کی تمام قومیں ہندوستان کی آزادی کے لئے جان ومال کی بازلگا رہی تھی، ہندوستانی مسلمان جدوجہد آزادی کا ہراول دستہ تھے، تحریک آزادی میں مسلمان علماء قائدین اور عوام اپنے تناسب آبادی سے کہیں زیادہ حصہ لے رہے تھے، کانگریس کے صف اول کے قائدین میں بہت سے علماء اور مسلم رہنما شامل تھے، جمعیۃ علماء ہند کانگریس کے شانہ بشانہ جدوجہد آزادی میں شریک تھی، اس لئے آزادی سے پہلے کانگریس نے اپنی متعدد سالانہ کانفرنسوں کی قراردادوں میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے مسئلہ کو شامل کیا، مسلمانوں سے صریح وعدہ کیا اور یقین دہانی کرائی کہ آزادی کے بعد مسلم پرسنل لا کا پورا تحفظ کیا جائے گا اور اس میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

دستورِ ہند اور مسلمان

آزادی کی صبح بڑی قربانیوں اور تمناؤں کے بعد طلوع ہوئی لیکن یہ صبح جس کا مدتوں سے انتظار تھا مسلمانوں کے لئے بڑی بھیانک ثابت ہوئی، تقسیم ملک کے نتیجہ میں نفرت وعداوت کا بادل پورے ملک پر چھا گیا، بے گناہوں کے خون سے ہندوستان کی سرزمین لالہ زار ہوگئی، مسلمانوں نے آزادی کا جو سہانا خواب دیکھا تھا وہ بکھر کر رہ گیا، انہیں حالات میں جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود وبقا پر سوالیہ نشان لگ گیا تھا دستورِ ہند مرتب اور منظور ہوا، ہندوستان میں بچے کھچے قائدین اس جدوجہد اور فکر میں لگے ہوئے تھے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کے پیر اکھڑ نہ جائیں، دستور ہند کے واضعین نے مذہب، زبان،

تہذیب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں شامل ضرور کیا لیکن مذہب کی آزادی کا دائرہ کہاں تک ہے اس کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی اور اس کے دائرہ کا تعین عملاً عدلیہ اور انتظامیہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا حیرت ہے کہ جس دستور ہند میں پسماندہ اقوام اور بعض اقلیتوں کے تعلق سے معمولی جزئیات کی تفصیل موجود ہے اسی دستور میں اقلیتوں کے پرسنل لا کے تحفظ سے متعلق ایک جملہ بھی موجود نہیں ہے، مسلم اراکین پارلیمنٹ نے ایسی بعض دفعات دستور میں شامل کرانے کی کوشش کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی، ستم بالائے ستم یہ ہے کہ دستور میں مسلم اراکین کی مخالفت کے باوجود یکساں سول کوڈ کی دفعہ (دفعہ ۴۴) شامل کردی گئی، واضعین دستور نے دفعہ ۴۴ شامل کرکے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے سروں پر ننگی تلوار لٹکادی ہے تاکہ جب بھی حالات سازگار ہوں اقلیتوں کے پرسنل لا کا سر قلم کیا جاسکے۔

یکساں سول کوڈ کی تشکیل وتنفیذ کی کوشش

یکساں سول کوڈ کی تدوین وتنفیذ کی دفعہ (دفعہ ۴۴) کو دستور میں شامل کرتے وقت قانون ساز اسمبلی میں جو بحثیں ہوئیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ پرسنل لا کو مذہب سے دائمی طور پر جدا کرنے کے مقصد سے یہ دفعہ دستور میں شامل کی گئی، دستوری طور پر پارلیمنٹ کو یکساں سول کوڈ کی تشکیل وتنفیذ کا اختیار دیا گیا بلکہ حکومت ہند کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں پوری کوشش کرے۔

حکومتِ ہند اپنی اس ''ذمہ داری'' سے غافل بھی نہیں ہے، مسلم پرسنل لا کو ختم کرکے یونیفارم سول کوڈ نافذ کرنے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہے، اپنے کو مسلمان کہنے والے ان تجدد پرستوں کے مہمل خیالات کو ہوا دی جارہی ہے جو اسلام کی عائلی قوانین میں اصلاح وتبدیلی کا مطالبہ کررہے ہیں، مغرب پرست مسلم خواتین کی تنظیمیں قائم کراکے مسلم پرسنل لا کو عورتوں کے حق میں ظلمِ عظیم ثابت کرنے کی کوشش جاری ہیں، اس بات کی برابر کوشش جاری ہے کہ مسلمانانِ ہند کا ایک معتد بہ طبقہ مسلم پرسنل لا کو ختم کرکے

یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑا ہوتا کہ یہ کہا جاسکے کہ ہم نے خود مسلمانوں کے مطالبہ پر یہ اقدام کیا ہے، ہمارا قومی پریس اسلام کے عائلی قوانین کو ہدف بنانے والے واہی تباہی مضامین کو شاہ سرخیوں میں جگہ دیتا ہے اور اسلامی قوانین کی حمایت میں لکھے گئے فاضلانہ مضامین اور مراسلوں کی کسی گوشہ میں بھی شائع کرنے کا روادار نہیں۔

دستور ہند میں اس بات کی صراحت کردی گئی ہے کہ ''رہنما اصول'' کی دفعات عدالتوں کے ذریعہ قابلِ نفاذ نہیں، اس کے باوجود شاہ بانو کیس کے فیصلہ (۱۹۸۵ء) سے لے کر سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ (مئی ۱۹۹۵ء) تک عدالت عالیہ کے معزز جج صاحبان اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے دفعہ ۴۴ کے نفاذ پر مسلسل اصرار کررہے ہیں اور اپنے تہلکہ خیز فیصلوں کے ذریعہ حکومت کو یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے لئے مہمیز کرتے رہتے ہیں۔

مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کی تشریح

مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کی تشریح وتعبیر میں سپریم کورٹ کے مختلف فیصلوں کا جائزہ بہت سے چونکا دینے والے حقائق کا انکشاف کرتا ہے، ہندوؤں کی طرف سے دائر مقدمات میں وہ سارے کام مذہبی عمل قرار دیئے جاتے ہیں جنہیں برادر اوطن مذہبی عمل شمار کرنا چاہیں حتی کی مختلف یاترائیں نکالنا اور متنازعہ مقامات پر کسی بھی مذہبی عنوان سے لاکھوں کا مجمع اکٹھا کرنا مذہبی عمل قرار پاتا ہے خواہ ان کی اجازت دینے سے پورے ملک کا امن وامان درہم برہم ہوجائے اور شدید خونریزی کا خطرہ ہو، اس کے برخلاف اگر عدالتِ عالیہ میں مسلمانوں کا معاملہ زیر بحث ہو تو مذہبی آزادی اور مذہبی عمل کا دائرہ انتہائی محدود ہوجاتا ہے، نکاح وطلاق وغیرہ کے معاملات کو مذہبی عمل میں داخل کرنا قابل غور ہوجاتا ہے، غرضیکہ مذہبی آزادی اور مذہب پر عمل کی تشریح میں عدالت عالیہ کے بہت سے فاضل جج صاحبان کے پاس دو پیمانے ہیں اکثریت کے لئے ایک پیمانہ اور اقلیت کے لئے دوسرا پیمانہ۔

یکساں سول کوڈ اور مسلمان

ملک کی آزادی کے بعد (انتہائی مختصر مدت کو چھوڑ کر) مرکز میں کانگریس کی حکومت رہی، آزادی کے چند سال بعد ہندو قوم کے لئے مختلف عائلی قوانین پارلیمنٹ میں منظور کئے گئے جو ہندو کوڈ بل کے نام سے مشہور ہوئے، ہندو کوڈ بل کو بہت سے مذہبی ہندوؤں نے پسند نہیں کیا اور اسے مذہب میں مداخلت قرار دیا لیکن سیاسی رہنماؤں نے ہندو اراکین پارلیمنٹ کو یہ ذہنی رشوت دی کہ ہندو کوڈ بل کی منظوری یکساں سول کوڈ کے لئے مضبوط قدم ہے جب ہندو قوم پارلیمنٹ کے ذریعہ منظور شدہ عائلی قوانین قبول کرلے گی تو مسلم پرسنل لا کو ختم کرنا اور یکساں شہری قانون کو نافذ کرنا انتہائی آسان ہوجائے گا، حکومت کے ذمہ داروں کی طرف سے وقتاً فوقتاً یہ باتیں کہی جاتی رہیں اور مسلمانوں کو کبھی دھمکا کر اور کبھی نرم لہجہ میں یکساں سول کوڈ کو قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششیں جاری رہیں۔

جب ہندو پرسنل لا کو نئی شکل دی جارہی تھی اس وقت مرکزی وزیر قانون مسٹر پاٹکر نے کہا تھا ''ہم نے اپنے آئین کے نفاذ (۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء) کے بعد اسپیشل میرج ایکٹ، ہندو میرج ایکٹ پاس کیے ہیں اب ہندو قانون وراثت کا مسودہ پارلیمنٹ میں زیر غور ہے یہ سب ضابطۂ دیوانی یکساں بنانے کے اقدامات ہیں۔'' (۲۵ر اگست ۱۹۵۵ء کی ریڈیائی تقریر)

۱۹۶۳ء میں حکومت نے ایک کمیشن مقرر کرنا چاہا تھا جس کا مقصد مسلم پرسنل لا میں تبدیلی پر غور وفکر اور اس کے لئے عملی راہوں کی تلاش کرنا تھا، مسلمانوں کی ہمہ گیر مخالفت کے نتیجہ میں یہ کمیشن مقرر نہیں کیا گیا اور وزیر قانون نے پارلیمنٹ میں یہ کہہ کر بحث ختم کردی کہ حکومت اس وقت مسلم پرسنل لا میں کوئی ترمیم کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔

۱۹۷۳ء میں مرکزی وزیر قانون مسٹر گوکھلے نے متبنیٰ بل کو پیش کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں کہا، یہ مسودۂ قانون یونیفارم سول کوڈ کی طرف ایک مضبوط قدم ہے۔

مارچ ۱۹۷۳ء میں گوجندر گڈکر (چیرمین لا کمیشن) نے کہا تھا:

''مسلمانوں کو یونیفارم سول کوڈ قبول کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرلینا چاہئے اگر انہوں نے خوش دلی کے ساتھ یہ تجویز منظور نہیں کی تو قوت کے ذریعہ نافذ کیا جائے گا۔''

حکومت کی طرف سے یکساں سول کوڈ کے لئے فضا ہموار کرنے، خصوصاً مسلمانوں کو مسلم پرسنل لا سے دستبرداری پر آمادہ کرنے کے لئے کوششیں برابر جاری رہیں، مسلمانوں کی نبض ٹٹولنے اور ان کے سیاسی موڈ کا اندازہ لگانے کے لئے بہت تھوڑے تھوڑے عرصہ میں یکساں سول کوڈ کا شوشہ چھوڑا جاتا رہا اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، سپریم کورٹ کا زیر بحث فیصلہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ہندو عائلی قوانین میں اصلاح کا مقصد

یہ کہنا بہت بڑی فریب دہی ہے کہ ہندو قوم ملک کی یکجہتی اور قانون میں یکسانیت لانے کے لئے اپنے عائلی قوانین (پرسنل لا) میں تبدیلی واصلاح پر آمادہ ہوئی اور اس نے ملک کے مفاد کے لئے اپنے مذہبی جذبات کی قربانی دی، واقعہ یہ ہے کہ ہندو مذہب میں انسانی فطرت سے میل کھاتے ہوئے قابل عمل عائلی قوانین موجود ہی نہیں تھے، ہندوؤں کی مختلف قوموں اور ان کے مختلف خطوں میں شادی بیاہ وغیرہ کے تعلق سے الگ الگ رسم ورواج تھے اور یہ رسم ورواج انتہائی متضاد اور مختلف تھے، بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کا حق نہیں تھا، ان کے لئے کمال کی بات یہ تھی کہ اپنے متوفی شوہر کی چتا میں جل کر راکھ ہوجائیں اور اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کریں، میاں بیوی کے تعلقات خواہ کتنے ہی کشیدہ ہوجائیں ہندو رسم ورواج میں طلاق کی گنجائش نہیں تھی، میراث وغیرہ کے بارے میں بھی ہندو مذہب کے قوانین انتہائی غیر عادلانہ تھے اس صورت حال نے ہندو قوم کے قائدین کو مجبور کیا کہ وہ غیر فطری اور ظالمانہ رسم ورواج کو ختم کرنے کے لئے پارلیمنٹ کے ذریعہ ہندو کوڈ بل پاس

کرائیں، ہندو کوڈ بل دیوانی قوانین میں یکسانیت لانے کے لئے ہرگز منظور نہیں کیا گیا ورنہ اسپیشل میرج ایکٹ کے بعد ہندو میرج ایکٹ (۱۹۵۵ء) منظور کرانے کی کیا ضرورت تھی، علاوہ ازیں خود ہندو کوڈ بل کی مختلف دفعات میں بہت سے معاملات کو رسم ورواج پر چھوڑ دیا گیا ہے، ایسی صورت میں قانون میں یکسانیت کہاں پیدا ہوئی۔(ملاحظہ ہو ہندو میرجز ایکٹ کی دفعہ (۱)۱۷اور (۲)۱۷)۔

چور دروازوں سے مسلم پرسنل لا میں مداخلت

ابھی تک مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کا راست اقدام نہیں کیا جاسکا ہے لیکن مختلف چور دروازوں سے اس پر نقب لگائی جاتی رہی ہے، پارلیمنٹ اور مختلف صوبائی اسمبلیوں نے ایسے مختلف قوانین منظور کئے ہیں جن کی زد اسلام کے عائلی قوانین پر پڑتی ہے، تعزیرات ہند میں بھی ایسی متعدد دفعات شامل کی گئی ہیں جن سے مسلم پرسنل لا کا نفاذ بری طرح مجروح اور متاثر ہوا ہے اسی طرح سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے بہت سے فیصلے بھی مسلم پرسنل لا میں دخل انداز ہوئے ہیں، افسوس ہے کہ اب تک ہمارے پاس ان قوانین اور فیصلوں کی مکمل فہرست بھی نہیں ہے جن سے پرسنل لا کے مختلف حصے مجروح ہوئے ہیں، بہت سے قوانین انتہائی خاموشی سے پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں پاس ہوجاتے ہیں اور ہمارے مسلم اراکین پارلیمنٹ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس قانون کی زد کہاں پڑسکتی ہے، جب عدالتوں کے ذریعہ ان قوانین کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے اور شاہ بانو کیس جیسی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو ہمارے کان کھڑے ہوتے ہیں اور ہم آنکھ ملتے ہوئے مقابلہ کی تیاری شروع کرتے ہیں۔

یکساں سول کوڈ اور بھاجپائی حکومتیں

جسٹس کلدیپ سنگھ کے حالیہ فیصلہ کے بعد یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ پھر بحث ومباحثہ کا موضوع بن گیا ہے، قومی پریس میں اسلام کے عائلی قوانین کے خلاف انتہائی زہر افشانی کی جارہی ہے، طبقۂ نسواں کے تعلق سے مسلم سماج کی تصویر انتہائی مسخ کرکے پیش

کی جارہی ہے اور مسلم خواتین کے حال زار پر آنسو بہائے جارہے ہیں، بھارتیہ جنتا پارٹی نے خاص طور پر اس مسئلہ کو ہوا دی ہے اور اسے اپنا انتخابی ایشو بنانے کا فیصلہ کیا ہے، یونیفارم سول کوڈ کے مسئلہ پر بھاجپائی قائدین اور وزراء اعلیٰ کی کئی میٹنگیں ہوچکی ہیں انہوں نے مرکز پر زور دیا ہے کہ سپریم کورٹ کی ہدایت کے مطابق جلد از جلد یکساں سول کوڈ مدون اور نافذ کرے، بھاجپا نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ اگر مرکز نے اس مسئلہ کے بارے میں سرد مہری کا ثبوت دیا تو جن صوبوں میں بھاجپا اس کی حلیف پارٹیوں کی حکومت ہے وہاں یکساں سول کوڈ جلد از جلد نافذ کیا جائے گا۔(گجرات، دہلی، راجستھان، مہاراشٹر)

کیا صوبائی حکومتیں مسلم پرسنل میں مداخلت کرسکتی ہیں؟

بھاجپا کے اس عزم اور فیصلہ پر بہت سے لوگوں کی حیرت ہے کہ کیونکہ دفعہ ۴۴ کی مخاطب مرکزی حکومت ہے اس کی رو سے مرکزی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے تمام شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ مدون کرنے اور نافذ کرنے کی کوشش کرے، دفعہ ۴۴ کے اعتبار سے یونیفارم سول کوڈ کی تدوین وتنفیذ کی ذمہ داری مرکزی حکومت پر عائد ہوتی ہے، صوبے اس کے مخاطب اور مجاز نہیں لیکن بھاجپا کے اس فیصلے پر استعجاب دستورِ ہند کے ناقص مطالعہ پر مبنی ہے، صورت حال یہ ہے کہ قانون سازی کے تعلق سے دستورِ ہند میں تین فہرستیں درج ہیں فہرست (۱) میں وہ امور گنائے گئے ہیں جن کے بارے میں قانون سازی کا اختیار صرف مرکزی حکومت کو ہے، فہرست (۲) میں وہ امور درج ہیں جن کے بارے میں قانون سازی کا اختیار صرف ریاستی حکومت کو ہے اور فہرست (۳) میں ان امور کا اندراج ہے جن کے بارے میں قانون سازی کا اختیار مرکزی حکومت کو بھی ہے اور صوبائی حکومتوں کو بھی، ان امور میں پرسنل لا کے مسائل بھی ہیں چنانچہ فہرست (۳) میں شامل پانچواں امر یہ ہے کہ، دفعہ ۵، بیاہ وطلاق، اطفال اور نابالغان، وصیتیں، وفات بلا وصیت اور وراثت خاندان مشترکہ اور بٹوارہ سب امور جن کے متعلق عدالتی کارروائی کے فریق اس آئین کی

تاریخ نفاذ کے عین قبل اپنے شخصی قانون کے تابع تھے۔ (بھارت کا آئین ص ۳۵۷)

غرضیکہ پرسنل لا کے مسائل میں قانون سازی کا اختیار مرکز اور صوبوں دونوں کو ہے اس لئے اگر مختلف صوبوں کی بھاجپائی حکومتیں مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کے لئے اپنے صوبوں میں یکساں عائلی قوانین نافذ کریں تو ان کے لئے کوئی بڑی دستوری رکاوٹ موجود نہیں ہے، بہت سے بہت یہ ہوگا کہ شریعت اپلیکیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء (جو ایک مرکزی قانون ہے) سے صوبائی قوانین کا ٹکراؤ ہوگا، ایسی صورت میں مرکزی حکومت اگر سنجیدگی سے اس پر کوئی ایکشن لینے کو تیار ہوگی تب تو ان صوبائی قوانین کی راہ میں کچھ قانونی رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے لیکن اگر مرکزی حکومت نے خاموشی اختیار کی تو تنہا مسلمانوں کی چارہ جوئی سے ان صوبائی قوانین کو ختم کرانا انتہائی مشکل ہوگا، بنیادی حقوق کی دفعہ ۲۵ (جس میں اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی آزادی دی گئی ہے) کس حد تک ان بھاجپائی صوبائی حکومتوں کے عزائم میں حائل ہوسکتی ہے یہ سمجھنا ان لوگوں کے لئے مشکل نہیں ہے جو سپریم کورٹ کے مختلف فیصلوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور مسلم پرسنل لا کے بارے میں عدالت ہائے عالیہ کے اکثر جج صاحبان کا موڈ سمجھتے ہیں۔

اوپر کے صفحات میں یہ جائزہ پیش کیا گیا کہ موجودہ ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) اور اسلامی تشخص کو کیا خطرات درپیش ہیں، دستور ہند کی آڑ میں اسلام کے معاشرتی اور عائلی قوانین کو سبوتاژ کرنے کے لئے کس قدر منظم اور مسلسل کوششیں ہورہی ہیں، اور دستور ہند مسلم پرسنل لا کو کس حد تک تحفظ فراہم کرتا ہے۔

جدوجہد کے چار میدان

اگلے صفحات میں ہمیں روشنی ڈالنا ہے کہ مسلم پرسنل لا اور اسلامی تشخص کو درپیش خطرات کے سدباب کے لئے مسلمانان ہند کو کیا کیا اقدامات کرنے چاہئیں، اس سلسلہ میں میری رائے میں چار محاذوں پر مسلسل جدوجہد ضروری ہے۔

۱۔ دستوری اور قانونی جدوجہد

دفعہ ۴۴ کی منسوخی کے لئے جدوجہد

یہ بات پوری تفصیل سے لکھی جاچکی ہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ (یونیفارم سول کوڈ کی دفعہ) مسلم پرسنل لا اور تمام اقلیتوں کے پرسنل لاز کے لئے لٹکتی ہوئی تلوار ہے جب تک دفعہ ۴۴ موجودہ شکل میں برقرار ہے ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین سنگین خطرے سے دوچار ہیں، ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ پارلیمنٹ میں دفعہ ۴۴ کا جادو جگا کر مسلم پرسنل لا کو نیست ونابود کردیا جائے، اس لئے سب سے ضروری اور فوری کام یہ ہے کہ دفعہ ۴۴ کو دستور سے خارج کرانے یا اس سے اقلیتوں خصوصا مسلمانوں کو مستثنیٰ کئے جانے کی پرزور سیاسی اور آئینی جدوجہد کی جائے، مسلمانوں کے سیاسی مطالبات میں دفعہ ۴۴ کی منسوخی کو سرفہرست جگہ ملنی چاہئے، اس مطالبے پر زور دینے کے لئے اس مسئلہ پر مسلمانوں کی رائے عامہ بیدار کی جانی چاہئے اور برادران وطن پر یہ حقیقت واضح کی جانی چاہئے کہ دفعہ ۴۴ کی منسوخی خود ملک اور وطن کے مفاد میں ہے۔

یکساں سول کوڈ اور اقلیتیں

یکساں سول کوڈ کا شوشہ بار بار چھوڑنے سے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ملک کی دوسری اقلیتیں بھی مضطرب اور فکرمند ہیں، ۲۴ ستمبر ۱۹۹۵ء کو امرتسر میں منعقدہ عائلی سکھ کانفرنس میں سکھوں کے علاحدہ پرسنل لا پر زور دیا گیا اور کانفرنس نے یکساں سول کوڈ کو تسلیم نہ کرنے کا اعلان کیا۔ (قومی آواز لکھنؤ ۲۵ ستمبر ۱۹۹۵ء)

ہندوستان میں آباد عیسائی (کرسچین) بھی اپنے علاحدہ پرسنل لا کو مرتب اور منظور کرانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں، یونیفارم سول کوڈ انہیں بھی تسلیم نہیں، بدھسٹوں کی طرف سے بھی اس قسم کی آواز اٹھ چکی ہے، بہت سے ہندو قبائل بھی یکساں سول کوڈ کے سیلاب

میں بہنے کو تیار نہیں، انہیں اپنے قبائلی رسم ورواج اور طریقۂ زندگی پر حد درجہ اصرار ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری مذہبی اور تہذیبی اقلیتوں کو بھی منظور نہیں، خود ہندوؤں کے بہت سے فرقے اور قبائل بھی اسے مسترد کرتے ہیں۔

اسی طرح ہندوؤں کے بہت سے اہل فکر ودانش یکساں سول کوڈ کے نعرہ کو بے وقت کی راگنی اور بے فائدہ عمل تصور کرتے ہیں، یہ تو ہمارے قومی پریس کی سحر کاری ہے کہ اس نے یونیفارم سول کوڈ کے مطالبہ کو پوری قوم کا مطالبہ بنا کر پیش کیا ہے حالانکہ درحقیقت اس کے حامی بہت اقلیت میں ہیں، ہندوؤں کا ایک بہت مختصر اور جارح طبقہ ہی یکساں سول کوڈ کا داعی اور منادہے۔

اس لئے اگر دفعہ ۴۴ کی منسوخی کے لئے سنجیدہ اور منظم جدوجہد کی جائے تو اس کے لئے رائے عامہ ہموار کرنا کوئی دشوار تر کام نہیں، ظاہر ہے کہ یہ کام آناً فاناً نہیں ہوسکتا ہے بلکہ اس کے لئے بڑی ہوشمندی اور حکمتِ عملی سے طویل جدوجہد کرنی ہوگی، ان تمام اقلیتوں اور مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کو ساتھ لینا ہوگا جو یکساں سول کوڈ کو اپنے مذہب اور ثقافت کے لئے خطرہ تصور کرتی ہیں، افہام وتفہیم اور مذاکرات سے ہندو اہل سیاست اور اہل فکر ودانش کو بھی اس بات کا قائل بنانا ہوگا کہ یکساں سول کوڈ پر اصرار ملک کے لئے مفید نہیں بلکہ انتہائی ضرر رساں ہے، یکساں سول کوڈ کی جنگ چھیڑنے سے ہندوستانی قوم کی بہترین دماغی صلاحیتیں ملک کی تعمیر میں صرف ہونے کے بجائے بری طرح ضائع ہوں گی، باشندگانِ ملک کا ایک بڑا طبقہ اضطراب اور کشمکش میں مبتلا ہوگا اور ملک کی سیاست اور معیشت پر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے۔

یکساں سول کوڈ اور قومی یک جہتی

یکساں سول کوڈ کے حامیوں کو یہ فرسودہ دلیل اپنا وزن کھو چکی ہے کہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے ملک میں اتحاد اور یک جہتی کو فروغ ہوگا، ظاہر ہے کہ جو قانون کروڑوں انسانوں

کے مذہبی عقائد اور دینی جذبات کو بھینٹ چڑھا کر طاقت کے نشہ میں نافذ کیا جائے گا، اس کے ذریعہ ملک میں نفرت اور عداوت کی کاشت ہی ہوگی، ایسے قانون کے ذریعہ اتحاد و یک جہتی کو فروغ ہونے کے بجائے تفرقہ بندی اور بدامنی ہی کو فروغ ہوگا، اس لئے یہ کہنا بڑی بے عقلی اور ہٹ دھرمی کی بات ہے کہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے قومی یک جہتی پیدا ہوگی۔

قانون اور طاقت کے زور پر یکساں شہری قانون (یونیفارم سول کوڈ) کو مرتب کر کے اسے نافذ کرنے کی بات کرنے والے اس حقیقت واقعہ کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ملک کے بعض سرحدی صوبوں (مثلاً ناگالینڈ، میزوروم وغیرہ) میں ملک کی آزادی کو ایک مدت گذرنے کے بعد اس وقت حالات پر قابو پایا جاسکا جب ملک کے دستور میں ان علاقوں کے باشندوں کو خصوصی تحفظات فراہم کئے گئے، ان کے مذہبی اور قبائلی رسم ورواج عدالتی سسٹم وغیرہ کو دستوری ضمانت دی گئی، بلکہ مرکزی پارلیمنٹ کی بالادستی کو قربان کرتے ہوئے دستور ہند میں یہ بات بھی شامل کر لی گئی کہ پارلیمنٹ کا پاس کردہ کوئی قانون جو فلاں فلاں امور سے متعلق ہو وہاں اس وقت تک نافذ نہیں ہوسکتا جب تک کہ علاقائی یا صوبائی اسمبلی اس کی توثیق نہ کردے۔

مثلاً ریاست ناگالینڈ کے بارے میں دستور کے حصہ ۲۱ میں دفعہ ۳۷۱ (الف) اس طرح ہے:

دفعہ ۳۷۱-الف (۱) اس آئین میں کسی امر کے باوجود

(الف) پارلیمنٹ کے کسی ایسے ایکٹ کا اطلاق جو

(۱) ناگاؤں کی مذہبی یا سماجی رسوم

(۲) ناگاؤں کے رواجی قانون

(۳) اور ضابطۂ دیوانی اور فوجداری عدل گستری، جس میں ناگاؤں کے رواجی قانون اور اس کے ذریعہ فیصلے شامل ہیں۔

(۴) اراضی اور اس کے ذرائع ووسائل کی ملکیت اور انتقال سے متعلق ہو۔

ریاست ناگالینڈ پر نہ ہوگا بغیر اس کے کہ ناگالینڈ کی قانون ساز اسمبلی قرارداد کے ذریعہ ایسا فیصلہ کرے (بھارت کا آئین (جنوری ۲۰۰۱ء تک ترمیم شدہ) ص ۳۷۰-۳۷۱)۔

میزورم کے بارے میں بھی اسی طرح کی خصوصی دفعہ وضع کرکے دستور ہند میں شامل کی گئی، چنانچہ دستور ہند کی دفعہ ۳۷۱ (ز) اس طرح ہے۔

۳۷۱ (ز) اس آئین میں کسی امر کے باوجود۔

(الف) امور مندرجہ ذیل کے متعلق پارلیمنٹ کا کوئی ایکٹ میزورم ریاست کو تب تک لاگو نہیں ہوگا جب تک میزورم ریاست کی قانون ساز اسمبلی کی قرارداد کے ذریعہ اس طرح طے نہیں کیا جاتا ہے، یعنی

(۱) میزو لوگوں کی مذہبی یا سماجی رسوم

(۲) میزو روایتی قانون اور ضابطہ

(۳) سول اور فوجداری انصرام جہاں فیصلے میزو روایتی قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۴) ملکیت اور انتقال اراضی

بشرطیکہ اس فقرہ کی کوئی بات آئین (ترپیویں ترمیم) ایکٹ ۱۹۸۶ء کی تاریخ نفاذ سے ٹھیک پہلے میزورم یونین ریاستی علاقہ میں نافذ کسی مرکزی ایکٹ کو لاگو نہیں ہوگی۔

(بھارت کا آئین ص ۳۲۷-۳۲۸، شائع کردہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۲۰۰۱ء)

اقلیتوں خصوصاً مسلم اقلیت کے پرسنل لاز (عائلی شرعی قوانین) کو پامال کرنے کی کوشش خواہ عدلیہ کی طرف سے ہو یا مقنّنہ اور انتظامیہ کی طرف سے ملک کے مفاد میں نہیں ہے، ان اقدامات سے قومی یک جہتی کے بجائے منافرت کو فروغ ہوتا ہے، اور ملک کی کسی چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کو بھی فکر واضطراب میں مبتلا کرکے اور اس کے مذہبی جذبات واحساسات کو مجروح کرکے ملک ترقی نہیں کرسکتا۔

ایک ناگزیر عمل

دفعہ ۴۴ کی منسوخی یا اس میں استثناء کی مہم ایک ناگزیر عمل ہے، جسے ہر قیمت پر انجام دیا جانا چاہئے، خواہ اس کے لئے کتنی ہی طویل اور صبر آزما جدوجہد کرنی پڑے، دستور ہند کے مرتب اور منظور ہونے کے بعد اس میں سو سے زائد بار ترمیمیں ہوچکی ہیں لہذا اگر ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی اقلیتیں اور ہندوؤں کے مختلف قبائل اور فرقے جو یکساں سول کوڈ کے نظریاتی طور پر مخالف ہیں متحد ہوکر دفعہ ۴۴ کی منسوخی یا اس میں ترمیم واستثناء کے لئے منصوبہ بند اور منظّم جدوجہد کریں تو اس میں کامیابی کوئی مشکل عمل نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں میں یکساں سول کوڈ کے حامی بہت اقلیت میں ہیں لیکن ذرائع ابلاغ پر کنٹرول کی وجہ سے انہوں نے یہ تأثر پیدا کردیا ہے کہ ہندوستان کی غالب اکثریت یونیفارم سول کوڈ کے حق میں ہے، یکساں سول کوڈ کی مخالفت میں اگر لاکھوں کا مجمع ہوجائے تو بھی اسے ہمارا قومی پریس کوئی اہمیت نہیں دیتا، اگر بڑی سیر چشمی کا مظاہرہ کیا تو اخبار کے کسی گوشہ میں مختصر سی خبر دیدی کہ چند سو قدامت پرست یکساں سول کوڈ کی مخالفت میں جمع ہوجائے، اس کے برخلاف اگر چند نام نہاد ''ترقی پسندوں'' نے یکساں سول کوڈ کی حمایت اور وکالت میں کوئی جلسہ یا سمپوزیم کیا جس میں بہ مشکل چند درجن لوگ شریک ہوئے تو ہمارا قومی پریس اس کی خبروں کو شاہ سرخیوں میں جگہ دیتا ہے، انگریزی اور ہندی کے بڑے اخبارات کے کئی کئی کالم اور صفحات اس کے لئے وقف کردئے جاتے ہیں۔

پرسنل لاز کو دستوری تحفظ دینے کا مطالبہ

میرا خیال ہے کہ اقلیتوں کے پرسنل لاز کی حفاظت کے لئے محض دفعہ ۴۴ کی منسوخی بھی کافی نہیں ہے بلکہ دستور کے بنیادی حقوق کی دفعات میں کسی مناسب جگہ پر مسلم پرسنل لا اور دوسری اقلیتوں کے پرسنل لاز کی حفاظت کی دفعہ بھی شامل کی جانی چاہئے تاکہ چور دروازوں سے مسلم پرسنل لا وغیرہ میں مداخلت کا سلسلہ بند ہو، صورت حال یہ ہے کہ آزادی

کے بعد مرکزی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں نے مختلف قوانین منظور کر کے دانستہ یا نادانستہ طور پر مسلم پرسنل لا میں مداخلت کی ہے، کریمنل لا (قانون تعزیرات) کی مختلف توضیعات سے اسلام کے عائلی قوانین پر زد پڑتی ہے، یوپی کے خاتمۂ زمینداری ایکٹ نے عورتوں کو زرعی زمینوں میں وراثت پانے سے محروم کر رکھا ہے۔

دستور ہند میں دئے ہوئے حق قانون سازی کے مطابق پرسنل لا کے دائرہ میں شامل امور (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ) کے بارے میں قانون سازی کا اختیار مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت دونوں کو ہے، ملاحظہ ہو دستور ہند کی دفعہ ۲۴۶ فہرست ۳ کا نمبر ۵۔

اسی حق قانون سازی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بی جے پی نے اعلان کیا کہ جن صوبوں میں وہ برسر اقتدار ہے وہاں قانون سازی کر کے یکساں سول کوڈ نافذ کرے گی، مہاراشٹر میں برسر اقتدار شیوسینا، بھاجپا سرکار نے انتہائی تیز رفتاری سے دو ایسے بل پاس بھی کر دئے جن کی زد براہ راست مسلم پرسنل لا پر پڑتی ہے، اس لئے اگر صرف دفعہ ۴۴ کی منسوخی پر اکتفا کیا گیا اور بنیادی حقوق کی دفعات میں پرسنل لا کے تحفظ کی دفعہ شامل نہیں کی گئی تو دستور کی دفعہ ۲۴۶ میں دئے گئے حقِ قانون سازی کا سہارا لے کر مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتیں اسلام کے عائلی قوانین میں مداخلت کا سلسلہ جاری رکھیں گی۔

مجوزہ قوانین کا جائزہ

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے دستوری اور قانونی جدوجہد کا ایک اہم حصہ یہ بھی ہے کہ مرکزی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کئے جانے والے مجوزہ مجموعۂ قوانین کا ہمارے ماہرین قانون اور علماء پوری بیداری مغزی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہیں، پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں جو مجموعۂ قوانین پیش ہونے والے ہوں یا زیر بحث ہوں، ان کی جو دفعات براہ راست یا بالواسطہ اسلام کے عائلی قوانین کو متاثر کرتی ہوں، ان کا فوری طور پر نوٹس لیں اور قانون سازی کے مرحلے میں ایسی دفعات کو رکوانے کوشش کریں، قانون

سازی کے مرحلے میں قانون میں اصلاح و ترمیم آسان ہوتی ہے، اور قانون پاس ہونے، اس پر ایک عرصہ گذرنے کے بعد اس میں تبدیلی کرنا انتہائی دشوار کام ہوتا ہے، دارالسلطنت دہلی میں اور ہر صوبے کے صدر مقام پر ماہرین قانون اور علماء پر مشتمل ایسی قانونی کمیٹی ہونی چاہئے جو قانون سازی کے عمل پر برابر نگاہ رکھے اور اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کرے۔

اس سلسلے میں اب تک ہم سے کافی کوتاہی ہوئی، ابھی تک ہمارے پاس کوئی ایسی مکمل جائزہ رپورٹ بھی نہیں ہے جس میں واضح ہو سکے کہ کن مرکزی اور صوبائی قوانین سے مسلم پرسنل لا میں مداخلت ہوئی اور شریعت ایکٹ (۱۹۳۷ء) متاثر ہوا، ہماری اس غفلت اور بے خبری کی وجہ سے شاہ بانو کیس جیسے پہاڑ ہمارے اوپر ٹوٹتے ہیں اور اس کی تلافی بہت مہنگی پڑتی ہے۔

۲۔ علمی و فکری محاذ (اسلام کے عائلی قوانین کی برتری)

اسلامی قوانین کے خلاف جنگ جاری ہے

اس وقت نیشنل پریس سے لے کر سپریم کورٹ تک میں اسلام کے عائلی قوانین کے خلاف جنگ جاری ہے، ارون شوری جیسے بے شمار صحافت کے سورما یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی تک کا زور لگائے ہوئے ہیں کہ اسلامی قوانین دورِ وحشت کی یادگار ہیں، اسلام کے عائلی قوانین عورتوں کے لئے بڑے ظالمانہ اور جابرانہ ہیں، سپریم کورٹ میں مسلم پرسنل لا کے خلاف متعدد مقدمات درج ہیں جن میں کلی یا جزوی طور پر مسلم پرسنل لا کو چیلنج کیا گیا ہے، ان میں سے بیشتر مقدمات مسلم خواتین کی طرف سے درج کرائے گئے ہیں، اسلام کے عائلی قوانین کے خلاف یہ جنگ ہندوستان تک محدود نہیں ہے، بلکہ پورے عالم میں حتی کہ مسلم ممالک میں بھی یہ جنگ برپا ہے، اسلام کی تصویر مسخ کرنے میں تمام اسلام دشمن طاقتیں برابر کی شریک ہیں، یہ مہم اتنی زور و شور سے چلائی جا رہی ہے کہ غیر مسلموں کے علاوہ بہت سے مسلم نوجوان بھی اسلام کے عائلی قوانین کے بارے میں شک اور بے اعتمادی میں مبتلا ہیں،

اور اسلامی قوانین میں ترمیم واصلاح کا مطالبہ کررہے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ

دوسرا رخ یہ ہے کہ اسلامی شریعت اور اسلامی قوانین کے خلاف برپا اس محاذ آرائی نے بہت سے انصاف پسند غیر مسلم مرد وخواتین میں اسلام کے مطالعہ کا رجحان پیدا کیا ہے، بہت سے غیر مسلم دانشور اور اسکالر اسلام کے قوانین وتعلیمات کا معروضی مطالعہ کر کے اسلام سے بہت قریب آئے ہیں، ان میں سے بہت سوں نے اسلام قبول کرلیا ہے، ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق یورپ کی عورتوں میں قبولِ اسلام کا رجحان مردوں سے کہیں زیادہ ہے، حالانکہ یہ پروپیگنڈہ مسلسل کیا جارہا ہے کہ اسلام عورت کو گری ہوئی نگاہ سے دیکھتا ہے، عورت کو سماج میں باعزت مقام نہیں دیتا، اور ان پر ہر طرح کا ظلم روا رکھتا ہے، خواتینِ یورپ میں قبول اسلام کا بڑھتا ہوا رجحان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یورپ کی تعلیم یافتہ خواتین یورپ کے قوانین کے بجائے اسلامی قوانین میں اپنے حقوق اور اپنی عفت وعصمت کا زیادہ تحفظ تصور کرتی ہیں۔

اہم ترین ذمہ داری

اسلامی قوانین کے خلاف برپا اس فیصلہ کن جنگ میں علماء، فقہاء، ماہرین قوانین، اصحاب فکر وقلم کی اہم ترین ذمہ داری ہے کہ آزادئ نسواں، مساوات مرد وزن جیسے پرفریب نعرو کی قلعی کھولیں، اسلام کے قوانین (خصوصا عائلی قوانین) کی برتری علمی انداز میں ثابت کریں اور اسلام نے خواتین پر جو احسانات کئے ہیں انہیں علمی طور پر اجاگر کریں، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین انتہائی عادلانہ اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، اسلام کے عائلی قوانین اور تعلیمات کے نفاذ سے سماج کے ہر فرد کو اس کا جائز حق ملتا ہے، جنسی اباحیت وانارکی کا سدباب ہوتا ہے، خاندانی نظام میں اعتماد واستحکام پیدا ہوتا ہے، معاشرہ جنسی اور اخلاقی بے راہ روی سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

یورپین کلچر اور عائلی قوانین

آزادئ نسواں اور مساوات مرد وزن کے پرفریب نعروں کے ساتھ مغرب نے عریانیت اور فحاشی سے لبریز جس کلچر کو فروغ دیا ہے آج وہ کلچر اس کے گلے کی ہڈی بن چکا ہے، یورپین کلچر اور عائلی قوانین نے امریکہ اور یورپ کے لئے ایسے سنگین بحران اور مسائل کھڑے کئے ہیں جن کا حل تلاش کرنے سے امریکہ ویورپ کے بڑے بڑے اہل فکر اور دانشور عاجز ہیں، وہاں کا فیملی سسٹم تباہ ہورہا ہے، خاندانی نظام کی تیلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں، بے محابا ہوس رانی، شہوت پرستی، جنسی انارکی کا عفریت مغربی ممالک کو نگل جانے والا ہے، نوجوانوں میں جرائم کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے، شراب اور منشیات نے مغربی سماج کو اندر سے بالکل کھوکھلا کردیا ہے۔

حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ امریکہ ویورپ کی ترقیات سے مرعوب ذہن جس کے ہاتھ میں ایشیاء وافریقہ کی زمام اقتدار ہے امریکہ ویورپ سے سائنس اور ٹکنالوجی درآمد کرنے کے بجائے ان ممالک کا بیمار کلچر، فحاشی، عریانیت درآمد کرنے میں لگا ہوا ہے، مغربی ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی سپلائی کرنے میں تو بہت بخیل ہیں، ہر قیمت پر اس پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتے ہیں، لیکن اپنا زہرناک کلچر برآمد کرنے میں بڑے فراخ ہیں، پوری دنیا میں تیزی کے ساتھ اپنا متعفن کلچر اور جاں بلب خاندانی نظام پھیلانا چاہتے ہیں گنجے کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ ہر شخص گنجا ہوجائے۔

ان حالات میں دین حق کے حاملین کی اہم ترین ذمہ داری ہے کہ دنیا کے سامنے اسلام کا نظام رحمت پوری جرأت اور حکمت کے ساتھ پیش کریں، یہ حقیقت واشگاف کریں کہ یورپ کی غیر انسانی تہذیب اور خودساختہ غیر فطری عائلی قوانین نے دنیا کو تباہی کے جس دہانہ پر لاکھڑا کیا ہے اس سے نجات کا واحد راستہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی قوانین پر عمل ہے، اعداد وشمار کی روشنی میں یہ بات واضح کریں کہ یورپ کے عائلی قوانین کا تحفظ کرنے

کے بجائے ان کا بری طرح استحصال کیا ہے اور ان کے حقوق پامال کئے ہیں۔

ہندوستان میں یکساں سول کوڈ کی وکالت کرنے والے اسلام کے عائلی قوانین (نکاح، طلاق وغیرہ کے قوانین) کو تنقید اور تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں، ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں عورتوں کے حقوق پامال کئے گئے ہیں، صنف نازک پر ظلم وستم روا رکھا گیا ہے، اس لئے یکساں سول کوڈ نافذ کر کے ان مظالم کا سد باب ضروری ہے، یہ حقیقت انتہائی تکلیف دہ ہے کہ ہمارے بہت سے جدید تعلیم یافتہ نوجوان جنہوں نے اسلام کے عائلی قوانین کا مطالعہ مغربی مصنفین کی عینک سے کیا ہے وہ بھی اسلام کے عائلی قوانین پر اس طرح کے اعتراضات وارد کرتے ہیں، یا کم از کم اسلامی قوانین کی صلاحیت وافادیت کے بارے میں شک وارتیاب میں مبتلا ہیں، ان فریب خوردہ مسلم نوجوانوں اور خواتین کو یکساں سول کوڈ کا حامی بنا کر کھڑا کیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا مطالبہ خود مسلمانوں کی صف سے ہو رہا ہے۔

ان حالات میں علماء مفکرین اور قائدین کی یہ ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین کی حقانیت اور برتری ثابت کرنے کے لئے ہر سطح پر پوری جدوجہد کریں، اسلام کے عائلی قوانین کا دوسرے عائلی قوانین سے نظریاتی اور تجزیاتی سطح پر موازانہ کر کے یہ حقیقت واضح کریں کہ دنیا کی سماجی اور معاشرتی مشکلات کا حل بھی صرف اسلام کے پاس ہے، اسلامی تعلیمات ہی کے سائے میں پرامن معتدل سماجی ماحول برپا ہوسکتا ہے، مغرب زدہ مسلم نوجوانوں اور خواتین کا اسلامی قوانین پر اعتماد بحال کیا جائے، ان کے شبہات کا ازالہ کیا جائے۔

۳۔ اصلاح معاشرہ

ہندوستان میں اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کے تحفظ کے لئے ایک اہم اور ضروری کام یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم سماج کو اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے، اور

اصلاح معاشرہ کے لئے بڑے پیمانہ پر جدوجہد کی جائے، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے سماج کا ایک بڑا طبقہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بالکل بیگانہ ہے، نکاح، طلاق، میراث اور دوسرے عائلی مسائل کے بارے میں اسلامی تعلیمات وتصورات سے اکثر مسلمان ناواقف ہیں، خاندان کے افراد دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض سے بے خبر ہیں، اسلامی تعلیمات سے بے گانگی اور صحیح اسلامی تصورات سے دوری کا نتیجہ ہے کہ ہماری خانگی زندگی کا سکون غارت ہو چکا ہے، ہر آن نئے نئے خانگی تنازعات وجود میں آرہے ہیں، شوہر بیوی سے ناخوش، بیوی شوہر سے تنگ، والدین اولاد سے نالاں، اولاد والدین سے بیزار، پھر یہ خانگی نزاعات گھر کی چہار دیواری تک محدود نہیں رہتے بلکہ بسا اوقات فتنہ وفساد، قتل وقتال، عدالتی چارہ جوئی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، یہ خانگی تنازعات عدالتوں میں پہونچنے کے بعد شاہ بانو کیس جیسی قیامت امت مسلمہ کے سر پر ڈھاتے ہیں، مخالفین کو اس بات کا موقع فراہم کرتے ہیں کہ اپنی طرف سے خوب خوب رنگ آمیزی کر کے مسلم سماج کی بھیانک رسوا کن تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں، اور اسلامی شریعت پر براہ راست حملے کریں۔

ہندو سماج سے تأثر کے نتیجہ میں بہت سی ہلاکت خیز، ہندوانہ رسمیں مسلم سماج میں راہ پا گئی ہیں، بہت سے مسلم گھرانوں میں فرائض سے بڑھ کر ان رسموں کی پابندی ہوتی ہے، خواہ اس کے لئے دین وایمان، مال ودولت، راحت وسکون سب کچھ قربان کرنا پڑے، جہیز، تلک، بارات اور اس طرح کے بے شمار رسوم وآداب ہم نے غیر مسلم سماج سے قبول کر لئے ہیں، اس کے نتیجہ میں ہمارا مسلم معاشرہ شدید مصائب ومشکلات سے دوچار ہے، اور ہمارے خاندانی نظام کی تیلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں۔

مسلم معاشرہ کو اسلام کے بنیادی عقائد وتعلیمات، معاشرتی تصورات سے روشناس کرانے، معاشرتی اصلاح اور غیر اسلامی رسوم وعادات کے استیصال کے لئے بڑے پیمانہ پر مسلسل، منظم اور مثبت جدوجہد کی ضرورت ہے، یہ کام جس قدر صبر آزما اور مشکل ہے، اتنا ہی ضروری ہے، لیکن یہ کام نہ تنہا چند افراد کے بس کا ہے نہ کسی ایک جماعت کے،

مسلمانوں کی تمام دینی وملی جماعتیں اور ادارے نیز علماء و مصلحین ، ائمہ مساجد، مقررین، قائدین اور اہل دانش اگر اس کام میں پوری دلچسپی لیں تو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہونے کی امید ہے۔

الحمدللہ حالیہ برسوں میں اصلاح معاشرہ کی تحریک نے کچھ زور پکڑا ہے، سماج پر اس کے کچھ خوشگوار اثرات بھی پڑے ہیں لیکن ابھی یہ کوششیں مطلوبہ مقدار اور معیار سے بہت کم ہیں، پھر بسا اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کانفرنس اور جلسے کرنا خود مقصد بن کر رہ گیا ہے ان کے بعد سعی وعمل میں تیزی آنے کے بجائے سناٹا چھا جاتا ہے، اس صورت حال کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

۴۔ اسلامی نظام عدل کا قیام

ہندوستان کے مسلم سماج میں کرنے کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ پورے ملک میں دارالقضاء قائم کئے جائیں، ملک کے ہر ہر علاقہ میں دارالقضاء کا جال بچھا دیا جائے، مسلمان طے کرلیں کہ اپنے مقدمات خصوصاً خانگی اور عائلی تنازعات سرکاری عدالتوں کے بجائے دارالقضاء میں لے جائیں گے اور ان کے فیصلے خوشی خوشی اپنے اوپر نافذ کریں گے، شرعی دارالقضاء کا قیام مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے اور موجودہ حالات میں اسلام کے عائلی قوانین کو اسلام دشمنوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کا بڑا ذریعہ بھی ہے۔

مسلمانوں میں یہ احساس بیدار کیا جائے کہ باہمی نزاعات میں مسلمان قاضی سے فیصلہ حاصل کرنا ان کی دینی ذمہ داری ہے، پورے ملک میں نظام قضاء کے لئے فضا ہموار کی جائے، دارالقضاء قائم کئے جائیں، یہ دارالقضاء منظّم، باضابطہ اور احساس ذمہ داری کے ساتھ قیام عدل کا فریضہ انجام دینے والے ہوں کہ لوگوں کو ان پر پورا بھروسہ ہو۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے ضرورت اور حالات کی نزاکت محسوس کر کے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں نظام قضاء قائم کرنے کی جدوجہد شروع کردی ہے لیکن ابھی اس کی رفتار

دھیمی ہے، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا ہے کہ قیام دارالقضاء کو کوششوں میں تیزی لائی جائے اور چند برسوں میں پورے ہندوستان میں دارالقضاء کا جال بچھا دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلام کے احکام وتعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہندوستان میں بچے کھچے اسلامی قانون کے سرمائے کی حفاظت فرمائے اور گم شدہ اسلامی سرمایہ کی بازیابی میں کامیابی فرمائے۔

(ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء)

☆☆☆☆

شاہ بانو کیس میں
سپریم کورٹ کے فیصلہ کی مخالفت کیوں؟

شاہ بانو کیس میں
سپریم کورٹ کے فیصلہ کی مخالفت کیوں؟

شاہ بانو کے کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ نے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو تشویش واضطراب میں مبتلا کر دیا ہے، مسلمانوں کے تمام فرقے اس فیصلہ کے تباہ کن اثرات کا اندازہ لگا کر ایک پلیٹ فارم پر آ گئے ہیں اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی مہم پورے جوش وخروش سے چلا رہے ہیں، مسلمانان ہند کی طرف سے متفقہ طور پر اس فیصلہ کی مذمت اور مخالفت کی جارہی ہے، لیکن مسلم برادری سے تعلق رکھنے والے معدودے چند نادان یا مفاد پرست ''نام نہاد'' دانشور بالا صاحب دیورس جیسے اسلام دشمن فرقہ پرستوں کی آواز میں آواز ملا کر اس فیصلے کی تائید کر رہے ہیں، بڑے رسیلے سُر اور میٹھے لب ولہجہ میں یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ قائدین ملت اور علماء کرام بلاوجہ نان ونفقہ کے پھیر میں پڑ کر پوری امت کی توانائی، وقت اور سرمایہ ضائع کر رہے ہیں اگر سپریم کورٹ نے نادار اور بے سہارا مطلقہ خاتون کو نکاح ثانی تک سابق شوہر سے نان ونفقہ دلوا دیا تو کیا برا کیا؟ اس فیصلہ سے اسلام کو کیا خطرہ لاحق ہو گیا؟

یہ پروپیگنڈہ قومی پریس کے ذریعہ اتنے زور شور اور تسلسل سے کیا جارہا ہے کہ سادہ لوح مسلمان اور غیر جانبدار غیر مسلم بھی اس سے متاثر ہو سکتے ہیں کیونکہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کا اصل متن ان کے سامنے نہیں ہے جسے پڑھ کر ملت اسلامیہ کے تشویش واضطراب کا باعث سمجھ سکیں۔

فکرمندی اور اضطراب کے اسباب

ہم اس مضمون میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے تعلق سے مسلمانوں کی فکرمندی اور اضطراب کے اسباب کی نشاندہی کریں گے اور یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ اس فیصلہ میں مسلمانوں کے دین ومذہب، تہذیب وثقافت کے لئے کیسی کیسی بجلیاں پوشیدہ ہیں اور اسلام کے عائلی قوانین کس طرح اس فیصلہ کی زد میں آ گئے ہیں۔

ہفت روزہ دعوت دہلی نے مسلم پرسنل لا نمبر (۱۶ر تا ۲۲ر جنوری ۸۵ء) میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے متن کا مکمل ترجمہ شائع کیا ہے اسی کو سامنے رکھ کر ہم یہ مضمون سپرد قلم کر رہے ہیں۔

اسلام پر دلخراش حملہ

(۱) فیصلہ کے شروع ہی میں سپریم کورٹ نے غیر جانبداری اور عدالتی روایت کو پس پشت ڈال کر اسلام پر دل خراش حملہ شروع کر دیا ہے چیف جسٹس چندر چوڑ صاحب فیصلہ کے پہلے کالم میں لکھتے ہیں:

> ''یہ بات مبینہ طور پر کہی جاتی ہے کہ اسلام کا تاریک پہلو یہ ہے کہ اس نے عورتوں کا درجہ گرا دیا ہے (منتخبات قرآن، ایڈورڈ ولیم لین ۱۸۴۳ء، اشاعت ثانی ۱۹۸۲ صفحہ XC (تعارف) پیغمبر (ﷺ) سے یہ قول توقع ہے کہ غلط منسوب ہے کہ ''عورت ٹیڑھی پسلی سے بنائی گئی ہے اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی، اس لئے اپنی بیویوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرو'' (دعوت، مسلم پرسنل لا نمبر صفحہ ۹ کالم ۱)۔''

اس اقتباس پر ہم کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں کرنا چاہیے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کوئی انصاف پسند غیر جانبدار شخص مذکورہ بالا عبارت کو ہندوستان کی عدالت عالیہ کا فیصلہ تصور نہیں کر سکتا، بلکہ اگر یہ بتائے بغیر کہ عبارت کہاں سے لی گئی ہے اس سے دریافت کیا جائے کہ یہ

عبارت کس کی ہوسکتی ہے؟ تو بلا تأمل جواب دے گا کہ کسی اسلام دشمن مستشرق کی معلوم ہوتی ہے، اسلام نے پہلی بار عورت کو باعزت مقام دلایا، صنف نازک کے حقوق کی نگہداشت کی، پھر بھی ہماری سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں یہ الزام عائد کردیا کہ اسلام نے عورتوں کا درجہ گرایا ہے، جس قول کے بارے میں فاضل چیف جسٹس صاحب نے لکھا ہے کہ ''توقع ہے کہ یہ قول پیغمبر صاحب کی طرف غلط منسوب ہے'' وہ صحیح ترین حدیث ہے، حدیث کی تمام مستند کتابوں حتی کہ بخاری ومسلم میں بھی موجود ہے، چندر چوڑ صاحب کو اس میں عورت کی تذلیل محسوس ہوئی، اگر حدیث کی اصل کتابوں تک ان کی رسائی ہوتی اور شارحین حدیث کی تشریحات کی روشنی میں اس حدیث کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو انہیں اتنی بڑی غلط فہمی نہ ہوتی یہ حدیث تو عورت کے حقوق کی حفاظت، اس کے ساتھ حسن معاملہ، لطف وعنایت، رأفت ومحبت کے سلسلہ میں بڑی واضح ہدایت ہے۔

فیصلہ کے پہلے ہی پیراگراف میں سپریم کورٹ نے اسلام کے خلاف جو زہر افشانی کی ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فاضل چیف جسٹس صاحب کس موڈ میں ہیں اور کیا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں، پورے فیصلہ میں جگہ جگہ اسلامی قوانین کے بارے میں جارحانہ تبصرے موجود ہیں، سپریم کورٹ کے فیصلے خود ہی قانون کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں، دوسری عدالتوں کے لئے یہ فیصلے رہ نما اور قابل تقلید قرار پاتے ہیں اس لئے درحقیقت اس فیصلے نے عدالتوں کی راہ سے اسلام پر حملوں اور اسلامی قوانین کو نظر انداز کرنے کا دروازہ کھول دیا ہے، جو مسلمانوں کے دین وایمان، عزت وحمیت کے لئے زبردست چیلنج ہے۔

شرعی قوانین پر ضابطہ فوجداری کی بالادستی

(۲) ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کا وہ حصہ جس میں نادار مطلقہ کو عدت گذرنے کے بعد بھی نکاح ثانی تک ''بیوی'' قرار دیا گیا ہے اور اس کا نان ونفقہ سابق شوہر پر عائد کیا گیا ہے اسلامی قانون سے براہ راست متصادم ہے، کیونکہ اسلامی قانون کی رو سے عدت

کے بعد سابق شوہر پر نفقہ لازم کرنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، عدت ختم ہوتے ہی رشتۂ زوجیت اور اس کے تمام اثرات ختم ہوجاتے ہیں، دفعہ ۱۲۵(۱) تشریحی کلاز (ب) کے مسلم پرسنل لا سے متصادم ہونے کی بنا پر مسلم ممبران پارلیمنٹ نے اس کے خلاف پارلیمنٹ میں مسلسل آواز بلند کی، اس کے نتیجہ میں دفعہ ۱۲۷(۳)(ب) کا اضافہ کیا گیا تاکہ مسلم پرسنل لا دفعہ ۱۲۵ کی زد سے محفوظ ہوجائے، سپریم کورٹ نے اس فیصلے میں دفعہ ۱۲۷(۳)(ب) کو چٹکیوں میں اڑادیا اور کم ازکم مسلمانوں کے حق میں اسے حرف بے معنی بنادیا، اس کے آگے بڑھ کر مسلمانوں کے آئینی حقوق پامال کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے ہمیشہ کے لئے طے کردیا کہ اگر مسلم پرسنل لا اور ضابطہ فوجداری میں ٹکراؤ ہو تو ضابطۂ فوجداری کو ترجیح حاصل ہوگی، کتنے فیصلہ کن اور دوٹوک انداز میں چندر چوڑ صاحب لکھتے ہیں:

> ''ضابطۂ فوجداری اور مسلم پرسنل لا میں ترجیح کسے دیجائے؟ اس سوال پر ہم نے فیصلہ یہ فرض کرکے دیا ہے کہ دونوں باہم متصادم ہیں اور ہم نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ ہم اپنے اختیارات کی حد تک اس سوال کو ہمیشہ کے لئے طے کردینا چاہتے تھے کہ ٹکراؤ کی صورت میں پارٹیوں کے شخصی قانون پر دفعہ ۱۲۵ کو بہرحال بالادستی حاصل ہوگی۔'' (ہفت روزہ دعوت، دہلی، مسلم پرسنل لا نمبر صفحہ ۱۰ کالم ۳)

سپریم کورٹ کا یہ دوٹوک فیصلہ مسلم پرسنل لا کی معطّلی اور یکساں سول کوڈ کی طرف زبردست پیش قدمی ہے اور مسلمانوں کے ایمان اور غیرت کو زبردست چیلنج ہے، گویا ہندوستان میں جاری قوانین میں سب سے کمزور اور ناقابل التفات مسلم پرسنل لا ہی ہے کہ جہاں کسی قانون سے اس کا ٹکراؤ ہوا فوراً زمیں بوس ہوگیا، اس فیصلہ کے برقرار رہتے ہوئے، مسلم پرسنل لا نافذ ہوتے ہوئے بھی رفتہ رفتہ کالعدم ہوجائے گا، ضابطۂ فوجداری اور دوسرے مجموعۂ قوانین کے تحت مسلم پرسنل لا سے متصادم قوانین تدریجاً بنائے جائیں گے اور انہیں مسلم پرسنل لا پر بالادستی حاصل ہوتی رہے گی، جیسا کہ اس فیصلہ کے رخ سے دو دو چار کی

طرح واضح ہے، برابر اس چور دروازے سے مسلم پرسنل لا پر شبخون مارا جائے گا، رفتہ رفتہ سارا مسلم پرسنل لا عملاً منسوخ ہوکر رہ جائے گا، اگر مسلمانوں کو اپنا دین وایمان عزیز ہے تو انہیں ہر قیمت پر یہ چور دروازہ بند کرنا پڑے گا، پارلیمنٹ میں ایسا واضح بل پاس کرانا پڑے گا جو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے سارے امکانات ختم کردے۔

قرآن وسنت کی من مانی تشریح

(۳) اس فیصلہ کا سب سے زیادہ تشویش ناک اور اضطراب انگیز پہلو یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے قرآن وسنت اور قانون اسلامی کی تعبیر وتشریح کا اختیار صحابہ کرام، مجتہدین امت، فقہاء اسلام سے چھین کر ہندوستانی عدالتوں کے ججوں کے سپرد کردیا ہے کہ وہ قرآن وسنت، فقہ اسلامی کی چودہ سو سالہ تعبیر وتشریح سے آزاد ہوکر اسلامی قوانین کی من مانی تشریح کریں، انگریزوں کے دور سے لے کر اب تک ہر عدالت اس بات کی پابند تھی کہ مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں فقہاء اسلام اور ائمہ مجتہدین ہی کی آراء کو سند مانے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرے، کسی عدالت نے قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی تعبیر وتشریح کا نازک کام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا، انگریزوں کے دور اقتدار میں انگلستان میں پریوی کونسل قائم تھی، ہندوستان کی تمام عدالتوں سے مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد اس کی اپیل پریوی کونسل میں جاتی تھی اور پریوی کونسل کا فیصلہ آخری فیصلہ قرار دیا جاتا تھا، آج بھی ہمارے عدالتی نظام میں پریوی کونسل کے فیصلوں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، زیر بحث فیصلہ میں بھی پریوی کونسل کا حوالہ دیا گیا ہے، پریوی کونسل کے متعدد فیصلوں میں یہ بات بڑی صراحت سے موجود ہے کہ مسلم پرسنل لا کے تعلق سے ججوں کو انہیں قوانین کے مطابق فیصلے دینے ہوں گے جو ائمہ اسلام نے مرتب کردئے ہیں اور ججوں کو خود قرآن وحدیث سے قوانین اخذ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

''ملا نے باب ۴ سیکشن ۳۴ میں یہ بات کہی ہے کہ عدالتوں کو چاہئے کہ محمڈن لا کی بنیاد پر فیصلہ دیتے وقت زمانۂ سلف کے ممتاز ومستند مفسرین قرآن کی

رایوں کو نظر انداز کرکے قرآن کو من چاہے معانی پہنانے کی کوشش نہ کریں، اس ضمن میں انہوں نے مقدمہ آغا محمد بنام کلثوم بی بی (۱۸۷۷ء) میں پریوی کونسل کے فیصلہ (۲۴ آئی-اے ۱۹۶، صفحہ ۲۰۳-۲۰۴) کو بنیاد بنایا ہے۔''

ملا کی کتاب ''پرنسپلز آف محمڈ لا'' کے سیکشن ۳۶، باب ۴ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ''قانون کے نئے ضابطے اور قاعدے رائج نہ کئے جائیں، خواہ وہ زمانۂ حال کے وکلاء کے نزدیک قدیم متنوں کے منطقی نتائج ہی کیوں نہ قرار پائیں، اگر زمانہ قدیم کے ماہرین قانون (فقہاء) نے اس طرح کے نتائج اخذ کرنے سے اجتناب کیا ہو'' (باقر علی خاں، بنام انجمن آراء بیگم، ۳۰ آئی-اے صفحہ ۱۱۱-۱۱۲) (تحریری بحث مسٹر گووندن نائر سینئر ایڈوکیٹ مسٹر یونس سلیم ایڈوکیٹ مطبوعہ دعوت پرسنل لا نمبر صفحہ ۷ کالم ۵)۔

دوہرا عدالتی معیار

پروفیسر طاہر محمود (صدر شعبۂ قانون دہلی یونیورسٹی) کا زیر بحث فیصلہ میں دو جگہ بڑی اہمیت سے حوالہ دیا گیا ہے، انہیں طاہر محمود صاحب نے اپنے ایک تازہ مضمون میں بڑا زبردست انکشاف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''الہ آباد ہائی کورٹ میں ایک حالیہ مقدمہ میں یہ سوال زیر بحث تھا کہ کیا ہندوؤں کی مذہبی کتابیں واقعی نیچی ذات والوں کے لئے بعض روحانی اور سماجی حقوق کے دروازے بند رکھتی ہیں، اور دراصل اگر ایسا ہی ہے تو کیا جدید ہندوستان میں، جہاں دستور ذات پات کے امتیاز کو قطعاً مسترد کرتا ہے، عدالتیں ان اصولوں کو نافذ کرنے کی پابند ہیں؟ اس اہم سوال کے پہلے حصہ کا جواب مثبت فرض کرتے ہوئے ہائی کورٹ کے فاضل جج جناب چیف جسٹس کیرتی نے اس کے دوسرے حصہ کا جواب نفی میں دیا اور فیصلہ کیا

کہ عدالت ہندوؤں کے مذہبی قانون کے ان ضوابط پر عمل نہیں کرسکتی جو نیچی ذات والوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھتی ہیں، ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی، اپیل کا فیصلہ کرتے ہوئے سپریم کورٹ کی ایک بنچ نے الہ آباد کے جسٹس کیرتی پر ان الفاظ میں تنقید کی ''ہماری رائے میں فاضل جج نے یہ نکتہ سمجھنے میں غلطی کی کہ دستور ہند کی بنیادی حقوق والی دفعات کا اطلاق فریقین کے پرسنل لا پر نہیں ہوتا ہے عدالت کو چاہئے کہ فریقین کے پرسنل لا کا بعینہٖ اسی طرح اطلاق کرے جیسے کہ اس کے اصول ہندو قانون کی مستند کتابوں میں مرقوم ہیں ان اصولوں کے نفاذ کے ضمن میں فاضل جج کو عصر جدید کے اپنے تصورات کو نافذ العمل نہیں کرنا چاہئے۔(دیکھئے مقدمہ کرشنا سنگھ بنام متھرا ہیرا اے-آئی آر ۱۹۸۰ء سپریم کورٹ صفحہ ۷۰۷)

عدالت عالیہ کی یہ تنبیہ ماضی میں پریوی کونسل اور دیگر اعلی عدالتوں کے ان متعدد فیصلوں کے عین مطابق ہے جن میں تمام مذہبی کتابوں کو خواہ وہ کسی بھی فرقہ کی ہوں عدالتی تشریح وتفسیر کے دائرہ سے خارج رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔(پروفیسر طاہر محمود ''متھرا ہیرا، بنام شاہ بانو، دوہرے عدالتی معیار کی کہانی''مطبوعہ قومی آواز لکھنؤ جلد ۴۰ نمبر ۲۹۰ صفحہ ۳ کالم ۲)۔

قدیم عدالتی روایات سے انحراف

اوپر ذکر کردہ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ انگریزوں کے دور سے لے کر اب تک ہماری عدالتیں قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی من پسند تعبیر وتشریح سے گریز کرتی تھیں اور قرآن وسنت کی اسی تعبیر وتشریح کو بنیاد بنا کر فیصلے کرتی تھیں جسے علماء متقدمین اور ائمہ اسلام نے اختیار کیا تھا، لیکن سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ میں قدیم عدالتی روایات اور نظیروں کو نظر

انداز کر کے قرآنی آیات کی ایسی تفسیر کی گئی ہے جو چودہ سو سال کے تمام مفسرین، مجتہدین اور فقہاء اسلام کے متفقہ تفسیر کے خلاف ہے، ضابطۂ فوجداری کو مسلم پرسنل لا پر ترجیح دینے سے کہیں زیادہ سنگین اور اضطراب انگیز یہ بات ہے کہ سپریم کورٹ نے اپنے مخالف اسلام فیصلے پر اسلام کی قباچست کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لئے قرآنی آیات کے معانی میں کھلی تحریف کی ہے، تحریف کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ذریعہ معاش سے محروم مطلقہ بیوی کو نان ونفقہ دینے کی شوہر کی ذمہ داری کے معاملے میں دفعہ ۱۲۵ اور مسلم پرسنل لا کے مندرجات میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، اس معاملہ میں قرآن مقدس سے بڑھ کر اور کوئی دوسری سند نہیں ہوسکتی.....قرآن کی آیات ۲۴۱، ۲۴۲ اس بات کی مظہر ہیں کہ پیغمبر کے مطابق ایک مسلم شوہر اپنی مطلقہ کو نان ونفقہ فراہم کرنے کا پابند ہے۔''

اس کے بعد چند آیات کے مختلف تراجم درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان آیات کے پیش نظر اس بات میں شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ قرآن نے مسلم شوہر کو زوجۂ مطلقہ کو نان ونفقہ دینے یا اس کے گذارے کا انتظام کرنے کا پابند بنایا ہے۔''(ہفت روزہ دعوت مسلم پرسنل لا نمبر صفحہ ۱۱ کالم ۲، ۳)

سپریم کورٹ کے اس غلط طرزِ عمل سے بڑی خطرناک نظیر قائم ہوگئی، اس طرح سپریم کورٹ نے قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی تفسیر وتشریح کا اختیار نبی اکرم (فداہ ابی وامی) صحابہ کرامؓ، مفسرین، مجتہدین، فقہاء سے چھین کر ججوں کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ لوگ اپنی سمجھ اور اپنی پسند سے قرآن وسنت اور قانون اسلامی کی کوئی بھی تعبیر وتشریح کر کے مسلمانوں کے سر تھوپ دیں، خواہ کوئی بھی مسلمان اس سے متفق نہ ہو، پھر تو مسلم پرسنل لا ایک بے معنی سی چیز بن کر رہ گئی، مسلم پرسنل لا باقی ہوتے ہوئے بھی کالعدم ہوگیا، قرآن وسنت اور قانون اسلامی

بازیچۂ اطفال بن گئے، مسلم پرسنل کے تحفظ کے لئے ہم جو بھی جدوجہد کریں قرآن وسنت کی ''جدید تعبیر وتشریح'' کی تلوار موجود ہونے کی صورت میں بالکل سعی لاحاصل ہے سپریم کورٹ کے فیصلہ کا یہی وہ پہلو ہے جو سب سے زیادہ مسلمانوں کی تشویش واضطراب کا باعث بنا ہوا ہے، اپنی آنکھوں وہ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن وسنت عدالتوں کی تفسیر وتشریح کی زد میں آگئے ہیں، ان کی واحد آسمانی کتاب مقدس اور قابل احترام تسلیم کئے جانے کے بجائے کھلونا بنالی گئی ہے، حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو اس فیصلہ نے تمام فرقوں کی مذہبی کتابوں کے لئے خطرہ پیدا کردیا ہے اب ہماری عدالتیں اس کی پابند نہیں رہیں کہ ان مقدس مذہبی کتابوں کی وہی تشریح کریں جو اس مذہب کے ماہرین کرتے چلے آئے بلکہ اپنے تئیں مذہبی کتابوں کی جو تشریح کرنی چاہیں کرسکتی ہیں۔

یہ خطرہ صرف ''قدامت پسند'' علماء ہی محسوس نہیں کررہے ہیں بلکہ پروفیسر طاہر محمود صاحب جیسا مسلمان جس کی سیکولر مزاجی، ترقی پسندی، قانون دانی سپریم کورٹ کی نظر میں بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے، انہوں نے بھی مذکورہ بالا خطرہ، اضطراب وتشویش کا اظہار کیا ہے، موصوف لکھتے ہیں:

''عام مسلمانوں کی اکثریت کو جس بات نے برافروختہ کررکھا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ سپریم کورٹ نے مطلقہ کے نفقہ کو کس طرح طے کیا ہے ان کی ناراضگی اور تفکر تو اس پر ہے کہ ملک کی یہ عدالت عالیہ مفسر قرآن بن بیٹھی ہے، انہیں جو زبردست پریشانی لاحق ہے، وہ یہ دیکھ کر ہے کہ وحی الٰہی پر مبنی اسلام کی کتاب مبین کس آسانی سے عدلیہ کی ''فعالیت'' کے زمرہ میں لے آئی گئی ہے.....اس فیصلہ کو قرآن مجید کی تعلیمات کے عین مطابق ثابت کرنے کی جو کوشش سپریم کورٹ کے فاضل جج صاحبان نے کی ہے اس سے مسلمانان ہند بجا طور پر اپنے اس وطن عزیز میں اپنے محبوب دین کے مستقبل کی طرف سے بے حد فکرمند ہوگئے ہیں یہ واقعہ ہے کہ کلام الٰہی کی از سر نو تفسیر وتشریح کا

حق اگر جدید عدالتوں کو دے دیا جائے تو یہ استحقاق اس ملک میں اسلام کی بقا کے لئے سم قاتل ثابت ہوگا، ہمارے فضلاء اور دانشوروں کو خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم یہ بات سمجھنی چاہئے کہ ملت کا یہ موجودہ تردد اور اندیشہ قطعاً بے بنیاد نہیں ہے۔'' (طاہر محمود ''متھرا ہیرا بنام شاہ بانو، دوہرے عدالتی معیار کی کہانی'' قومی آوازی لکھنؤ، جلد ۴۰، نمبر ۲۹۰، صفحہ ۳، کالم ۴، ۵)

یکساں سول کوڈ کی حمایت ووکالت

(۴) فیصلہ کے آخری حصہ میں سپریم کورٹ کے فاضل جسٹس صاحب نے یکساں سول کوڈ کی پرزور وکالت کی ہے اور حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ یکساں سول کوڈ (ملک کے تمام باشندوں کے لئے یکساں شہری قانون) نافذ کرے، لکھتے ہیں:

''یہ بات بڑے دکھ کی ہے کہ آئین کی دفعہ ۴۴ کی حیثیت ہنوز حرفِ بے معنی کی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ ''ریاست ہندوستان کے تمام علاقوں کے شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ تشکیل دینے کی کوشش کرے گی'' ابھی تک ملک کے لئے یکساں سول کوڈ بنانے کے سلسلے میں سرکاری سطح سے کسی سرگرمی کا ثبوت نہیں ملا ہے، ایسا لگتا ہے کہ یہ یقین راسخ ہوچلا ہے کہ اپنے پرسنل لا کی اصلاح کے معاملے میں پہل مسلمانوں ہی کی طرف سے ہونی چاہئے، یکساں سول کوڈ متصادم نظریات پر مبنی قوانین کے تئیں بے جوڑ وفاداریوں کو ختم کرکے قومی یکجہتی کے حصول میں مدد دے گا کوئی بھی اس معاملہ میں بے مصرف رعایت دے کر بلی کی گردن میں گھنٹی نہیں باندھے گا، ملک کے شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ کی تشکیل کا فرض ریاست کو ہی سونپا گیا ہے اور بلا شبہ اسے اس معاملہ میں قانون سازی کی قدرت بھی حاصل ہے.....مختلف عقیدۂ وفکر کے لوگوں کو ایک مشترک پلیٹ فارم پر

لانے کی مشکلات کا ہمیں احساس ہے لیکن اگر آئین کی کوئی اہمیت ہے تو شروعات تو ہونی ہی چاہئے عدالتوں کو ناگزیر طور پر سماجی مصلح کا رول ادا کرنا پڑے گا، نا انصافی کو جب کہ وہ اتنی صریح ہو حساس ذہن برداشت نہیں کرسکتے، لیکن شخصی قوانین کی درمیانی خلیج کو پر کرنے کے سلسلہ میں عدالتوں کی جستہ جستہ کوششیں یکساں سول کوڈ کا بدل نہیں بن سکتیں۔'' (ہفت روزہ دعوت، مسلم پرسنل لا نمبر، صفحہ ۱۲، کالم ۳، صفحہ ۱۳، کالم ۱)

لاشعور کی گواہی

اس پیراگراف پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے، غور سے اس پیراگراف کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلہ کو موافقِ قرآن ثابت کرنے کے باوجود فاضل جج صاحبان کا لاشعور گواہی دے رہا ہے کہ یہ فیصلہ مسلم پرسنل لا کے سراسر خلاف اور یکساں سول کوڈ کی طرف زبردست چھلانگ ہے اور خود ججوں کے احساس وتأثر کے مطابق ان حضرات نے اس فیصلہ میں دستور وقانون کی تنفیذ سے زیادہ ''سماجی مصلح'' کا رول ادا کیا ہے، قانون کے الفاظ کی پابندی کرنے کے بجائے سپریم کورٹ نے اس فیصلہ میں قانون کی غایاتی اور تصوری طریقۂ تشریح کا سہارا لیا ہے۔

جہاں تک یکساں سول کوڈ کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں ہم سپریم کورٹ سے زیادہ دستور ہند کے واضعین کو قصوروار سمجھتے ہیں، جب تک آئین کے دفعہ ۴۴ کی تلوار اقلیتوں کے سر پر لٹکتی رہے گی یکساں سول کوڈ کا ناگوار قضیہ بار بار سر اٹھاتا رہے گا، اس لئے ہماری پارلیمنٹ کو دستور ہند کے اس تضاد کو دور کرنا چاہئے کہ ایک طرف دستور ہند بنیادی حقوق کے باب کی دفعہ ۲۵ میں ہر شہری کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دیتا ہے دوسری طرف ''ریاستی پالیسی کے رہنما اصول'' کے باب کی دفعہ ۴۴ میں یکساں سول کوڈ تشکیل دینے کی بات کہتا ہے جو مذہبی آزادی کے سراسر خلاف ہے۔

اتنی بات واضح ہے کہ یکساں سول کوڈ کی عمارت مسلم پرسنل لا اور دیگر مذہبی اکائیوں کے شخصی اور رواجی قوانین کے ملبہ ہی پر تیار ہوسکتی ہے، تمام اقلیتوں کے جذبات روند اور کچل کر جو یکساں سول کود تشکیل پائے گا وہ قومی یکجہتی میں معاون ہونے کے بجائے منافرت، بے اطمینانی، فرقہ وارانہ تصادم کی آگ پورے ملک میں بھڑکا دے گا، حکومت اور قانون ساز اداروں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی مسلمان کس قیمت پر مذہبی آزادی اور مسلم پرسنل لا سے دستبردار نہیں ہوسکتے، خواہ انہیں اس کے لئے کیسی صبر آزما جدوجہد کرنی پڑے اور کتنی عظیم قربانی دینی پڑے۔

قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کا طریقہ

مسلمانوں کے دل ودماغ میں قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کا صرف وہ مفہوم ہے اور وہی ان کے لئے قابل قبول ہے جسے تحریک ریشمی رومال کے بانی اور تحریک آزادی کے عظیم رہنما شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (۱۹۳۹ء) نے اپنے ایک خطبے میں بڑے واضح اور دوٹوک انداز میں بیان کردیا ہے۔

''میں ان دونوں قوموں (ہندو مسلم) کے اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائدین نے کی اور کررہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بڑی قدر ہے، ہاں یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہہ رہا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی اگر آپ پائیدار اور خوش گوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشیں کرلیجئے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح وآشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے، مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں، اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گذارش دونوں قوموں کے لیڈروں سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزرویشنوں کی تائید سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے، ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصّبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہئے، فرض کرو اگر ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیئے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لئے مہلک نہیں، البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہونچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں، مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔'' (نقش حیات، جلد۲، صفحہ ۲۶۰، ۲۶۱، علماء حق، جلد۱، ص ۱۸، ۱۷، ۲۱۶)

آج کل ملازمت، تجارت اور زندگی کے ہر میدان میں مسلمانوں کے ساتھ ناقابل برداشت امتیاز برتا جا رہا ہے ان کی معیشت تباہ کرنے کی منظّم کوشش کی جا رہی ہے اور دعوی یہ کیا جا رہا ہے کہ ایک قانون، ایک زبان، ایک تہذیب جاری کرنے سے قومی یکجہتی کو فروغ ہوگا، تمام باشندگانِ ملک میں جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی، اس خیالِ خام کو ہم ''خیالی پلاؤ'' کے علاوہ کس لفظ سے تعبیر کریں۔

حاصل کلام

اوپر ذکر کردہ تفصیلات سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کی صرف یہ حیثیت نہیں ہے کہ اس نے ایک نادار مسلم مطلقہ کو نکاح ثانی تک نان ونفقہ

دلوا دیا بلکہ اس فیصلہ نے عدالتوں کے راستے اسلام پر ناروا حملے کا راستہ کھول دیا، مسلم پرسنل لا کو سب سے کمزور قانون ثابت کیا، عدالتوں کو قرآن وسنت کی جدید تعبیر وتشریح کا اختیار دے دیا، مسلم پرسنل لا کے ملبہ پر یکساں سول کوڈ کی عمارت تعمیر کرنے کی پرزور وکالت کی، اس لئے اگر مسلمانانِ ہند اس فیصلہ پر تشویش واضطراب محسوس کریں تو بجا ہے۔

☆☆☆☆

﴿چند بنیادی باتیں﴾

(شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بارے میں شائع ہونے والے مضامین،
مراسلات اور بیانات کے تناظر میں)

چند بنیادی باتیں

نفقہ مطلقہ کے متعلق سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ اور اس کی تائید میں شائع ہونے والے مضامین، مراسلات اور بیانات کا جائزہ لینے سے پہلے چند بنیادی باتوں کو سمجھ لینا ضروری ہے، اس کے بغیر عوام اور متوسط دینی معلومات رکھنے والوں کے لئے اصل مسئلہ کو سمجھنا تقریباً ناممکن ہے پہلے ہم ان بنیادی باتوں کو مختصر نمبروار لکھتے ہیں، اس کے بعد اصل مسئلہ پر گفتگو آسان اور نتیجہ بخش ہوگی۔

خاتم النبین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم محض ایلچی نہیں

(۱) خاتم النبین ﷺ کی حیثیت محض ایلچی اور نامہ بر کی نہیں تھی یعنی ان کا صرف یہ مقام نہیں تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب انسانوں تک پہنچائی بس ان کا کام ختم ہوگیا، رسول خدا ﷺ کو صرف ایک ایلچی کی حیثیت دینا الحاد و بے دینی ہے، اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح الفاظ میں نبی اکرم ﷺ کی اس حیثیت کو واضح کیا ہے کہ قرآن کی تعبیر وتشریح (تعلیم کتاب) بھی نبی اکرم ﷺ کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

﴿هو الذين بعث فيهم رسولا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وإن كانوا من قبل لفي ضلال مبين﴾ [سورۂ جمعہ:۲]

''وہی تو ہے جس نے امی لوگوں میں انہی میں سے ایک پیمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور

حکمت کی باتیں سکھاتا ہے درآنحالیکہ یہ لوگ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔''

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کی چار ذمہ داریاں بیان کی گئیں ہیں (۱) تلاوت آیات یعنی قرآن کے الفاظ کی تعلیم، اس کی نشر واشاعت اور بعینہٖ قرآن کے الفاظ کو انسانوں تک پہنچانا (۲) تزکیۂ نفس، یعنی انسانوں کو بری عادات اور اعمال واخلاق سے پاک کر کے صحیح معنی میں انسان بنانا (۳) تعلیم کتاب، قرآنی آیات اور قرآنی احکام کی تعبیر وتشریح، اس کے اجمال کی تفصیل، قرآنی اصطلاحات کی وضاحت۔

(۴) تعلیم حکمت جمہور مفسرین نے حکمت سے سنت مراد لیا ہے یعنی نبی اکرم ﷺ کے اقوال وافعال وتقریرات کا وہ گراں قدر ذخیرہ جسے ہم حدیث کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں جو حدیثیں براہ راست قرآنی آیات کی تعبیر وتشریح سے تعلق رکھتی ہیں وہ تعلیم کتاب کے دائرے میں آجائیں گی ان کے علاوہ پورا ذخیرہ حدیث تعلیم حکمت کے تحت آئے گا۔

اسلامی قانون میں حدیث نبوی کا مقام

قرآن کی توضیح وتشریح کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے وحی الٰہی کی روشنی میں بے شمار ایسی ہدایات اور تعلیمات امت کے سامنے پیش کیں جن کا کہیں قرآن میں ذکر نہیں ہے، ایک مسلمان کے لئے جس طرح قرآنی احکام کی اتباع ضروری ہے اسی طرح زبانِ رسالت سے قرآنی احکام کے علاوہ جو بے شمار احکام وفرامین صادر ہوئے ہیں ان کی اتباع بھی مسلمان کے لئے ضروری ہے، اسی بنیاد پر ائمہ اسلام اور فقہاء ومحدثین نے حدیث کو قانون شریعت کا مستقل مأخذ وسرچشمہ قرار دیا ہے، لہٰذا احادیث نبویہ سے اگر کوئی حکم ثابت ہے تو اسے یہ کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا کہ چونکہ یہ حکم قرآن میں مذکور نہیں ہے اس لئے ہمارے لئے واجب الاتباع اور قابل عمل نہیں ہے قانون اسلامی کے سلسلے میں احادیث نبوی کی مذکورہ بالا حیثیت اجاگر کرنے کے لئے کہیں یہ فرمایا گیا:

﴿ما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا﴾[سورۂ حشر:۷]

''تو رسول جو کچھ تمہیں دیدیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے وہ تمہیں روک دیں، رک جایا کرو۔''

کہیں ان الفاظ میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا:

﴿من يطع الرسول فقد اطاع الله﴾[سورۂ نساء:۸۰]

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔''

﴿أطيعوا الله وأطيعوا الرسول﴾[سورۂ نساء:۵۹]

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔''

ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر﴾[سورۂ أحزاب:۲۱]

''رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے، یعنی اس کے لئے جو ڈرتا ہو اللہ اور روز آخرت سے۔''

﴿ما ينطق عن الهوى إن هو إلا وحي يوحى﴾[سورۂ نجم:۳-۴]

''اور نہ وہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں، ان کا کلام تو تمام تر وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔''

رسول خدا کو وحی الٰہی کے ذریعہ یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ نسلی طور پر مسلمان کہلانے والوں میں حدیث رسول کی حجیت اور اس کی شرعی حیثیت کا انکار کرنے والا گروہ بھی پیدا ہوگا اس لئے آپ نے امت مسلمہ کو بہت پہلے اس فتنہ سے آگاہ کردیا تھا اور منکرین حدیث کی ملمع سازیوں کا پردہ چاک کردیا تھا۔

عن العرباض بن سارية قال قام رسول الله ﷺ فقال أيحسب

أحدكم متكئاً على أريكته قد يظن أن الله لم يحرم شيئاً إلا ما في هذا القرآن، ألا وإني والله قد وعظت وأمرت ونهيت عن أشياء، إنها لمثل القرآن أو أكثر، وأن الله عز وجل لم يحل لكم أن تدخلوا بيوت أهل الكتاب إلا بإذن ولا ضرب نسائهم ولا أكل ثمارهم إذا أعطوكم الذي عليهم۔[أبوداؤد، الخراج، باب فی تعشیر أهل الذمة، حدیث:۳۰۵۲]

''عرباض بن ساریہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کھڑے ہوئے اور آپ نے فرمایا: کیا تم سے کوئی شخص مسہری پر ٹیک لگائے یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز حرام نہیں کی سوائے اس کے جو اس قرآن میں ہے، سن لو بیشک میں نے نصیحت کی اور حکم دیا اور کچھ چیزوں سے منع کیا جو قرآن (میں منع کی ہوئی چیزوں) کے مثل ہیں یا ان سے زیادہ ہیں، بیشک اللہ نے تمہارے لئے حلال نہیں کیا کہ اجازت کے بغیر اہل کتاب کے گھروں میں داخل ہو اور نہ ان کی عورتوں کو مارنا حلال کیا، نہ ان کے پھلوں کو کھانا حلال کیا جب کہ تم کو وہ چیز دیں جو ان پر لازم ہے۔''

خطیب بغدادی نے ''الكفاية في علم الرواية'' میں، ابن عبد البر نے ''جامع بیان العلم وفضلہ'' میں اور محدث بیہقی نے ''المدخل إلى دلائل النبوة'' میں مشہور صحابی رسول حضرت عمران بن حصینؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے حدیث کی ضرورت واہمیت اور قانون شریعت میں حدیث کے مقام پر اچھی روشنی پڑتی ہے اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار حضرت عمران بن حصینؓ نے اپنی مجلس میں شفاعت کے بارے میں ایک حدیث بیان کی، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا: آپ حضرات کچھ ایسی حدیثیں بیان فرماتے ہیں جن کی قرآن میں کوئی اصل نہیں ہے، ہمیں تو صرف قرآن کی تعلیم دیجئے۔

حضرت عمران بن حصینؓ نے اس شخص کو قریب بلا کر فرمایا: تم نے قرآن پڑھا ہے؟

اس نے جواب دیا: جی ہاں! عمران بن حصینؓ نے فرمایا: قرآن میں کہیں یہ بھی ہے کہ عشاء کی نماز چار رکعت، مغرب کی تین رکعت، فجر کی دو رکعت، ظہر اور عصر کی چار چار رکعت ہے؟ اس شخص نے جواب دیا: قرآن میں یہ باتیں نہیں ہیں، اس پر حضرت عمرانؓ نے فرمایا: پھر یہ چیزیں تم نے کہاں سے سیکھیں؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تم لوگوں نے یہ باتیں ہم سے (صحابہ سے) سیکھیں اور ہم نے رسول اکرم ﷺ سے۔

اچھا یہ بتاؤ کہ قرآن میں کہیں مذکور ہے کہ چالیس بکریاں ہوں تو ایک بکری زکوۃ میں نکالی جائے گی، اتنے اونٹوں میں اتنی زکوۃ واجب ہوگی، اتنے دراہم میں اتنی زکوۃ واجب ہوگی؟ اس شخص نے جواب دیا کہ یہ احکام بھی قرآن میں نہیں ہیں، حضرت عمرانؓ نے فرمایا: پھر تم نے یہ احکام کہاں سے سیکھے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تم نے ہم سے (صحابہ سے) یہ احکام سیکھے اور ہم نے رسول خدا ﷺ سے۔

اچھا یہ بتاؤ قرآن میں تم نے یہ آیت پڑھی ہے ﴿**ولیطوفوا بالبیت العتیق**﴾ کیا قرآن میں کہیں ہے کہ سات بار طواف کرو اور اس کے بعد مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھو؟

کیا تم نے خداوند تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا؟

﴿ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا﴾

یاد رکھو کہ ہم نے رسول خدا ﷺ سے بہت سی وہ چیزیں سیکھی ہیں جن کا تمہیں علم نہیں۔ (الکفایۃ فی علم الروایۃ، ص ۱۵، طبع المکتبۃ العلمیۃ، مدینہ منورہ، جامع بیان العلم وفضلہ، جلد ۲، ص ۳۶۷، طبع مؤسسۃ الریان، دار ابن حزم)۔

قرآن سمجھنے کے لئے عربی زبان کی معمولی واقفیت کافی نہیں

اس سلسلہ کی دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن سمجھنے کے لئے محض عربی زبان وادب کی معمولی واقفیت کافی نہیں، صرف لغت کی مدد سے اگر قرآن سمجھنے کی کوشش کی گئی تو اسلام کے بنیادی عقائد واحکام بھی خطرے میں پڑ جائیں گے، ان کا ثبوت بھی قرآن سے نہیں

مل پائے گا، مثلاً عربی لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعا کے آتے ہیں، قرآن میں جہاں جہاں لفظ صلوٰۃ آیا ہے اگر اس سے لغت کی بنیاد پر دعا مراد لی جائے تو اسلام نے نماز کا جو تصور دیا ہے وہ محتاج ثبوت ہو جائے گا، اسی طرح صوم (روزہ) زکوٰۃ، حج وغیرہ کے سلسلہ میں بھی ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے عربی زبان کے بہت سے الفاظ کو مخصوص معانی پہنا کر اصطلاح شرعی کے طور پر استعمال کیا ہے، لہٰذا قرآن کے اصطلاحی الفاظ جہاں بھی مذکور ہوں انہیں اصطلاحی معانی میں استعمال ہوں گے، خواہ لغت میں ان کے کتنے معانی آتے ہوں، نبی اکرم ﷺ کی اہم ذمہ داری قرآن کی تعبیر وتشریح کی بھی تھی، چنانچہ انہوں نے اپنے اقوال وافعال اور اپنے اخلاق وکردار سے قرآنی اصطلاحات کو مکمل طور پر واضح کر دیا، آپ ﷺ قرآن کا مجسم عملی نمونہ تھے، صحابہ کرام، تابعین اور محدثین کا ملت اسلامیہ بلکہ عالم انسانیت پر بڑا احسان ہے کہ ان حضرات نے رسول خدا ﷺ کے اقوال وافعال اور آپ کی زندگی کے ہر پہلو کو پوری جانفشانی اور امانت ودیانت کے ساتھ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیا تاکہ قرآن کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور اسلام کا قصر جمیل ہمیشہ کے لئے تخریب وانہدام سے محفوظ ہو جائے۔

تفسیر قرآن کا طریقہ

جب بھی قرآن کے کسی لفظ یا کسی آیت کا مسئلہ درپیش ہوگا تو سب سے پہلے حدیث کے محفوظ ومستند ذخیرے کی طرف رجوع کیا جائے گا، اگر ذخیرہ احادیث میں اس کی کوئی تفسیر مل جائے تو کسی اور طرف جانے کی ضرورت نہیں ورنہ پھر صحابہ کرام کے آثار وروایات کی طرف رجوع کرنا ہوگا کہ ان حضرات نے اس آیت کی کیا تشریح کی ہے، تفسیر قرآن کے میدان میں صحابہ کرام کے آثار کو زیادہ اہمیت اس لئے دی جاتی ہے کہ ان حضرات کے سامنے قرآن نازل ہوا، آدمی بہت کچھ متکلم کے انداز کلام، لب ولہجہ، آواز کے اتار چڑھاؤ سے سمجھ لیتا ہے، پھر ان لوگوں کو یہ سہولت حاصل تھی کہ جہاں کہیں قرآن کے کسی لفظ کا معنی

سمجھ میں نہیں آیا نبی اکرم ﷺ سے دریافت کرلیا، وہ لوگ عربی زبان وادب کے ادا شناس تھے، فصیح عربی ان کی مادری زبان تھی، غضب کا حافظہ، بلا کا ذہن انہیں قادر مطلق نے عطا کیا تھا، طبیعت میں سلامتی اور دل میں جذبہ واخلاص تھا، قرآن کی تعبیر وتشریح میں حضرات صحابہ بڑے محتاط تھے، ان کی احتیاط کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے ایک دفعہ قرآن کے ایک لفظ کا معنی دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"من مسند الصديق رضي الله عنه عن أبى مليكة قال:" سئل أبوبكر عن تفسير حرف من القرآن فقال: أي سماء تظلني وأي أرض تقلني وأين أذهب و كيف أصنع إذا قلت في حرف من كتاب الله بغير ما أراد تبارك وتعالىٰ۔" [**كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، جلد۲، ص ۳۲۷، طبع مؤسسة الرسالة، المدينة المنورة**]

"حضرت ابوبکر صدیقؓ سے قرآن کریم کے کسی لفظ کی تفسیر پوچھی گئی تو آپ نے جواب دیا کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کے مقصود ومراد کے خلاف میں تفسیر بیان کردوں تو میں کس آسمان کے سایہ میں سانس لوں گا، اور کس زمین کی دوش پر میں چلوں پھرونگا، اور کہاں کا راستہ لونگا اور میرا کام کیسے بنے گا۔"

مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر مفسرین لکھتے ہیں کہ آیات والفاظ قرآنی سے متعلق صحابہ کرام کی تفسیر وتاویل اکثر وبیشتر نبی اکرم ﷺ سے ماخوذ ہوتی ہے اور اگر بالفرض صحابی نے اپنی فہم وفراست سے کوئی تفسیر کی ہو تو بھی اسے غیر صحابی کی تفسیر پر ترجیح حاصل ہوگی، صحابہ کرام کے بعد تابعین، تبع تابعین اور اس کے بعد کے مفسرین جنہوں نے قرآن وسنت کی خدمت میں عمریں گذاردیں، دنیا کے مال ومتاع، جاہ ومنصب، آرائش وزیبائش سے کنارہ کش ہوکر قرآن کے ناپیدا کنار سمندر سے موتیاں نکالتے رہے اپنی مسلسل جدوجہد اور تصنیفی کاوشوں سے قرآنیات پر بے مثال کتب خانہ تیار کردیا، ان کی تفسیریں قابل اعتماد سمجھی جاتی ہیں۔

نزول قرآن پر تقریبا چودہ صدیاں گذرنے کے بعد اگر کوئی بڑے سے بڑا عالم

ومفسر بھی کسی قرآنی آیت کی ایسی تفسیر کرنے لگے جو صحابہ، تابعین، جمہور مفسرین ومجتہدین کی تفسیر کے خلاف ہو تو اسے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا خواہ وہ لغت کی کتابوں سے کچھ حوالے بھی تلاش کرلائے، جب موجودہ دور کے کسی بڑے سے بڑے مفسر ومحدث کو بھی یہ اختیار نہیں تو عارف محمد خاں، اصغر علی انجینئر (سابق چیف جسٹس) چندر چوڑ جیسے لوگوں کو یہ اختیار کیسے مل سکتا جو اسلامی شریعت، قرآن وسنت اور عربی زبان وادب کے مبادی سے بھی واقف نہیں ہیں، یہ حضرات آیت قرآنی ﴿**للمطلقات متاع بالمعروف حقا على المتقين**﴾ [سورۂ بقرہ:۲۴۱] میں متاع کا جو معنی مراد لے رہیں (یعنی موت یا نکاح ثانی تک مطلقہ کا نفقہ) اس کی تائید میں پورے ذخیرۂ تفسیر میں ایک دلیل بھی پیش نہیں کرسکتے کہ کسی صحابی یا مفسر یا فقیہ نے متاع کا یہ مفہوم لیا ہو، ان حضرات کی اس من مانی تفسیر بلکہ تحریف کو صحیح قرار دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس سے پہلے چودہ صدیوں کے تمام مسلمان، صحابہ، مفسرین، مجتہدین، قضاۃ اس آیت کے صحیح مفہوم سے ناآشنا رہے اور اب پہلی بار چندر چوڑ، عارف محمد خاں، اصغر علی انجینئر جیسے لوگوں پر صحیح معنی کا انکشاف ہو رہا ہے، اس طرح تو پورے دین سے اعتماد اٹھ جائے گا، اور دین کھیل بن کر رہ جائے گا، جس کا جب جی چاہے قرآن کی من مانی تفسیر کرکے جمہور امت کی قرآن فہمی کو چیلنج کردے گا۔

فتنۂ انکار حدیث کی پرچھائیں

زیر بحث موضوع پر لکھتے ہوئے ہم نے حدیث کی شرعی حیثیت پر ابتداء ہی میں اس لئے روشنی ڈالی کہ برصغیر ہندو پاک میں انکار حدیث کا فتنہ (جو پچاس ساٹھ سال قبل بڑے شباب پر تھا) اگرچہ بڑی حد تک دب چکا ہے لیکن بہت سے متجددین اور مغرب زدہ اہل قلم کے دل ودماغ پر اب بھی اس فتنہ کے گہرے اثرات ہیں، بدقسمتی سے سپریم کورٹ کے فیصلہ کی تائید میں جو چند حضرات ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں ان کی تحریروں اور بیانات میں انکار حدیث کا نظریہ کارفرما نظر آتا ہے، یہ لوگ پوری صفائی کے ساتھ حدیث کی شرعی حیثیت

کے انکار کی جرأت تو نہیں کر پا رہے ہیں لیکن رسول اکرم ﷺ کی جو احادیث ان کی قرآن کی من مانی تاویل وتحریف کی راہ میں رکاوٹ ہے انہیں خاطر میں نہیں لاتے، ہم یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

اصغر علی انجینئر نے ہفتہ وار بلٹز میں ایک سلسلہ وار مضامین شروع کر رکھا ہے، جس کا عنوان تو ہے ''قرآن میں عورت کا درجہ'' لیکن اس کا اصل مقصد سپریم کورٹ کے فیصلہ کی تائید اور فقہاء، مجتہدین، علماء پر لعن طعن ہے، انہوں نے اس مضمون کی چھٹی قسط (بلٹز ۲۸ ستمبر ۱۹۸۵ء صفحہ ۵، کالم ۱) میں لکھا ہے:

''قرآن میں عورتوں سے متعلق اکثر احکام بہت صریح اور واضح ہیں، پھر بھی فقہاء اپنے تعصّبات کے زیر اثر ایسی حدیثوں سے کام لے کر ان کی تفسیریں اور تاویلیں کرتے ہیں جو قرآنی اقدار واحکام سے ٹکراتی ہیں، طلاق ہی کا مسئلہ لے لیجئے، قرآن مجید میں ایک مجلس میں تین طلاق کا طریقہ کہیں نہیں بتایا گیا ہے، پھر بھی کچھ حدیثوں کا سہارا لے کر یہ طریقہ عام طور پر رائج ہو گیا اور آج عورتوں کے لئے یہ زبردست مسئلہ بن گیا۔''

ذرا خط کشیدہ الفاظ کو بار بار پڑھئے اور مضمون نگار کی دیدہ دلیری اور ملحدانہ ذہنیت کا اندازہ کیجئے، کیا اس عبارت کا صاف مطلب یہ نہیں ہے کہ مضمون نگار کے نزدیک احادیث نبویہ علیہ الصلاۃ والسلام کا ایک حصہ ایسا ہے جو قرآنی احکام واقدار سے ٹکراتا ہے، سوچئے بات کہاں تک پہنچتی ہے، نبی اکرم ﷺ جنہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تعلیم وتشریح کے لئے بھیجا، ان کے قول وعمل، سیرت واخلاق کو امت مسلمہ کے لئے اسوہ اور نمونہ قرار دیا، ان کے بارے میں فرمایا:

﴿ما ينطق عن الهوى إن هو إلا وحي يوحى﴾ [سورۂ نجم: ۳-۴]

''اور نہ وہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں، ان کا کلام تو تمام تر وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔''

ان پر یہ بہتان لگایا جا رہا ہے کہ نعوذ باللہ وہ قرآن کی ایسی تعبیر وتشریح کر گئے اور ایسے احکام دے گئے جو قرآنی اقدار واحکام سے ٹکراتے ہیں، گویا نعوذ باللہ اللہ کے رسول یا تو قرآنی اقدار واحکام سے واقف نہیں تھے یا انہوں نے دیدہ ودانستہ قرآن کی غلط تعبیر وتشریح کی، اور بیسویں صدی کا ایک بہ قلم خود ''مفکر ودانشور'' جو عربی زبان کے مبادی سے بھی ناواقف ہے نبی سے زیادہ قرآنی اقدار واحکام سے واقف ہے اور وہ احادیث نبویہ کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لینے بیٹھا ہے کہ رسول خدا کی کون کون تعبیر وتشریح قرآنی اقدار واحکام سے متصادم ہونے کی وجہ سے ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے لائق ہیں اور کون سی احادیث قرآنی اقدار واحکام سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے قابل قبول ہیں۔

ہر فن میں اس کے ماہرین ہی کی رائے معتبر ہے

(۳) دنیا کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ ہر فن اور ہر موضوع پر اسی کے ماہرین کے آراء وخیالات کی قدر وقیمت ہوتی ہے، کوئی بڑے سے بڑا سائنس داں علاج معالجہ اور سرجری کے موضوع پر کسی ڈاکٹر (طبیب) سے بحث کرنے کی جرأت نہیں کرتا، اگر وہ سرجری کے موضوع پر (جس کے مبادیات سے ناواقف ہے) کسی سرجن کی تحقیقات کے خلاف رائے ظاہر کرے اور اس پر اصرار کرے تو کوئی اس کی رائے کو اہمیت نہیں دے گا، بلکہ لوگ اس کی بحث واصرار کا مضحکہ اڑائیں گے، اسی طرح سائنس کے کسی مسئلہ پر کوئی کسان تمام سائنس دانوں کے خلاف رائے پیش کرے تو لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے، غرضیکہ دنیا کا سارا نظام اسی پر چل رہا ہے کہ ہر علم وفن، صنعت وحرفت کے بارے میں اسی کے ماہرین پر اعتماد کیا جاتا ہے، اگر ہر شخص ہر علم وفن اور زندگی کے ہر شعبے میں دخل دینے لگے اور اپنی رائے پر اصرار کرنے لگے تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے اور ہر طرف انارکی پھیل جائے۔

جب یہی بات دینی علوم وفنون کے بارے میں کہی جاتی ہے کہ قرآن وحدیث کی تعبیر وتشریح اور قانون اسلامی کے مسائل پر رائے دینے کا حق صرف علوم دینیہ کے ماہرین کو ہے

جنہوں نے مستند علماء ومشائخ سے قرآن وسنت کا علم حاصل کیا ہے اور عربی زبان وادب، قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کو پڑھنے پڑھانے اور ان پر غور وخوض کرنے میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ لگایا ہے تو بہت سے حضرات چڑھ جاتے ہیں اور جذبات سے بے قابو ہوکر کہتے ہیں کہ ''علماء، دین کے ٹھیکیدار بن گئے ہیں اور آزادئ رائے وخیال پر ناجائز پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں۔''

ان مغرب زدہ ''دانشوروں'' اور سیاست دانوں سے عرض ہے کہ ذرا جذبات کو قابو میں رکھ کر حقیقت پسندی سے اس مسئلہ پر غور کریں، تمام دنیاوی علوم وفنون کے ماہرین اور متخصصین کی قدر وقیمت آپ حضرات تسلیم کرتے ہیں، سائنس، طب، فزکس، انجینئرنگ ہر علم وصنعت کے بارے میں اس کے ماہرین کی تحقیق حجت مانتے ہیں تو علوم دینیہ (قرآن وحدیث، فقہ اسلامی) کے سلسلہ میں اس قاعدہ کو کس عقل ومنطق سے رد کردیتے ہیں؟ آخر یہ دوہرا پیمانہ کس لئے ہے؟ انصاف سے فیصلہ کیجئے کہ کیا نفقۂ مطلقہ سے متعلق عارف محمد خاں، اصغر علی انجینئر وغیرہ کی رائے وخیال کی وہی حیثیت نہیں ہے جیسے کوئی کسان سائنس کے کسی باریک مسئلہ پر تمام سائنس دانوں کے خلاف اپنی رائے ظاہر کرے۔

قرآن کی تعبیر وتفسیر اور اس سے احکام مستنبط کرنے کے لئے علوم دینیہ پر گہری محققانہ نظر اور عربی زبان وادب پر عبور از حد ضروری ہے، چند چوڑ، عارف محمد خاں، اصغر علی انجینئر کی علوم دینیہ پر گہری نظر کیا ہوتی انہیں تو عربی زبان کی معمولی شد بد بھی نہیں ہے پھر انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ محض اردو انگریزی ترجموں کے سہارے اسلامی احکام میں اجتہاد کریں اور قرآن کی ایسی تعبیر وتشریح کریں جو تمام صحابہ، تابعین، محدثین، فقہاء کی چودہ سو سالہ تعبیر وتشریح کے خلاف ہو۔

قرآن کے آسان ہونے کا مطلب

یہ لوگ قرآن پاک کی ایک آیت سے سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہتے اور یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ قرآن تو بڑا آسان ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو قرآن فہمی کی دعوت

دیدی ہے لیکن نام نہاد مولویوں نے قرآن فہمی پر ناروا پابندیاں عائد کردی ہیں تاکہ یہی لوگ دین کے ٹھیکیدار بنے رہیں وہ آیت درج ذیل ہے:

﴿ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر﴾ [سورۂ قمر:۱۷]

''اور ہم نے آسان کردیا ہے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے، سو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔''

مفتی اعظم ہند وپاک حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ذکر کے معنی یاد کرنے اور حفظ کرنے کے بھی آتے ہیں اور کسی کلام سے نصیحت وعبرت حاصل کرنے کے بھی، یہ دونوں معنی یہاں مراد ہوسکتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم کو حفظ کرنے کے لئے آسان کردیا، یہ بات اس سے پہلے کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی کہ پوری کتاب تورات یا انجیل یا زبور لوگوں کو برزبان یاد ہو، اور یہ حق تعالیٰ ہی کی تیسیر اور آسانی کا اثر ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچے پورے قرآن کا ایسا حفظ کرلیتے ہیں کہ ایک زیر وزبر کا فرق نہیں آتا، چودہ سو برس سے ہر زمانہ، ہر طبقے ہر خطے میں ہزاروں لاکھوں حافظوں کے سینوں میں یہ اللہ کی کتاب محفوظ ہے۔

اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ قرآن کریم نے اپنے مضامین عبرت ونصیحت کو ایسا آسان کرکے بیان کیا ہے کہ جس طرح بڑے سے بڑا عالم وماہر، فلسفی وحکیم اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح ہر عامی جاہل جس کو علوم سے کوئی مناسبت نہ ہو وہ بھی عبرت ونصیحت کے مضامینِ قرآنی کو سمجھ کر اس سے متأثر ہوتا ہے۔

اس آیت میں ''یسرنا'' کے ساتھ ''للذکر'' کی قید لگا کر یہ بھی بتلادیا گیا ہے کہ قرآن کو حفظ کرنے اور اس کے مضامین سے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کی حد تک اس کو آسان کردیا گیا ہے، جس سے ہر عالم وجاہل، چھوٹا اور بڑا یکساں فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم سے مسائل واحکام کا استنباط بھی ایسا ہی آسان ہو، وہ اپنی جگہ ایک مستقل اور مشکل فن ہے جس میں عمریں صرف کرنے والے علماء راسخین کو ہی حصہ ملتا

ہے ہر ایک کا وہ میدان نہیں۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو قرآن کریم کے اس جملے کا سہارا لے کر قرآن کی مکمل تعلیم اس کے اصول وقواعد سے حاصل کئے بغیر مجتہد بننا اور اپنی رائے سے احکام ومسائل کا استخراج کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کھلی گمراہی کا راستہ ہے۔'' (معارف القرآن، جلد ۸، ص ۲۳۰، مطبوعہ بیت الحکمۃ، دیوبند، یوپی)

مفتی صاحبؒ کی مندرجہ بالا تفسیر وتشریح سے ''متجددین'' اور مغرب زدہ ''دانشوروں'' کے مغالطہ اور ابلہ فریبی کی قلعی اچھی طرح کھل گئی۔

☆☆☆☆

پس چہ باید کرد
اپنا جائزہ واحتساب اور راہِ عمل

نفقہ مطلقہ کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ (شاہ بانو کیس کا فیصلہ) نے مسلمانوں کو بیدار اور ہوشیار ہونے کا ایک موقع فراہم کیا ہے، بسا اوقات بعض ناگوار واقعات کسی قوم کو بیدار اور متحد کرنے میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں، سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے، لیکن دراصل یہ حادثہ مسلم قوم کے لئے عبرت کا تازیانہ اور لمحۂ فکریہ ہے، جذباتیت سے الگ ہوکر جب ہم پوری صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے زندگی کے اکثر میدانوں میں قرآن وسنت کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا، جن اسلامی قوانین پر عمل کرنے کے لئے کچہری اور عدالت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے انہیں بھی اپنی عملی زندگی سے خارج کردیا ہے، اسی کا وبال ہے کہ دوسروں کو ہمارے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنے اور اسلام پر ناروا حملہ کرنے کی جرأت ہورہی ہے، جو قوم اپنے مذہب اور مذہبی قوانین کا خود احترام نہیں کرتی، اسے دوسرے سے توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ ہمارے مذہب کا احترام اور مذہبی قوانین کی پاسداری کریں گے۔

اس پرفتن دور میں ہندوستانی مسلمان اسلامی عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات اور قانون شریعت سے دور ہوتے جارہے ہیں، مسلم آبادی کا بڑا حصہ خصوصاً نئی نسل اسلام کے بنیادی عقائد اور روز مرہ کے عملی احکام سے بھی ناواقف ہے، مسلمانوں کا انفرادی

واجتماعی کردار اشاعت اسلام کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے، دینی اخوت کا رشتہ بکھر کر رہ گیا ہے، مسلمانوں کی صفوں میں انتشار ہے مسلم جماعتوں، تنظیموں اور فرقوں کی باہمی آویزش نقطۂ عروج پر ہے، بقول شاعر مشرق علامہ اقبال

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیح شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

غرضیکہ مسلمانان ہند میں زوال پذیر ملت کی تمام صفات پیدا ہوچکی ہیں اور ترقی کررہی ہیں، سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے ایک چیلنج اور ان کے مذہب وتہذیب کے لئے خطرہ کا الارم ہے، ہندوستان کے مسلمان اگر اب بھی لمبی نیند سوتے رہے تو ایک مستقل مذہب وتہذیب رکھنے والی قوم کی حیثیت سے ان کا وجود ختم ہوجائے گا، اس لئے آیئے خلوص اور حقیقت پسندی سے غور کریں کہ ہم مسلمانانِ ہند موجودہ حالات میں اپنے مذہب وشریعت کے تحفظ بلکہ اس کی نشر واشاعت اور فروغ دینے کا عظیم فریضہ کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔

اپنی زندگی اور سماج میں احکامِ شریعت کا اجراء

اس مقصد کے لئے سب سے بنیادی اور اہم کام یہ ہے کہ ہم میں کا ہر شخص اپنی زندگی میں اسلامی تعلیمات جاری وساری کرنے کی کوشش کرے، ہم سب مسلمانوں میں اسلامی سماج برپا کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کریں، ایسا معاشرہ وجود میں لائیں جس میں اسلام پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آئے اور وہ پاکیزہ، پرامن اعتماد ومحبت والا معاشرہ برادران وطن کا دامن دل اسلام کی صداقت وحقانیت کی طرف کھینچے، ہمارے اخلاق وکردار، معاملات ومعاشرت سے اسلام کی عظمت وافادیت کا لازوال نقش قائم ہو۔

آج اسلام کا عائلی نظام (مسلم پرسنل لا) تنقید واستہزاء کا نشانہ بنا ہوا ہے، اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہم نے خود اسلام کے عائلی نظام، معاشرتی قوانین کی توہین کی ہے، اس

پر عمل کرنا چھوڑ رکھا ہے، ہمارے اکثر بھائی اور بہن معاشرتی قوانین (نکاح، طلاق، حسن معاشرت وغیرہ) سے بالکل ناواقف ہیں، اس لئے اسلام دشمن عناصر کو اسلامی عائلی قوانین پر حملہ کرنے اور اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملا ہے، اگر سارے مسلمان ان قوانین کی پابندی کرتے تو ہمارا پرسکون، قابلِ رشک مسلم سماج خود ان الزامات اور پروپیگنڈوں کا اطمینان بخش جواب ہوتا۔

نکاح کے بارے میں اسلامی ہدایات

آیئے ہم انصاف پسندی سے جائزہ لیں کہ مسلمان نکاح، طلاق کے معاملات میں کس حد تک اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں، اسلامی تعلیمات کے رو سے لڑکے یا لڑکی کا رشتہ تلاش کرتے وقت بنیادی طور پر دین واخلاق کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ جس لڑکی یا لڑکے سے ہم رشتہ لگانے جارہے ہیں اس کی دینی واخلاقی حالت اطمینان بخش ہے کہ نہیں؟ اس کے بعد نسب وخاندان وغیرہ کا لحاظ رکھنا چاہئے، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

تنكح المرأة لأربع لما لها ولحسبها ولجمالها ولدينها فاظفر بذات الدين تربت يداك۔ [مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب نکاح ذات الدین، حدیث: ۱۴۶۶، بخاری، کتاب النکاح، باب الأكفاء في الدين، حدیث: ۵۰۹۰]

لڑکیوں کے سرپرستوں کو مخاطب کرتے ہوئے خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

إذا خطب إليكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه، إلا تفعلوه تكن في الأرض فتنة وفساد عريض۔ [ترمذی، کتاب النکاح، باب ماجاء إذا جاءكم من ترضون دينه فزوجوه، حدیث: ۱۰۸۴]

''جب تمہاری خواتین سے نکاح کے لئے ایسا شخص پیغام دے جس کے دین اور اخلاق سے تم مطمئن ہو تو (بلا تاخیر) اس سے نکاح کردیا کرو ورنہ روئے زمین میں فتنہ اور زبردست فساد برپا ہوگا۔''

لیکن آج کل رشتۂ نکاح طے کرتے وقت لڑکی اور لڑکے کے سرپرست عموماً دین واخلاق کو بالکل مدنظر نہیں رکھتے، لڑکی والا صرف یہ دیکھتا ہے کہ لڑکے کے پاس کتنی زمین وجائداد ہے کتنی تنخواہ اور ''بالائی آمدنی'' ہے کتنا بینک بیلنس ہے، لڑکے والے صرف یہ دیکھتے ہیں کہ لڑکی والا تلک اور جہیز میں کتنا نقد روپیہ اور ساز وسامان دے سکتا ہے، اسلامی نکاح بڑا سادہ اور سستا ہوتا ہے، حدیث پاک میں ہے کہ ''سب سے زیادہ بابرکت نکاح وہ ہوتا ہے جس میں کم سے کم بار پڑے معمولی اخراجات آئیں'' اسلامی نکاح میں نہ ''جہیز'' کا بارگراں ہے نہ تلک کی آفات نہ بارات کا ہوشربا تصور، نہ ہی باہمی لین دین کی وہ لمبی چوڑی رسمیں ہیں، جن میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑ دینے پر انسان موجودہ سماج میں منھ دکھانے کے لائق نہیں رہتا۔

حسن معاشرت کا حکم

نکاح کے بعد حسن معاشرت سے متعلق شریعت نے میاں بیوی کو جو تعلیمات دیں انہیں زندگی کا لازمی جزو بنانے کی بجائے پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت جلد میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ ہوجاتے ہیں اور گھر جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے، میاں بیوی کی ہر وقت کی لڑائی، بدخلقی اور تنگ مزاجی کے مضر اثرات بڑی بھیانک شکل میں بال بچوں پر ظاہر ہوتے ہیں اور پوری نسل تباہ ہوکر رہ جاتی ہے، بسا اوقات میاں بیوی میں حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ دونوں کے والدین اور خاندانوں کی لڑائی ایک دوسرے سے دوری کا سبب بن جاتی ہے، اور بلاوجہ وہ دونوں ایک دوسرے سے جدائی پر مجبور ہوتے ہیں، اگر حسن معاشرت کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو میاں بیوی کی گھریلو زندگی قابل صد رشک بن جائے اور طلاق وتفریق کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

رشتۂ نکاح ختم کرنے کے بارے میں ہدایات

مزاجوں کے اختلاف اور خاندانی روایات وعادات میں عدم یکسانیت کی بنا پر اگر میاں بیوی میں نبھاؤ نہ ہو پا رہا ہو اختلاف ختم کرنے کی تمام ممکنہ کوششیں ناکام ہوچکی ہوں تو

شریعت نے طلاق وخلع کا دروازہ کھول رکھا ہے، اسلام کی نگاہ میں طلاق ازلی دشمنی اور دائمی عداوت کا نام نہیں، بلکہ میاں بیوی میں نبھاؤ نہ ہونے کی صورت میں رشتۂ نکاح کو منقطع کرنے کی ایک مناسب اور باعزت صورت ہے، طلاق کے بعد بھی میاں بیوی کے درمیان دینی اخوت کا رشتہ قائم رہتا ہے، اور قرآن وسنت کی تعلیم ہے کہ ایک دوسرے کے درپے آزار ہونے کے بجائے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور بلند اخلاقی کا مظاہرہ کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿**وإن أردتم استبدال زوج مكان زوج و آتيتم إحداهن قنطاراً فلا تأخذوا منه شيئاً أتأخذونه بهتاناً و اثماً عظيماً**﴾[نساء:۲۰]

''اور اگر بدلنا چاہو ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو اور تم اسے بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، کیا تم اسے لینا چاہتے ہو بہتان باندھ کر اور کھلا گناہ کرکے۔''

طلاق کا طریقہ

شریعت اسلامی نے طلاق کا جو طریقہ سکھایا ہے اس پر عمل کرنے سے مسلم معاشرہ کے بہت سے پیچیدہ مسائل خود حل ہوسکتے ہیں، اسلام نے تعلیم دی ہے کہ اگر شوہر کے سامنے طلاق کے سوا کوئی اور شکل باقی نہ رہے تو بھی وہ اس سلسلہ میں جذباتیت اور عجلت پسندی سے کام نہ لے بلکہ حیض کے ایام گذرنے کے بعد زمانۂ طہر میں صرف ایک طلاق دے، ایک ہی طہر میں یا ایک ہی مجلس میں کئی طلاقیں نہ دے ڈالے، تاکہ اگر طلاق دینے کے بعد پشیمانی ہو تو طلاق سے رجوع کرنے کا اختیار باقی رہے، عدت کے ایام میں اسے طلاق سے رجوع کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے اس کے بعد اگر تین طلاقیں پوری کرنا چاہتا ہے تو وہ دوسرے طہر میں دوسری طلاق اور تیسرے طہر میں تیسری طلاق دے لیکن مسلمان شوہر ان تعلیمات پر

عمل نہیں کرتے بلکہ جذبات غیض وغضب سے مغلوب ہوکر یا ناواقفیت کی بنا پر بیک وقت تین طلاق دے ڈالتے ہیں اور پھر پریشان وپشیمان ہوتے ہیں۔

احکام اسلامی سے روگردانی پریشانیوں کا اصل سبب

مذکورہ بالا تفصیلات کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ ہم خود اسلامی قوانین کا احترام نہیں کرتے، اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوتے، اسی کے نتیجہ میں ہماری زندگی مشکلات اور پریشانیوں کا مجموعہ ہے، نکاح وطلاق کے سلسلہ کی اسلامی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو اس کی نوبت شاذ ونادر ہی آئے کہ مسلم خواتین کے مقدمات زیریں عدالت یا ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تک پہونچیں، ہم مسلمانوں کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ اسلامی قوانین اور قرآن وسنت کی تعلیمات کو اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں نافذ کریں، دینی اخوت کے رشتہ کو مضبوط کریں، دین کے راستہ میں ہر چھوٹی بڑی قربانی کے لئے تیار ہوجائیں اگر ہم دین کی ان تعلیمات اور قوانین پر عمل پیرا ہونے کی بھرپور مخلصانہ جدوجہد کریں گے جن پر عمل کرنے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے تو اللہ جل شانہٗ پورے اسلام پر عمل کی راہیں ہموار فرمادیں گے۔

مسلمانوں کی دوذمہ داریاں

اسلامی عائلی قوانین کا وہ حصہ جس کے لئے عدالت اور قاضی کی ضرورت پڑتی ہے، انہیں نافذ کرنے کے لئے من حیث القوم مسلمانوں پر دوذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

ہر ضلع میں مسلمان قاضی کا تقرر

(۱) سارے مسلمان متحد ہوکر حکومت سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ کم ازکم ہر ضلع میں ایک ایسا مسلم قاضی مقرر کیا جائے جو قرآن وسنت اور فقہ اسلامی پر براہِ راست نظر رکھتا ہو، وہ مسلمانوں کے باہمی مسائل میں اسلامی قوانین کے رو سے فیصلہ کرے، اور حکومت اس کے فیصلے کو نافذ کرائے، ظاہر بات ہے کہ یہ مطالبہ منوانا آسان تو نہیں ہے لیکن مذہبی نقطۂ نظر

سے یہ بہت ضروری ہے، کیونکہ قرآن وسنت اور ائمہ اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کے عائلی معاملات میں کسی غیر مسلم حاکم کا فیصلہ شرعاً نافذ نہیں ہوتا خواہ وہ اسلامی قوانین ہی کے مطابق فیصلہ کرے۔

اگر ہندوستان کے مسلمان اس مطالبہ پر متفق ہوجائیں اور حکومت کو یہ بات محسوس ہوجائے کہ یہ ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے اور مسلمان اسے منوانے کے لئے ہر قسم کی قربانی اور جدوجہد کے لئے آمادہ ہیں تو حکومت ہند اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی۔

اگر کسی قوم میں اتحاد، جذبۂ قربانی اور سیاسی سوجھ بوجھ نہیں تو دستور کی کوئی بھی دفعہ اس کے حقوق کی حفاظت نہیں کرسکتی، دستور میں لکھے ہوئے حقوق کی حیثیت کاغذ پر لکھے ہوئے چند حروف کے سوا کچھ نہیں، زندہ قومیں اپنے وہ جائز حقوق بھی حاصل کرلیتی ہیں جو کسی وجہ سے دستور میں داخل نہیں ہوسکے، مسلمانوں کو اس سلسلہ میں مایوسی کا شکار نہ ہونا چاہئے، ہندوستان کے جمہوری نظام حکومت میں مطالبہ منوانے کے لئے جو طریقے مؤثر ہوتے ہیں انہیں پوری ہوشیاری اور سیاسی بصیرت کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے اس سلسلہ میں مسلسل جدوجہد اور فکر وعمل کی ضرورت ہے، اگر ملک کی آزادی کے لئے سینکڑوں سال جدوجہد کی جاسکتی ہے تو مذہب کے تحفظ کے لئے کیوں نہیں کی جاسکتی، اس سلسلہ میں مسلمانوں کو قطعاً کسی ہچکچاہٹ اور احساس کمتری میں مبتلا نہ ہونا چاہئے یہ مطالبہ نہ فرقہ پرستی ہے نہ ملک دشمنی، نظام قضا کے بغیر مسلمانوں کے مذہبی اور عائلی مسائل کا حل ممکن نہیں ہے اور مسلمان غیر اسلامی زندگی گذارنے پر مجبور ہوتے ہیں، ادھر چند برسوں سے عدالتوں کی طرف سے مسلم پرسنل لا سے ناواقفیت اور قرآن وسنت کی من مانی تعبیر وتشریح کے جو مسلسل واقعات پیش آرہے ہیں ان کی وجہ سے نظام قضاء کی ضرورت اور زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔

ہندوستان میں نظام قضاء

ہندوستان میں اسلامی عدالتیں انگریزوں کے تسلط کے بعد بھی قائم رہیں،

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجہ میں انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائی تیز کردی کیونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جنگ آزادی کی قیادت کی، اسی انتقامی کارروائی کا ایک اہم حصہ شرعی عدالتوں کو ختم کرنا تھا، ۱۸۶۴ء میں اسلامی عدالتیں ختم کردی گئیں، اس اقدام پر مشہور انگریز مؤرخ ڈاکٹر ہنٹر اپنی کتاب ''ہندوستانی مسلمان'' میں تبصرہ کرتے ہیں:

''ہم نے ۱۸۶۴ء میں ایک زبردست قدم اٹھایا، اور قاضیوں کا قانون منسوخ کرکے انہیں علیحدہ کردیا اور میری دانست میں یہ دانشمندی کے خلاف کیا، قاضیوں کی برطرفی سے نہ صرف یہ کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں سے خارج ہوگئے بلکہ ایسے عہدہ سے محروم ہوگئے جو ان کے خانگی اور مذہبی قانون کو نافذ کرتا تھا، ملک کا چارج لینے پر جو ہمارا سب سے پہلا قانون بنایا گیا اس نے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا اور قاضی کے عہدہ کو مستقل کردیا..... درحقیقت مسلمانوں کے خانگی اور مذہبی قانون میں قاضی کا عہدہ اس قدر ضروری ہے کہ اس بارے میں مولویوں کے فتاوی یہ تھے کہ جب تک ملک ہندوستان میں قاضی رکھے جائیں گے وہ دارالاسلام رہے گا اور اس کی برخواستگی پر دارالحرب ہوجائے گا، ۱۸۶۲ء میں ایک صوبہ کے گورنر نے سرکاری طور پر قاضیوں کے تقررات پر اعتراض کیا، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ اس قسم کے تقررات سے گورنمنٹ ان کے تقدس کا اعتراف کرتی ہے، اس لئے قاضیون کا تقرر خود مسلمانوں کی طرف سے ہوا کرے، مگر کچھ بحث ومباحثہ کے بعد، باوجود بمبئی والوں کے سخت احتجاج کے اس مضمون کے متعلق جس قدر پچھلا قانون تھا وہ منسوخ کردیا گیا، اور گورنمنٹ نے قاضیوں کا مقرر کرنا بند کردیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زنا، اور عورتوں کے اغوا اور انہیں بھگالے جانے کے مقدمات کی تعداد بہت بڑھ گئی، ۱۸۶۲ء کے

۵۶۱ مقدمات کے مقابلہ میں یہ تعداد ۱۸۶۶ء میں ۱۸۶۶ ہوگئی جو سہ گونہ سے زیادہ تھی..... اگر قاضی نہ ہو تو مسلمان کی زندگی کا اور اس کے مذہب کا قائم رہنا دشوار ہوجاتا ہے، نہ صرف یہ کہ بعض مذہبی رسوم کی ادائیگی میں قاضی کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی میں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے مذہبی مسائل اور قانونی امور پیش آتے رہتے ہیں جن کو قاضی ہی مناسب طریقہ پر حل کرسکتا ہے۔'' (مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۱۵۷-۱۵۸)

اس اقتباس سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ حقیقت پسند انگریزوں کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ نظام قضاء مسلمانوں کی بنیادی ضرورت ہیں، ان کے بغیر مسلمان اپنے مذہب پر مکمل طور پر عمل نہیں کرسکتے، علماء ومشائخ اور مسلم عوام نے جنگ آزادی میں اسی لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کہ ان کی نظر میں انگریز حکومت مذہب اسلام کے خلاف گہری سازش کرکے رفتہ رفتہ اسلامی قوانین کو زندگی کے تمام شعبوں سے بے دخل کررہی تھی اور اسلام کو صرف نماز روزہ میں محدود کردینا چاہتی تھی، اس تأثر واحساس نے پوری مسلم قوم کو انگریزوں کی باجبروت حکومت کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا اور انہیں ہر طرح کی جانی مالی قربانی کے لئے تیار کردیا۔

مسلمانوں کی قربانیوں کا بڑا محرک

شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا جو فتوی صادر فرمایا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے ہندوستان کے مقتدر علماء اور مستند مفتیان کرام نے جو فتوی صادر کیا ان سب میں یہ چیز دیکھی جاسکتی ہے، اس کے بعد تحریک ریشمی رومال اور تحریک خلافت میں بھی مسلمانوں کا یہی احساس کارفرما نظر آتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جہاد آزادی میں مسلمان اسی لئے ہر طرح کی قربانیاں پیش

کررہے تھے کہ انگریزوں کی ظالم حکومت سے نجات ملنے کے بعد ملک کی اقتصادیات سدھرنے کے ساتھ ساتھ ہم اپنے مذہب اوراس کے قوانین پر پوری آزادی کے ساتھ عمل کرسکیں گے، منسوخ شدہ اسلامی قوانین آزاد ہندوستان کے زیر سایہ از سرنو بحال کردئے جائیں گے، اور مذہبی امور وقوانین میں مداخلت کا سلسلہ ختم ہوجائے گا۔

آزادی کے بعد

بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے کے ساتھ ہی ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایسے لرزہ خیز، ہولناک حالات پیدا ہوگئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ہی خطرہ میں نظر آنے لگا، اس لئے اس وقت کے مسلم قائدین کو اپنی ساری توجہ اس طرف مرکوز کرنی پڑی کہ مسلمانان ہند کے اکھڑے قدم دوبارہ جم جائیں، ان کا خوف وہراس دور ہوجائے، اور وہ ملک میں اپنے کو مامون سمجھنے لگیں، آزادی کے بعد سے مسلسل ایسے مسائل پیدا ہوتے رہے یا پیدا کئے جاتے رہے جو ہندوستانی مسلمانوں کے وجود کے لئے سنگین خطرہ تھے، مسلم قیادت اور مسلم عوام کا پورا وقت انہیں مسائل ومصائب کا مقابلہ کرنے میں گذر گیا اور گذر رہا ہے، انہیں اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ ان خاکوں میں رنگ بھریں اور ان مقاصد کو پورا کرنے کی جدوجہد کریں جن کے لئے مسلمانوں نے اپنا سب کچھ قربان کرکے جنگ آزادی کا محاذ سنبھالا۔

ہندوستانی مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ وہ قصر اسلامی کے ان حصوں کو دوبارہ تعمیر کرنے کی کوشش کریں جنہیں انگریزوں نے طاقت وقوت کے نشہ میں مسمار کردیا تھا اور آزاد ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس سلسلہ میں مزاحم ہونے کے بجائے ہر طرح کی مدد کرے، دارالقضاء کے قیام سے ہندوستان کے سیکولر کردار پر کوئی دھبہ نہیں آئے گا بلکہ ہندوستان کا سیکولر کردار اور نکھر کر دنیا کے سامنے آئے گا۔

مسلمانوں کی جانب سے قاضی کا تقرر

(۲) مسلمان قاضی مقرر کئے جانے کا مطالبہ پورے ہونے سے پہلے فوری طور پر

یہ ضروری ہے کہ ہر علاقہ میں شرعی پنچایتیں یا مسلمان قاضی مقرر کرلئے جائیں اور مسلم معاشرہ میں ایسی فضا تیار کی جائے کہ لوگ اپنے باہمی مقدمات اور عائلی مسائل ان پنچایتوں اور قاضیوں کے یہاں لے جائیں، اگر ہر علاقہ میں اس طرح کی پنچایتیں قائم کرلی گئیں یا قاضی مقرر کرلئے گئے اور وہاں سادہ اسلامی طریقہ پر احساس ذمہ داری کے ساتھ مقدمات کے فیصلے کئے گئے تو مسلمان خوشی خوشی اپنے مقدمات وہاں لے جانے پر آمادہ ہوں گے اس سلسلہ میں یقیناً بہت سی عملی دقتیں اور پریشانیاں سامنے آئیں گی لیکن اگر اخلاص اور استقلال سے یہ کام شروع کیا گیا تو مشکلات کا حل خود بخود پیدا ہوتا رہے گا، حکومت کی مرضی کے بغیر خود مسلمانوں کی طرف سے قاضی کا تقرر کیا جانا بعض مقتدر فقہاء ومشائخ کے نزدیک محل نظر ہے وہ حضرات فرماتے ہیں کہ قوت تنفید کے بغیر قاضی شرعاً قاضی نہیں ہوتا، لیکن میرے خیال میں موجودہ صورت میں جب کہ مسلمانوں کے عائلی مقدمات کا فیصلہ غیر مسلم جج کررہے ہیں جو کسی امام یا کسی عالم کے نزدیک صحیح نہیں ہوتا اس سے اھون اور مقاصد شریعت سے قریب تر یہ شکل ضرور ہے کہ مسلمانوں کے مقرر کردہ قاضی جن کے پاس قوت تنفیذ نہیں ہے ان معاملات میں فیصلہ کریں۔ أھون البلیتین کے قاعدہ کے مطابق میرے خیال میں اس صورت کے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

☆☆☆☆

تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ کا جائزہ
کیا یہ دفعہ مسلم نادار مطلقہ کے درد کا مداوا ہے؟

تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ کا جائزہ
کیا یہ دفعہ مسلم نادار مطلقہ کے درد کا مداوا ہے؟

نفقہ مطلقہ سے متعلق سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ نے قانون فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کو بحث ونظر کا موضوع بنادیا ہے، اس کے سلسلہ میں ایک ترمیمی بل پارلیمنٹ میں پیش ہو چکا ہے، اس لئے آیئے ہم قانون فوجداری کی مذکورہ دفعہ پر جذبات سے بلند ہوکر حقیقت پسندانہ نظر ڈالیں اور جائزہ لیں کہ کیا واقعی قانون فوجداری کی یہ دفعہ نادار مسلم مطلقہ کی مشکلات کا مکمل حل پیش کرتی ہے اور اس میں نادار مطلقہ کے درد کا پورا مداوا موجود ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر اس دفعہ کے نقائص کا جائزہ لیں کہ اس میں کیا کیا جھول ہے اور کن پہلوؤں سے ہے؟ اگر یہ دفعہ اسلامی عائلی قانون (مسلم پرسنل لا) سے متصادم ہے جیسا کہ علماء کرام اور قانون شریعت کے ماہرین کی متفقہ رائے ہے تو کیا اسلام نے نادار مطلقہ عورت کو در بدر ٹھوکریں کھانے اور دریوزہ گری پر مجبور کیا ہے، یا اس کی مشکلات ومسائل کا کوئی اطمینان بخش حل پیش کیا ہے، اگر نادار مطلقہ کی مشکلات کا کوئی اسلامی حل ہے تو وہ کیا ہے؟

تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ (۱)

ان سوالات کا جواب دینے سے پہلے آیئے ہم دفعہ ۱۲۵ کے اس حصہ کا مطالعہ کریں جو مسلم مطلقہ عورت سے متعلق ہے۔

''بیویوں بچوں اور والدین کی کفالت سے متعلق آرڈر''

۱۲۵(۱) اگر کوئی شخص معقول ذرائع آمدنی کے باوجود

(الف) بیوی کے معاملہ میں جو اپنی کفالت آپ کرنے کی اہل نہیں ہے۔

(ب) اپنے نابالغ جائز وناجائز بچوں کو جن کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو، چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔

(ج) اپنے بالغ جائز وناجائز اولادوں کو جو اپنی دماغی اور جسمانی کمزوری کی وجہ سے خود کفیل نہ ہوں (اس میں شادی شدہ لڑکیاں شامل نہیں ہیں)

(د) اپنے ماں باپ کو جن کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو۔

لاپرواہی برتتا ہے یا نان ونفقہ دینے سے انکار کرتا ہے تو کوئی بھی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ اس لاپرواہی اور انکار کا ثبوت فراہم ہوجانے پر متعلقہ شخص کو نان ونفقہ کے طور پر ہر ماہ ایک مقرر رقم ادا کرنے کا حکم دے سکتا ہے، یہ رقم بحیثیت مجموعی ۵۰۰ روپئے ماہانہ سے زائد نہیں ہوگی یا ماہانہ الاؤنس کی رقم کے بارے میں مجسٹریٹ جتنا بھی منظور کرنا مناسب سمجھے۔

تشریح اس باب کے تعلق سے

(الف)

(ب)(۱) ''بیوی'' کے زمرے میں وہ عورت بھی شامل ہے جسے اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو یا جس نے خود اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرلی ہو مگر دوسری شادی نہ کی ہو۔

(۲)

(۳)

اگر اس طرح کا کوئی شخص اس شرط پر اپنی بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری قبول کرنے کی پیش کش کرتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ رہے اور بیوی اس کے ساتھ رہنے سے انکار کرتی ہے تو متعلقہ مجسٹریٹ اس کے انکار کے اسباب پر غور کرسکتا ہے اور اس پیشکش کے باوجود اس سکشن کے تحت کوئی ہدایات دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس بات پر مطمئن ہو کہ ایسا

کرنے کی منصفانہ بنیاد موجود ہو۔

تشریح: اگر شوہر نے دوسری شادی کرلی ہو یا اس نے کوئی داشتہ گھر میں بٹھالی ہو تو یہ اس کی بیوی کے نزدیک اس کے ساتھ نہ رہنے کی ایک منصفانہ اور معقول بنیاد ہوگی۔''
(پرسنل لا آف دی مسلمس ص ۱۳۰، ۱۳۱، مؤلفہ اصطفی حسین)

ایک بنیادی بات

دفعہ ۱۲۵ کے متن کا مطالعہ کرنے کے بعد آیئے ہم اس کا حقیقت پسندانہ تنقیدی جائزہ لیں۔

کسی بھی طبقہ یا قوم کی مشکلات کا حل تلاش کرتے ہوئے یہ بات بنیادی طور پر مدنظر رہنی چاہئے کہ ہم جو حل تجویز کررہے ہیں وہ اس طبقہ کے لئے قابل قبول ہے کہ نہیں؟ قابل قبول اور کامیاب حل تک پہونچنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس طبقہ کے مذہب، نفسیات، سماجی اقدار وروایات کو پورے طور پر ملحوظ رکھ کر حل تجویز کیا جائے اگر ہمارا تجویز کردہ حل دادخواہ طبقہ کے مذہب، نفسیات، سماجی روایت سے براہ راست ٹکراتا ہے تو خواہ وہ فی نفسہ کتنا معقول ہو اس طبقہ کے کسی کام کا نہ ہوگا، جس کی دادرسی کرنے اور انصاف دلانے ہم بیٹھے ہیں۔

دفعہ ۱۲۵/ اسلام سے متصادم ہے

دفعہ ۱۲۵ کی سب سے بنیادی خامی یہی ہے کہ اسلام سے متصادم ہونے کی وجہ سے یہ ''ہمدردانہ حل''، مسلم نادار مطلقہ عورت کے لئے قابل قبول نہیں ہے، قرآن وسنت کی روشنی میں چودہ سو سال کے تمام مجتہدین، محدثین، فقہاء اور مفتیان کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عدت کا زمانہ گذر جانے کے بعد مطلقہ عورت کا سابق شوہر سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا اور سابق شوہر کے مال میں اس کا کوئی حق نہیں ہوتا، لہذا دفعہ ۱۲۵ کے سہارے اگر نادار مطلقہ عورت کو ماہانہ کچھ رقم مل بھی گئی تو اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل ناجائز اور حرام ہوگی اور اپنی ضروریات میں

اس کو استعمال کرنا خنزیر (سور) کھانے اور شراب پینے سے کم گناہ کی بات نہ ہوگی، قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون﴾ [سورۂ بقرہ:۱۸۸]

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ اڑاؤ اور نہ اسے حکام تک پہنچاؤ کہ جس سے لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم گناہ سے کھا جاؤ درآنحالیکہ تم جان رہے ہو۔''

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

لا يحل لامرئ مال أخيه إلا ما طابت به نفسه ۔(مسند أحمد بن حنبل، حدیث:۲۱۳۹۸)

''کسی انسان کے لئے اپنے بھائی کے مال میں سے اتنا ہی حلال ہے جو اسے خوشدلی سے دے۔''

ہندوستان کی مسلمان عورت آج بھی مذہب کے بارے میں حساس اور بیدار ہے قرآن وسنت اور اسلامی احکام سے اس کا رشتہ بڑا گہرا اور مضبوط ہے، اسلامی تعلیمات کو اپنی سب سے عزیز متاع تصور کرتی ہے اللہ اور اس کے رسول کو ناراض کرکے وہ بڑا سے بڑا خزانہ قبول کرنے پر تیار نہیں ہوسکتی ہے ماہانہ چند روپیوں کی کیا حیثیت ہے؟ وہ بھوکی پیاسی رہ کر بھی قرآن وحدیث کے مطابق زندگی گذارنا چاہتی ہے، اپنے مذہب کو داؤ پر لگا کر چند روزہ زندگی کی آسائش پسند نہیں کرتی، کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ دنیا کی زندگی عارضی اور فانی ہے، اس کا آرام بھی عارضی، تکلیف بھی عارضی، دائمی نہ ختم ہونے والی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، عقلمند وہ ہے جو آخرت کی زندگی سنوار لے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گذار کر جنت میں ہمیشہ کے لئے اپنا ٹھکانا بنالے، جس کی بہار خزاں سے ناآشنا ہے۔

عدت کے بعد دلایا جانے والا نفقہ عورت کے لئے حرام ہے

حاصل یہ ہے کہ نادار مسلم مطلقہ عورت کو جب یہ معلوم ہے کہ عدت کے بعد دلایا جانے والا نفقہ میرے لئے ناجائز وحرام ہے تو کم از کم ۷۰، ۸۰ فیصد مسلمان عورتیں ہر طرح کی مشقت اور آزمائش جھیل لیں گی لیکن عدالت میں جاکر دفعہ ۱۲۵ کی بنیاد پر شوہر سے ماہانہ نفقہ لینا پسند نہیں کریں گی، ۱۵، ۲۰ فیصدی مطلقہ عورتیں ناقابل برداشت معاشی مجبوری کی بنا پر عدالت میں جائیں گی اور سابق شوہر انہیں ماہانہ نفقہ دینے پر مجبور ہوگا، یہ عورتیں اپنی معاشی مجبوریوں کی بنا پر اس نفقہ کو استعمال تو کرلیں گی لیکن یہ احساس برابر ان کے دل میں چٹکیاں لیتا رہے گا کہ میں حرام مال کھا کر اپنی عاقبت تباہ کررہی ہوں، اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کررہی ہوں۔

موجودہ عدالتی نظام اور نادار مطلقہ عورت

جو لوگ ہندوستان کی عدالتوں کے موجودہ نظام کے بارے میں قریبی واقفیت رکھتے ہیں ان کا احساس تو یہ ہے کہ کسی بھی نادار اور بے سہارا آدمی کا عدالت میں جانا اور مقدمہ کی پیروی کرکے کامیابی حاصل کرلینا تقریباً ناممکن ہے، کیونکہ ایک نادار آدمی عدالتی اخراجات کے لئے غیر معمولی سرمایہ کہاں سے لائے گا، وکیلوں کی لمبی لمبی فیس، مقدمہ کے سلسلہ میں سالہا سال تک دوڑ بھاگ کے اخراجات کہاں سے پورا کرے گا؟ جو عورت زیریں عدالت سے لے کر ہائی کورٹ، سپریم کورٹ تک مقدمہ لڑنے کی سکت رکھتی ہے وہ عدالت کی نظر میں ''نادار'' ہو تو ہو حقیقتاً نادار اور تنگدست ہرگز نہیں ہوسکتی۔

چلئے ہم فرض کرلیتے ہیں کہ بیس فیصدی نادار مطلقہ عورتیں کہیں سے قرض لے کر دفعہ ۱۲۵ کے تحت نان ونفقہ کا دعوی لے کر عدالت پہونچیں تو پہلے انہیں اپنی ناداری ثابت کرنی پڑے گی، اس کے بعد یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ سابق شوہر کے پاس ''معقول ذرائع آمدنی'' ہیں اور وہ ماہانہ نفقہ دینے کی پوزیشن میں ہے، یہ دونوں باتیں ثابت کرنے کے بعد ہی ان

کے حق میں فیصلہ ہوسکتا ہے، ہندوستان جیسے غریب ملک میں ایسا اکثر ہوسکتا ہے کہ مطلقہ عورت کی طرح اس کا سابق شوہر بھی غریب ہو، اس کے پاس معقول ذرائع آمدنی نہ ہوں، ایسی صورت میں عورت کا دائر کیا ہوا مقدمہ خارج ہوجائے گا، ذرا انصاف کیجئے کہ سابق شوہر کی ناداری کی صورت میں اس نادار مطلقہ کے مسئلہ کا کوئی حل دفعہ ۱۲۵ میں موجود نہیں ہے اس کے باوجود شور مچایا جارہا ہے کہ دفعہ ۱۲۵ تمام نادار مطلقہ عورتوں کے درد کا مداوا ہے، اور اسلام نے تمام صورتوں میں نادار مطلقہ عورت کے نان ونفقہ، گذر بسر کا انتظام کیا ہے جس کا آپ ابھی مطالعہ کریں گے پھر بھی پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

بیس فیصد نادار مطلقہ عورتوں کے مقدمات عدالتوں میں گئے، دس فیصدی مقدمات اس لئے خارج ہوگئے کہ شوہر بھی غریب تھا، معقول ذرائع آمدنی کا مالک نہیں تھا، دس فیصدی مطلقہ عورتوں کے حق میں فیصلہ ہوگیا اور انہیں سابق شوہر سے ماہانہ کچھ رقم ملنے لگی جس کی بڑی سے بڑی مقدار پانچ سو روپئے یا اس سے زائد بھی ہوسکتی ہے لیکن عموماً بہت تھوڑی رقم مقرر کی جاتی ہے، مثلاً شاہ بانو بیگم کے کیس میں اندور کی عدالت نے اگست ۱۹۷۹ء میں ۲۵ روپئے ماہانہ دئے جانے کا فیصلہ صادر کیا، اس کے بعد شاہ بانو نے مدھیہ پردیش ہائی کورٹ میں اپیل کی تو یہ رقم ۱۷۹ روپئے دس پیسے کردی گئی، ذرا غور کیجئے اس مختصر رقم سے عورت اپنا گذر بسر کرپائے گی یا قرض کی وہ خطیر رقم ادا کرسکے گی جو مقدمہ لڑانے پر اس نے خرچ کیا؟ اگر اس کی زندگی نے وفا کی، پانچ دس سال تک زندہ رہی اور کہیں شادی نہیں کی تو شاید اس ماہانہ رقم سے اس کا قرض ادا ہوجائے۔

یہ بھی اس صورت میں جب ماہانہ ملنے والی پوری رقم چکانے میں لگادے اپنی ذات پر خرچ نہ کرے لیکن سوال یہ ہے کہ پھر اپنے اخراجات کہاں سے پورا کرے، وہ تو نادار ہے، اس تجزیہ سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ دفعہ ۱۲۵ سے نادار مطلقہ کے درد کا مداوا تو ہوا نہیں، وکلاء اور عدالت کے اہل کاروں کا کچھ فائدہ ضرور ہوا۔

ناداری اور افلاس کا بدترین استحصال

عدت گذرنے کے بعد نادار مطلقہ عورت کو سابق شوہر کی بیوی قرار دینا اس کی ناداری اور افلاس کا بدترین استحصال ہے اور صنف نازک کی انتہائی تذلیل ہے، ایک شریف عورت خواہ وہ کتنی ہی نادار ہو کسی قیمت پر رشتۂ نکاح منقطع ہوجانے کے بعد بیوی کہلانے پر تیار نہیں ہوگی، بلکہ اس کو اپنے لئے بدترین گالی تصور کرے گی، عدت کے بعد مطلقہ عورت کو بیوی قرار دینا مذہبی اعتبار سے سخت قابل اعتراض چیز ہے، زوجہ (بیوی) کا جو اسلامی تصور ہے اس میں من مانی تحریف ہے، بیوی قرار دینے کا اثر اصطلاح وتعبیر تک محدود نہیں رہتا بلکہ بے شمار دینی احکام پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، مثلا بیوی کی بہنیں، بھتیجیاں، بھانجیاں، خالائیں، پھوپھیاں اس کے شوہر کے لئے حرام ہوجاتی ہیں، ان میں سے کسی سے شوہر کا نکاح درست نہیں ہوتا، جب ہمارا قانون عدت کے بعد بھی اس مطلقہ کو بیوی قرار دیتا ہے تو طلاق دینے والے مرد نے اگر نادار مطلقہ عورت کی عدت کے بعد بھی اس مطلقہ کی بہن یا بھتیجی وغیرہ سے شادی کرلی ہو تو مسلم پرسنل لا کی بنیاد پر کوئی عدالت اس کو ناجائز اور ناقابل اعتبار قرار دے سکتی ہے۔

دفعہ ۱۲۵ کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یقین ہوجاتا ہے کہ اس دفعہ نے محض لفظی طور پر مطلقہ کو بیوی نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس لفظ کے تقاضے پورے کرنے چاہے ہیں، دفعہ ۱۲۵ کی تشریح کے اس ٹکڑے کو غور سے پڑھئے اور اس کے مضرات پر توجہ دیجئے۔

> ''اگر اس طرح کا کوئی شخص اس شرط پر اپنی بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری قبول کرنے کی پیشکش کرتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ رہے اور بیوی اس کے ساتھ رہنے سے انکار کرتی ہے تو متعلقہ مجسٹریٹ اس کے انکار کے اسباب پر غور کرسکتا ہے اور اس پیشکش کے باوجود اس سکشن کے تحت کوئی ہدایت دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس بات پر مطمئن ہو کہ ایسا کرنے کی منصفانہ بنیاد

موجود ہے۔‘‘

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر جج کی نگاہ میں عورت کے انکار کے معقول اسباب نہ ہوئے تو جج اسے سابق شوہر کے ساتھ رہنے کا حکم دے گا، ساتھ رہنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ عورت سابق شوہر کے فراہم کئے ہوئے کسی علحدہ مکان یا مکان کے کسی حصہ میں سابق شوہر سے الگ تھلگ رہے گی بلکہ ساتھ رہنے سے مراد بیوی کی طرح رہنا اور تعلقات زن وشوہر قائم کرنا ہے۔

دفعہ ۱۲۵ کی تشریح کے اس ٹکڑے سے میرے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔

’’اگر شوہر نے دوسری شادی کرلی ہو یا اس نے کوئی داشتہ گھر میں بٹھالی ہو تو یہ اس کی بیوی کے نزدیک اس کے ساتھ نہ رہنے کی ایک منصفانہ اور معقول بنیاد ہوگی۔‘‘

اس تشریح سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ رہنے سے ایسے تعلقات قائم کرنا مراد ہے جن میں اس کا شادی کرلینا یا داشتہ بٹھالینا خلل انداز ہوتا ہے، بالفرض ساتھ رہنے سے یہ مراد نہ ہو پھر بھی سوچئے کہ جو صورت حال بن رہی ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مطلقہ بیوی سابق شوہر کے ساتھ اس کے مکان میں رہ رہی ہے، شوہر نے دوسری شادی نہیں کی اور نہ گھر میں کوئی داشتہ بٹھائی تو اس کے علاوہ اور کیا ہوگا کہ مطلقہ سے داشتہ کا کام لیا جائے گا، دونوں بدترین حرام کاری میں مبتلا ہوں گے اور ناجائز اولاد پیدا ہونے کا اندیشہ ہوگا، دفعہ ۱۲۵ کے تحت مطلقہ عورتوں کو چند سکوں کے عوض اس کے ناپسندیدہ شخص کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جارہا ہے اس کی عصمت وعفت کو داؤ پر لگایا جارہا ہے اس پر یہ شور مچایا جارہا ہے کہ دفعہ ۱۲۵ اور سپریم کورٹ نے نادار عورت کا حق دلوادیا، اس کی عزت کو چار چاند لگادئے۔

کیا طلاق ہر حال میں قابل تعزیر جرم ہے؟

اب آیئے دفعہ ۱۲۵ کا ایک دوسرے پہلو سے جائزہ لیں، قانون فوجداری کے تحت نفقہ مطلقہ کا مسئلہ لانا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہمارے قانون ساز ادارہ کی نظر میں طلاق

کوئی قابل تعزیر جرم ہے خواہ وہ کسی حالت میں دی گئی ہو، یہ ذہنیت اسلامی قوانین سے متصادم اور رومن لا سے ہم آہنگ ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے ہر طلاق قابل مذمت نہیں ہوتی بلکہ جن حالات میں اور جن محرکات کی بنا پر طلاق دی گئی ہے ان کا جائزہ لینے کے بعد ہی اس کے درست یا قابل مذمت ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے اور یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جو عدالت میں طے کیا جائے، کیونکہ اس سلسلہ کی بہت سی باتیں وہ ہوتی ہیں جن کو عدالت میں لانا نہ شوہر پسند کرے گا اور نہ ہی بیوی، بلکہ اس میں دونوں کے لئے سامان رسوائی ہے، پھر میاں بیوی کے آپسی جھگڑے آپس کی آویزش، تعلقات کی نرمی وگرمی یہ ایسی چیزیں نہیں ہوتیں جو مجمع عام کے سامنے ہوں اور اس کو ثابت کرنے کے لئے گواہ فراہم کئے جاسکیں، اس طرح کے معاملات کو حل کرنے کے لئے مذہب واخلاق، خاندانی روایات اور میاں بیوی کے افراد خاندان ہی کا سہارا لیا جاسکتا ہے، اگر ہم احتیاط سے کہیں تو یہ دعوی کرسکتے ہیں کہ طلاق کے بہت سے معاملات میں عورت کا قصور ہوتا ہے عورت کے مسلسل نامناسب رویہ سے مجبور ہوکر شوہر کو بادل ناخواستہ طلاق کا اقدام کرنا پڑتا ہے اس صورت میں بھی اگر عورت نادار ہو تو ہماری عدالت اسے شوہر کی وفات تک یا مطلقہ عورت کے نکاح ثانی کرنے تک نان ونفقہ دلوائے گی آخر یہ صریح ظلم نہیں تو اور کیا ہے! بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اگر شوہر طلاق نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ عورت کے مسلسل مطالبہ پر شوہر نے خلع کیا ہو تب بھی ہماری عدالتیں خلع لینے والی عورت کو تا نکاح ثانی نفقہ دلوائیں گی۔

شوہر کے ذمہ عدت کے بعد بھی مطلقہ کا نان ونفقہ عائد کرنا دراصل طلاق کے دروازہ کو بند کرنا ہے، ذرا آپ سوچئے کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کی ساری شکلیں ختم ہوگئی ہوں اور دونوں کے درمیان اتنی وسیع خلیج پیدا ہوچکی ہو جس کو پاٹنا ممکن نہ ہو، اور اب بھی رشتۂ نکاح باقی رکھنے میں دونوں کی زندگی جہنم کا نمونہ بن رہی ہو تو موجودہ قانون کی موجودگی میں شوہر طلاق کی ہمت تو کرنہیں سکتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ طلاق دینے کی صورت میں مجھے بلاوجہ زندگی بھر اس عورت کا نان ونفقہ برداشت کرنا پڑے گا تو اس کے سوا وہ اور کیا کرسکتا ہے کہ کسی

غیر انسانی طریقہ سے اس عورت کو راستہ سے ہٹانے کی کوشش کرے، جن مذاہب میں طلاق مطلقاً ناقابل تعزیر جرم سمجھا جاتا ہے یا طلاق پر بہت سی پابندیاں عائد ہیں ان مذاہب کے ماننے والوں میں عورتوں کو جلانے اور وحشیانہ طریقوں پر ان کا رشتۂ حیات منقطع کرنے کے واقعات بکثرت آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اگر مسلمانوں کے لئے بھی طلاق کے سلسلہ میں اسی قسم کی غیر فطری رکاوٹیں کھڑی کردی گئیں تو مسلم معاشرہ میں بھی خدانخواستہ اسی قسم کے بہیمانہ مظالم ترقی کریں گے، جن کا مشاہدہ ہم بعض دوسرے سماجوں میں کررہے ہیں، لہذا دفعہ ۱۲۵ جس طرح قرآن وسنت کی روشنی میں غلط ہے، اسی طرح مسلمان عورتوں اور مسلم سماج کی بہی خواہی کے نقطۂ نظر سے بھی غلط ہے۔

☆☆☆☆

متبنیٰ بل اور اسلامی تعلیمات

متبنیٰ بل اور اسلامی تعلیمات

جب سے مہاراشٹر کی اسمبلی اور قانون ساز کونسل میں متبنیٰ بل منظور ہوا ہے، متبنیٰ کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی معقولیت زیر بحث آ گئی ہے، بعض اسلام دشمن اہل قلم نے متبنیٰ بل کی آڑ میں پورے اسلام کو ہدف تنقید بنایا اور ناواقف قارئین کے دل میں یہ تأثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ اسلام اپنی سنگدلی اور بے رحمی کی وجہ سے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی مالدار بے اولاد شخص کسی مفلوک الحال، کثیر العیال شخص کے کسی لڑکے یا لڑکی کو اس کی اجازت سے گود لے لے، اس کی کفالت اور پرورش کرے، اسے اپنی نسبی اولاد کی طرح لاڈ پیار سے رکھے، متبنیٰ کے بارے میں اسلامی قانون کا نام لے کر چونکہ اسلام پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی جارہی ہے، اسی لئے اس سلسلہ کے اسلامی قوانین اور اسلامی تعلیمات کی وضاحت از حد ضروری ہے۔

یتیم اور نادار بچوں کی کفالت

سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلام یتیم اور بے سہارا بچوں کی کفالت اور پرورش سے منع نہیں کرتا بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے، جن بچوں کے ماں باپ دونوں فوت ہوگئے یا صرف باپ کا انتقال ہوگیا ماں زندہ ہے، اگر ان یتیم بچے بچیوں کو ماں باپ کی طرف سے اچھی مقدار میں ترکہ ملا ہو، ان کے والدین یا والد کافی مال چھوڑ کر فوت ہوئے ہوں تو ان یتیم بچوں کو اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ان کے مال کی پوری طور نگہداشت کی جائے، ان کی زمین، جائداد، سرمایہ کو خرد برد ہونے سے بچایا جائے، مال کو جامد رکھنے کے بجائے اس طرح

تجارت وغیرہ میں لگایا جائے کہ اس کے مال میں افزائش ہو اور ان کی پرورش ایسی شفقت ومحبت سے کی جائے کی انہیں ماں باپ کے سائے سے محرومی کا جانکاہ احساس نہ ستائے۔

قرآن پاک کی متعدد آیات میں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک، ان کے اموال کی حفاظت، ان کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کی ہدایت کی گئی ہے، ظالمانہ طور پر یتیم کا مال کھانے کے بارے میں شدید ترین وعید سنائی گئی ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿یسئلونک ماذا ینفقون قل ما أنفقتم من خیر فللوالدین والأقربین والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل وما تفعلوا من خیر فإن اللہ بہ علیم﴾ [بقرہ:۲۱۵]

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، آپ کہہ دیجئے جو کچھ تمہیں مال سے خرچ کرنا ہے سو وہ حق ہے والدین کا اور عزیزوں کا اور یتیموں کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا، اور جو بھی نیکی کروگے اللہ کو اس کا پورا علم رہتا ہے۔''

﴿ولا تقربوا مال الیتیم إلا بالتي ھی أحسن حتی یبلغ أشدہ وأوفوا بالعھد إن العھد کان مسئولا﴾ [اسراء:۳۴]

''اور پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے مگر جس طرح کہ بہتر ہو، جب تک پہنچے وہ اپنی جوانی کو، اور پورا کرو عہد بیشک عہد کی پوچھ ہوگی۔''

﴿وآتوا الیتمی أموالھم ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب ولا تأکلوا أموالھم إلی أموالکم إنہ کان حوبا کبیراً﴾ [نساء:۲]

''اور یتیموں کو ان کا مال پہنچا دو اور پاکیزہ (چیز) کو گندی (چیز) سے مت تبدیل کرو اور ان کا مال نہ کھاؤ اپنے مال کے ساتھ بیشک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔''

﴿إن الذین یأکلون أموال الیتمی ظلما إنما یأکلون فی بطونھم نارا وسیصلون سعیرا﴾ [نساء:۱۰]

''بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا لیتے ہیں وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی

بھرتے ہیں اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔''

رسول اکرم ﷺ نے اپنے بہت سے فرامین میں یتیموں کی کفالت، ان کے ساتھ شفقت ورحمت کی تاکید فرمائی ہے۔

عن سهل بن سعد قال، قال رسول الله ﷺ: أنا و كافل اليتيم له ولغيره في الجنة هكذا، وأشار بالسبابة والوسطى وفرج بينهما شيئا۔(رواه البخاری)

حضرت سہل بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اور اپنے یا دوسرے کے یتیم کی کفالت کرنے والا دونوں جنت میں اس طرح ہوں گے اور آپ نے درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی سے اشارہ فرمایا اور دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ رکھا۔

عن أبي هريرة قال، قال رسول الله ﷺ: خير بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يحسن إليه وشر بيت في المسلمين بيت فيه يتيم يساء إليه ۔(رواه ابن ماجة)

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کا سب سے بہتر گھر وہ ہے جس میں یتیم بچہ ہو جس کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا ہو، اور مسلمانوں کا سب سے بُرا گھر وہ ہے جس میں یتیم بچے کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔

عن أبي أمامة قال، قال رسول الله ﷺ: من مسح رأس يتيم لم يمسحه إلا لله كان له بكل شعرة يمر عليها يده حسنات ومن أحسن إلى يتيمه أو يتيم عنده كنت أنا وهو في الجنة كهاتين وقرن بين إصبعيه۔(رواه أحمد والترمذی)

حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے یتیم بچے کے سر پر دست شفقت پھیرا، سر کے ہر بال کے بدلے میں جس پر اس کا ہاتھ گذرے گا نیکیاں ملیں گی، جو شخص اپنے یتیم بچے یا اپنے زیر کفالت یتیم بچے کے ساتھ حسن سلوک کرے گا، میں اور وہ جنت میں اس طرح پر ہوں گے، پھر حضور اکرم ﷺ نے دو انگلیوں کو ملا کر اشارہ فرمایا۔

عن ابن عباس قال، قال رسول الله ﷺ من آوى يتيما إلى طعامه وشرابه أوجب الله له الجنة البتة إلا أن يعمل ذنباً لا يغفر۔(رواه فی شرح السنة)

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنے یہاں یتیم کے کھانے پینے کا نظم کیا اللہ تعالیٰ نے یقیناً اس کے لئے جنت لازم کردی الا یہ کہ کوئی ناقابل معافی گناہ کرلے۔

عن أبي هريرة أن رجلا شكا إلى النبي ﷺ قسوة قلبه، قال: امسح رأس اليتيم واطعم المسكين۔(رواه أحمد)

حضرت ابوھریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے قساوت قلبی کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو، مسکین کو کھانا کھلاؤ۔

یتیم اور نادار بچوں کے مسئلہ کا حل

گذشتہ صفحات میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اسلام یتیم بچوں اور بچیوں کی پرورش، کفالت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو ایک اہم عبادت اور کارِ ثواب قرار دیتا ہے، یتیموں کا مال ہڑپ کرنے اور ان پر ظلم وتعدی کرنے کی سخت ترین مذمت قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں آئی ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص کثیر العیال ہے نیز معاشی اعتبار سے کمزور اور مفلوک الحال ہے تو اس کے بچے کو اپنے گھر کا ایک فرد بنا کر اپنی اولاد کی طرح اس کی پرورش وپرداخت، تعلیم وتربیت اسلام کی نظر میں بہت افضل اور جنت میں داخل کرنے والا کام ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کی کثیر العیال اور معاشی کمزوری کا خیال کرتے ہوئے ان کے صاحبزادے حضرت علیؓ کو اپنے گھر کا ایک فرد بنالیا، ان کی پرورش، کفالت اور اخراجات کا بار رسول اللہ ﷺ اٹھاتے رہے، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ بے اولاد تھیں انہیں دوسروں کے چھوٹے بچوں اور بچیوں کی پرورش کا خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے بہت سے بھتیجے اور بھتیجیاں ان کے گھر پلے بڑھے، قبیلۂ انصار کی بعض بچیوں کو بھی حضرت عائشہؓ نے اپنے گھر کے بچوں

کی طرح پالا اور اپنے ہی گھر سے ان بچیوں کی شادی بیاہ کا انتظام کیا۔

اسلامی تعلیم کے نتیجہ میں یتیم بچے اور بچیوں نیز معاشی طور پر کمزور لوگوں کے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا مسئلہ مسلم سماج میں کوئی مسئلہ نہیں تھا، یہ تلاش نہیں کرنا پڑتا تھا کہ فلاں یتیم بچے کی پرورش کون کرے بلکہ ایک سے زائد افراد یتیم بچے اور بچی کی پرورش کے آرزومند اور خواہشمند رہا کرتے تھے، یتیم اور نادار بچوں کے تکفل اور پرورش کا ذوق اتنا عام ہو چکا تھا کہ جو لوگ بھی معاشی لحاظ سے کچھ مضبوط تھے وہ کسی یتیم نادار بچے کو اپنے گھر کا ایک فرد بنانا اور گھر کے ایک بچے کی طرح اس کی پرورش، کفالت اور تعلیم وتربیت کا نظم کرنا اپنا دینی فریضہ تصور کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے دسترخوان پر کوئی نہ کوئی یتیم بچہ ضرور ہوتا تھا، یتیم بچے کو شریک دسترخوان بنائے بغیر وہ کھانا نہیں کھاتے تھے، الحمدللہ یتیم اور نادار بچے اور بچیوں کی کفالت اور پرورش کا یہ مزاج مسلمانوں میں اب بھی بڑی حد تک باقی ہے، یتیموں پر خرچ کرنا اس گئے گذرے دور میں بھی ایک اہم کارثواب سمجھا جاتا ہے، اور مخیّر مسلمان یتیموں کی پرورش اور نگہداشت میں اپنی بساط بھر دل کھول کر حصہ لیتے ہیں۔

انسان جس یتیم یا نادار بچے کی کفالت کر رہا ہے اگر اس کے معاشی مستقبل کو محفوظ بنانے کے لئے اپنی زندگی میں اپنی زمین، جائداد، دوکان، مکان کا کوئی حصہ اس کی ملکیت میں دینا چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنے کا پورا اختیار ہے، اسی طرح اگر روپیہ یا سامان کی بڑی سے بڑی مقدار اسے دینا چاہے تو دے سکتا ہے، اسی طرح اسلام اس کی بھی اجازت دیتا ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے ایک تہائی مال کی وصیت اس بچے کے حق میں کردے۔

غریب پروری کے نام پر ورثا کی حق تلفی

لیکن اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ زندگی بھر اپنی ایک انچ زمین یا مکان کی ملکیت اس بچے یا بچی کی طرف منتقل نہ کرے جسے اپنے گھر کا ایک فرد بنا کر اپنے بچے کی طرح اس کی پرورش

کر رہا ہے، بلکہ اس کی وفات کے بعد اس کا چھوڑا ہوا ترکہ اس کے خاندانی ورثاء کے بجائے اس گود لیے ہوئے بچے یا بچی کو ملے تو اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، اگر اس سے کہا جاتا ہے کہ غریب نوازی کے جذبے کے تحت تم اس بچے یا بچی کو جو کچھ دینا چاہتے ہو اپنی زندگی اور صحت کے زمانے میں دے دو، اپنی بیماری اور موت کا انتظار نہ کرو تو کہتا ہے کہ اگر میں نے زندگی ہی میں اسے کوئی معقول زمین، جائیداد یا خطیر رقم دیدی تو اس بات کا پورا اندیشہ ہے کہ اس کا پالا ہوا بچہ اس سے آنکھ پھیر لے اور اس کی فیملی کا ایک فرد بن کر نہ رہے، باپ کی طرح اس کا احترام ملحوظ نہ رکھے، غرضیکہ یہ شخص چاہتا ہے کہ زندگی بھر اس کا کمایا ہوا ہر پیسہ اس کی ملکیت اور کنٹرول میں رہے لیکن اس کی وفات کے بعد اس کا چھوڑا ہوا مال (جواب اس کا مال نہیں بلکہ اس کے خاندانی ورثہ کی ملکیت ہے) خاندانی ورثہ کو ملنے کے بجائے اس متبنیٰ کو ملے یا متبنیٰ اس کے ترکہ میں ایک بیٹے کی حیثیت سے حصہ دار بنے، اسلام اس خودغرضی کو مسترد کرتا ہے اور جائز خاندانی ورثہ کو ان کا حق دلاتا ہے، ایسا شخص دراصل یتیم یا نادار بچے کی خیرخواہی کا جذبہ نہیں رکھتا بلکہ اسے اپنی دولت کی لالچ دلا کر تاحیات اسیر رکھنا چاہتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ اسلام اس بات کا ہرگز مخالف نہیں ہے کہ کسی یتیم بچے یا مفلوک الحال گھر کے کسی بچے کو اس کے والدین سے یا سرپرستوں کی اجازت سے کوئی مسلمان اپنے گھر کا ایک فرد بنالے اور اپنے بچوں کی طرح اس کی کفالت اور تعلیم وتربیت کا بندوبست کرے، ایسا کرنا اسلام میں نہ صرف جائز بلکہ بہت بڑا کار خیر ہے جس کے نتیجہ میں جنت کے بلند درجات کا وعدہ کیا گیا ہے، ہاں اسلام اس کا سخت مخالف ہے کہ کسی بچے یا بچی کی بے سہارگی، ناداری اور مفلوک الحالی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا رشتہ اس کے حقیقی والدین اور خاندان سے کاٹ دیا جائے، متبنیٰ بل پر فریب اور خوبصورت عنوان سے غریبوں اور ناداروں کے انسانی اور نسلی حقوق کا بدترین استحصال ہے، اس کا تجزیہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

متبنیٰ بل کا تجزیہ

لے پالک بل (متبنیٰ بل) کا مسودہ ۱۹۷۲ء میں راجیہ سبھا میں پیش کیا گیا، اور ابھی حال میں مہاراشٹر اسمبلی نے جو متبنیٰ بل پاس کیا ان دونوں میں چند باتیں مشترک ہیں۔

۱۔ متبنیٰ بل کے تحت جس بچے کو گود لیا گیا اس کا رشتہ اپنے حقیقی والدین اور اہل خاندان سے کٹ جاتا ہے، قانون کی نظر میں وہ بچہ اپنے حقیقی ماں باپ کا بچہ باقی نہیں رہتا، ان کے ترکہ میں میراث پانے کا حق دار نہیں رہتا، بلکہ جس جوڑے نے اسے گود لیا ہے قانون کی نگاہ میں وہی اس کے ماں باپ قرار پائیں گے، اور ان کے ترکہ میں اس گود لئے ہوئے بچہ یا بچی کو ایک حقیقی بیٹے یا بیٹی کی طرح میراث کا استحقاق ہوگا، اسی طرح متبنیٰ بل کے تحت گود لیا ہوا لڑکا اگر جوان ہونے کے بعد اپنی ذہانت اور محنت سے معاشی لحاظ سے کافی ترقی کر لیتا ہے اور خوشحال ہو جاتا ہے، پھر اتفاق سے جوانی ہی میں انتقال ہو جاتا ہے، تو اس کی کمائی ہوئی دولت کے حقدار اس کے حقیقی والدین اور حقیقی بھائی بہن نہیں ہوں گے، بلکہ وہ شخص ہوگا جس نے اسے گود لیا ہے۔

۲۔ متبنیٰ بل کے مطابق گود لیا ہوا بچہ اپنے خاندان سے اس طرح کٹ جاتا ہے کہ قانوناً اس کے اوپر اپنے نادار اور معاشی طور پر مجبور والدین کی کفالت کی ذمہ داری نہیں آتی، متبنیٰ خواہ کتنا ہی مالدار ہو اور اس کے حقیقی ماں باپ خواہ کتنے ہی غریب ہوں، اس پر قانوناً اس کی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے غریب اور نادار ماں باپ کے لئے کچھ سہارا بنے اور ان کی معاشی مجبوریوں کا خیال کرتے ہوئے اپنی دولت کا کچھ حصہ ان پر خرچ کرے، حالانکہ اس کی پرورش و پرداخت کا ابتدائی عمل جو انتہائی صبر آزما اور مشکل ہوتا ہے اس کے والدین نے ہی انجام دیا ہے۔

۳۔ اپنی اولاد سے والدین جو جس قدر محبت اور شیفتگی ہوتی ہے وہ ناقابل بیان ہے، کسی شخص کے خواہ کتنی ہی اولاد پیدا ہو جائے معتدل حالات میں وہ اس پر ہرگز راضی نہیں

ہوسکتا کہ وہ اپنے کسی بچے یا بچی کو کلیۃً دوسرے شخص کو عطا کر دے، اور اس کا قانونی اور نسلی رشتہ اپنے اور اپنے خاندان سے کاٹ دے، اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والی اولاد کو ماں اپنے سے جدا کرنے پر معمولی معاشی تنگی کے وقت بھی راضی نہیں ہوتی، وہ فقر و فاقہ کے باوجود اپنے بچے کو اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتی ہے، غریب ماں باپ کی اپنی اولاد کلیۃً دوسرے کو دے دینے پر آمادگی اسی وقت ہوتی ہے جب مسلسل فقر و فاقہ اور تنگی و ترشی سے ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، اور وہ نان شبینہ کے محتاج ہو جاتے ہیں، ایسی صورت میں مالدار جوڑوں کی طرف سے جب لمبے معاوضے کی پیش کش آتی ہے، اور فقر و فاقہ سے مجبور والدین کو جب سنہرے خواب دکھائے جاتے ہیں، اور اس کے لئے مسلسل ذہن سازی کی جاتی ہے تو وہ کسی طرح اس پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ معقول رقم لے کر اپنے بچے یا بچی کو ہمیشہ کے لئے اپنے سے جدا کر دیں، ان کا یہ فیصلہ بھی حالات کے دباؤ کے تحت ہنگامی اور وقتی ہوتا ہے، ان کی اس آمادگی کا بہانہ بنا کر قانون تبنیت کا سہارا لے کر ان کی اولاد ان سے جدا کر لی جاتی ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ معاشی مجبوریوں کا دباؤ کم ہوتے ہی حقیقی ماں باپ اپنے لڑکے یا لڑکی کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں، جنہیں انہوں نے متبنیٰ بل کے تحت کسی مالدار جوڑے کے حوالہ کیا تھا، پھر وہ چاہتے ہیں کہ اپنے لخت جگر اور نور نظر کو اپنے گھر کی رونق بنائیں، اور اسے اپنے گھر لا کر اپنے فطری جذبِ محبت کی تسکین کا سامان فراہم کریں، لیکن قانون کے اعتبار سے وہ ایسا نہیں کر سکتے، متبنیٰ بل کے تحت تبنیت کے رجسٹریشن نے ان کے بال و پر کاٹ دیئے ہوتے ہیں، اب وہ اپنی حقیقی اولاد کو اپنے گھر کا ایک فرد شمار نہیں کر سکتے۔

۴۔ متبنیٰ بل کے تحت بسا اوقات بچے اور بچی کا مذہب بھی تبدیل ہو جاتا ہے، اس لئے کہ متبنیٰ بل کے اعتبار سے گود لینے کے بارے میں مذہب کی کوئی پابندی نہیں، ایک ہندو ایک مسلمان یا عیسائی کے بچہ کو گود لے سکتا ہے، گود لیے جانے کے بعد بچہ اپنے حقیقی ماں باپ کے مذہب پر برقرار نہیں مانا جائے گا، بلکہ گود لینے والا شخص جس مذہب پر عمل پیرا ہے متبنیٰ اسی مذہب کا ماننے والا شمار کیا جائے گا۔

چند اسلامی تصورات

متبنیٰ کے بارے میں اسلام کا موقف صحیح طور پر اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب کہ اسلام کے چند اساسی افکار وتصورات ملحوظ رکھے جائیں۔

مال دراصل اللہ کی ملکیت ہے

۱۔ انسان کے قبضۂ وتصرف میں جو بھی مال یا جائداد ہو انسان اس کا حقیقی مالک نہیں ہے، تمام چیزوں پر حقیقی ملکیت اللہ کی ہے جس طرح انسان کی زندگی مستعار ہے، اسی طرح اس کی ملکیت بھی مستعار ہے، انسان نہ پیدا ہونے سے پہلے کسی چیز کا مالک تھا نہ مرنے کے بعد کسی چیز کا مالک رہے گا، زندگی بھر اسے اللہ کے دیئے ہوئے مال میں تصرف کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کا حق تھا، لیکن دنیا سے رخصت ہوتے ہی اپنے مال وجائداد سے اس کی مجازی ملکیت بھی رخصت ہوجاتی ہے، اور اس کے ترکہ پر ورثہ کی ملکیت قائم ہوجاتی ہے، بلکہ انسان جوں ہی مرض الموت میں گرفتار ہوا اور صحت یابی سے تقریبا مایوس ہوگیا، مال وجائیداد سے اس کا رشتہ کمزور پڑ گیا اور اس کے مال سے ورثہ کا حق وابستہ ہوگیا، اسی لئے مرض الموت میں گرفتار ہوتے ہی انسان کے مالی تصرفات پر مختلف پابندیاں عائد ہوجاتی ہیں، تاکہ وہ اپنے تصرفات سے ان لوگوں کو نقصان نہ پہنچا سکے جن کا حق اس کے مال سے وابستہ ہو چکا ہے۔

ایک تہائی ترکہ کے بارے میں مرنے والے کی وصیت جاری اور نافذ کرنا بھی مراحم خسروانہ کے قبیل کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے بندے کو آخری موقع دیا ہے کہ اگر وہ زندگی میں نیکی کے کاموں میں پیچھے رہ گیا ہے تو وصیت کے ذریعہ اس کی کچھ تلافی کرلے، خلاصہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد متروکہ مال میں مرنے والے کی مرضی نہیں چلے گی، بلکہ اللہ کی مرضی اور ہدایت چلے گی، رشتۂ حیات منقطع ہوتے ہی اپنے مال سے انسان کا رشتہ اور کنٹرول ختم ہوجاتا ہے، اور اللہ کے احکام کے مطابق زندہ افراد میں وہ مال تقسیم کردیا جاتا ہے۔

روزی اور اولاد کے فیصلے اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں

۲۔ یہ کارخانۂ عالم اللہ کی قدرت سے چل رہا ہے، اللہ ہی نے ساری کائنات کو اور تمام مخلوقات کو پیدا کیا ہے، وہی سب کو روزی دینے والا ہے، رزق میں تنگی اور وسعت، مرض اور صحت اسی کی جانب سے ہے، کس کو کب کتنی روزی دینی ہے، کس کو لڑکا دینا ہے اور کس کو لڑکی دینی ہے، اور کسے لڑکا اور لڑکی دونوں دینا ہے، یہ سب فیصلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، انسان کسی چیز کے لئے تگ ودو اور کوشش تو کرسکتا ہے لیکن اس کی کوشش کے باوجود اگر مطلوبہ چیز اس کو نہ مل سکی تو اللہ کے فیصلے پر راضی ہونے اور صبر کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

﴿**إن ربک یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر إنه کانه بعباده خبیرا بصیرا**﴾ [اسراء:۳۰]

بے شک تیرا رب کھول دیتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے، اور تنگ بھی وہی کرتا ہے، وہی ہے اپنے بندوں کو جاننے والا دیکھنے والا۔

﴿**واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق فما الذین فضلوا برادی رزقهم علی ما ملکت أیمانهم فهم فیه سوآء أفبنعمة اللہ یجحدون**﴾ [نحل:۷۱]

اور اللہ نے بڑائی دی تم میں سے ایک کو ایک پر روزی میں، سو جن کو بڑائی دی وہ نہیں پہنچا دیتے اپنی روزی ان کو جن کے مالک ان کے ہاتھ ہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہوجائیں، کیا اللہ کی نعمت کے منکر ہیں۔

﴿**للہ ملک السموات والأرض یخلق ما یشاء یهب لمن یشاء إنثا ویهب لمن یشاء الذکور ویزوجهم ذکرانا وإناثا ویجعل من یشاء عقیما إنه علیم قدیر**﴾ [شوری:۴۹-۵۰]

اللہ کا راج ہے کہ آسمانوں میں اور زمین میں، پیدا کرتا ہے، جو چاہے، بخشتا ہے

جس کو چاہے بیٹیاں اور بخشتا ہے جس کو چاہے بیٹے، یا ان کو دیتا ہے جوڑے بیٹے اور بیٹیاں، اور کر دیتا ہے جس کو چاہے بانجھ، بیشک وہ ہے جاننے والا، قدرت والا۔

اولاد کی خواہش انسان کی ایک فطری خواہش ہے، ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی نسل چلے، اور اس کا گھر بچوں سے آباد رہے، نکاح کا اہم ترین مقصد حصول اولاد بھی ہے، لیکن جب اللہ نے کسی شخص کے مقدر میں اولاد نہیں رکھی ہے، تمام جائز کوششوں کے باوجود اس کے یہاں اولاد کی پیدائش نہیں ہوئی، تو اس کے لئے اللہ کے اس فیصلے پر راضی رہنے اور صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، مصنوعی طور پر صاحب اولاد بننے کی کوشش ایک عبث اور غیر فطری عمل ہے، جس کے نتائج عام طور پر اچھے نہیں نکلتے، اولاد سے محروم جوڑا اگر اپنے گھر کا سناٹا ختم کرنے اور گھر کو آباد کرنے کے لئے اپنے گھر میں کچھ بچوں کی پرورش کرنا چاہتا ہے تو اسے نہ صرف اس کی اجازت ہے بلکہ ترغیب بھی ہے، اپنے رشتہ داروں کے بچوں یا دوسرے یتیم، نادار بچوں کو خوشحال بے اولاد جوڑے اپنے گھر میں پال سکتے ہیں، ان پر اپنے جذبات محبت نثار کر سکتے ہیں، لیکن اس کی ہرگز اجازت نہیں ہے کہ کسی معصوم بچے کا رشتہ اس کے والدین سے کاٹ کر مصنوعی طور پر خود صاحب اولاد بن جائے، انسانی بچے آم کے پودے نہیں ہیں کہ ایک کھیت سے اکھاڑ کر دوسرے کھیت میں لگا دیا جائے۔

نسبی اور نسلی رشتوں کو تبدیل کرنے کا انسان کو اختیار نہیں

۳۔ انسانوں کے نسبی اور نسلی رشتے اللہ کے بنائے ہوئے ہیں، ان رشتوں میں تبدیلی کا انسان کو کوئی اختیار نہیں ہے، انسان نہ ان رشتوں کو وجود میں لاسکتا ہے نہ انہیں ختم کر سکتا ہے، یہ نسبی اور نسلی رشتے نہ دو انسانوں کے باہمی معاہدے سے وجود میں آسکتے ہیں، اور نہ دونوں کے ختم کرنے سے ختم ہو سکتے، ان رشتوں کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اگر انسانوں کو ان میں حک و فک اور ترمیم و اضافہ کا اختیار دیا جائے تو ان رشتوں کا تقدس بری طرح پامال ہو جائے گا، ان میں بے ثباتی اور ناپائداری پیدا ہو جائے گی، دنیا کا خاندانی نظام

شکست و ریخت کا شکار ہو جائے گا۔

اسی لئے رسول اکرم ﷺ نے ان لوگوں کی سخت مذمت کی ہے جو اپنا نسبی رشتہ اپنے حقیقی والدین اور خاندان کے بجائے دوسروں سے جوڑتے ہیں، نسب اور نسل کی دانستہ تبدیلی ایسا سخت گناہ قرار دیا گیا ہے جس پر آخرت میں سنگین سزاؤں کی دھمکی ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ: "من ادعی إلی غیر أبیه وهو یعلم فالجنة علیه حرام۔" [متفق علیہ]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے جو شخص دانستہ اپنا نسب اپنے باپ کے علاوہ کسی اور سے جوڑتا ہے اس کے لئے جنت حرام ہے۔ (بخاری، مسلم)

قال رسول اللہ ﷺ: " لا ترغبوا عن آبائکم فمن رغب عن أبیه فقد کفر۔" [متفق علیہ]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اپنے باپ دادا سے اعراض نہ کرو، جس نے اپنے باپ سے اعراض کیا اس نے کفر کیا۔ (ناشکری اور ناسپاسی کی)

اسلام نے اپنے اسی بنیادی تصور کی بنا پر دور جاہلیت میں رائج لے پالک (متبنیٰ) کی رسم کو ختم کر دیا، اور قرآن کریم نے صاف اعلان کر دیا کہ منھ بولا بیٹا حقوق و احکام میں حقیقی بیٹے کی طرح نہیں ہے، کسی شخص کے یہ کہنے سے کہ فلاں بچہ میرا بیٹا ہے وہ بچہ اس کا بیٹا نہیں ہو جاتا، ہر شخص کا بیٹا وہی ہے جو جائز رشتۂ نکاح کے ذریعہ اس کے نطفہ سے پیدا ہوا ہو، اسی طرح اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ماں کہہ دیا ہے تو کہنے سے اس کی بیوی ماں نہیں بن جاتی، اس کی ماں تو وہی ہے جس کی کوکھ سے وہ پیدا ہوا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفه وما جعل أزواجکم اللائی تظهرون منهن أمهاتکم وما جعل أدعیائکم أبنائکم ذلکم قولکم بأفواهکم واللہ یقول الحق وهو یهدی السبیل ادعوهم لآبائهم هو أقسط عند اللہ، فإن لم تعلموا آبائهم فإخوانکم فی الدین ومواليکم ولیس علیکم جناح

فیما أخطأتم به ولکن ما تعمدت قلوبکم وکان اللہ غفورا رحیما﴾[احزاب:۴،۵]

(اللہ نے نہیں رکھے کسی مرد کے دو دل اس کے اندر، اور نہیں کر دیا تمہاری بیویوں کو جن کو ماں کہہ بیٹھے ہو، سچی مائیں تمہاری، اور نہیں کیا تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے، یہ تمہاری بات ہے اپنے منھ کی، اور اللہ کہتا ہے ٹھیک بات اور وہی سمجھاتا ہے راہ، پکارو لے پالکوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے یہی پورا انصاف ہے، اللہ کے یہاں، پھر اگر نہ جانتے ہو ان کے باپ کو تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق ہیں، اور گناہ نہیں تم پر جس چیز میں چوک جاؤ لیکن وہ جو دل سے ارادہ کرو، اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان)

قرآن پاک نے پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ دور جاہلیت کی رسم تبنیت پر پابندی عائد کی، دوسری قوموں خصوصاً ہندوؤں میں گود لینے کی رسم اب بھی باقی ہے، اور ہندو کوڈ بل میں قانون تبنیت کو شامل کر کے اس جاہلی رسم کو قانونی حیثیت دے دی گئی ہے، ایک زمانہ سے ہندوستان کے ارباب اقتدار کی مسلسل کوشش ہے کہ مسلمان بھی قرآن کی صریح ہدایات سے بغاوت کرتے ہوئے اس جاہلی رسم کو گلے لگالیں، لیکن مسلمانانِ ہند اس کے لئے ہرگز آمادہ نہیں ہیں، وہ اس پر راضی نہیں ہوسکتے کہ متبنیٰ بل کی آڑ میں اسلام کے تمام عائلی قوانین کو سبوتاژ کیا جائے، کیونکہ اسلام کے اکثر عائلی قوانین (قانونِ وراثت، قانونِ ولایت، قانونِ حضانت، قانونِ نفقہ، قانونِ نکاح وطلاق وغیرہ) متبنیٰ بل سے مجروح اور متأثر ہوتے ہیں۔

قانون تبنیت کے حامیوں کے دلائل

دورِ حاضر میں قانون تبنیت کی وکالت کرنے والے خاص طور پر دو دلیلیں پیش کرتے ہیں، ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ گود لیے ہوئے بچے یا بچی کو قانونی بیٹا اور بیٹی کی حیثیت دینے سے ان جوڑوں کا مسئلہ حل ہوگا جو اولاد سے محروم ہیں، یا جن کے اولاد نرینہ

نہیں ہے، بلکہ لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں، صاحب اولاد ہونے کی خواہش ایک فطری خواہش ہے، اس فطری خواہش کی تسکین کے لئے اگر گود لئے ہوئے بچے کو حقیقی بچے کا مقام قانونی طور پر دے دیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔

دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ دور حاضر میں دنیا کے تقریبا ہر ملک میں لاوارث بچوں یا یتیم ونادار بچوں کی تربیت اور کفالت کا مسئلہ ایک سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے، حکومتوں کی ملک کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ایسے بے سہارا بچوں کی پرورش، تعلیم وتربیت پر صرف کرنا پڑتا ہے، اس طرح ملک کے خزانہ پر بڑا بار پڑتا ہے، قانون تبنیت نافذ اور جاری ہونے سے ایسے بے سہارا بچوں کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہوجائے گا، اور حکومتوں پر کوئی معاشی بار پڑے بغیر بہتر سے بہتر طور پر ان بچوں کی کفالت اور تعلیم وتربیت ہوسکے گی۔

یہ دونوں دلیلیں بظاہر بہت پرکشش اور جاذبِ نظر محسوس ہوتی ہیں، لیکن تجزیہ وتنقید کی ہلکی آنچ سے ان کی چمک ودمک غائب ہوجاتی ہے۔

پہلی دلیل کا جائزہ

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ صاحب اولاد بننے کی خواہش یا نرینہ اولاد کی خواہش بلاشبہ ایک جائز اور فطری خواہش ہے، نکاح کی مشروعیت کا ایک بڑا مقصد اسی فطری خواہش کی تسکین اور تکمیل ہے، اس کے لئے انسان تمام جائز وسائل اختیار کرسکتا ہے، شوہر یا بیوی میں اگر کوئی حیاتیاتی یا جسمانی نقص اولاد نہ ہونے کا سبب ہے تو اس کے ازالہ کے لئے اطباء اور میڈیکل سائنس کے ماہرین سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے، لیکن تمام امکانی کوششوں کے باوجود اگر اولاد کی پیدائش نہیں ہورہی ہے یا صرف لڑکیاں پیدا ہورہی ہیں تو میاں بیوی کو سمجھنا چاہئے کہ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کا یہی فیصلہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں اولاد یا نرینہ اولاد نہیں رکھی ہے۔

ایسی صورت میں میاں بیوی کا مصنوعی طور پر صاحب اولاد بننے کی کوشش کرنا اللہ

کے فیصلہ کو تسلیم نہ کرنا اور اس کے خلاف بغاوت کرنا متصور ہوگا، یہ ایسا ہی ہے کہ تمام جائز کوششوں کے باوجود جب کوئی شخص صاحب ثروت اور مالدار نہ ہوسکا تو وہ چوری اور رہزنی کرکے مالدار بن جائے، انسان کی بہت سی جائز خواہشیں اس کی کوشش کے باوجود پوری نہیں ہو پاتیں، ایسی صورت میں انسان کے لئے صبر ورضا کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے، انسان جب ہر قیمت پر اپنی ہر خواہش کی تکمیل چاہتا ہے، تو نظام عالم میں فساد پیدا ہوتا ہے، خود اس کا اور دوسروں کا چین وسکون رخصت ہوجاتا ہے۔

انسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے گہری حکمتوں پر مبنی ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، خواہ اس حکمت کا ادراک نہ کرسکیں، اللہ تعالیٰ بندے کے لئے جو مناسب ہوتا ہے فیصلے کرتا ہے، اسی اولاد ہی کے مسئلے پر غور کیجئے، اولاد اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، لیکن وہ ہر حال میں انسان کے لئے خیر وفلاح، سکون واطمینان کا باعث نہیں بنتی، نالائق اولاد انسان کی دنیا وآخرت دونوں کو برباد کردیتی ہے، بہت سے لوگ اولاد کے مظالم اور ان کی ایذا رسانیوں سے اس قدر تنگ ہوجاتے ہیں کہ بے اولاد ہونے کی تمنا کرنے لگتے ہیں، بہت سے لوگ اولاد کی اندھی محبت میں اپنی آخرت تباہ کرلیتے ہیں، اولاد کے لئے مال ودولت کا اندوختہ کرنے کی غرض سے دوسروں کی زمین وجائداد دبالیتے ہیں۔

جس شخص کے یہاں پوری کوشش کے باوجود اولاد نہ ہوسکی وہ مصنوعی طور پر صاحب اولاد بننے کی کوشش کرنے کے بجائے یہ سوچے کہ غالباً اولاد کا ہونا میرے لئے بہتر نہ تھا، اس لئے میرے حکیم آقا نے مجھے بے اولاد رکھنے کا فیصلہ فرمایا، وہ ان لوگوں کو دیکھ کر تسلی کرلے جن کے لئے اولاد سوہان روح بنی ہوئی ہے، اس بات کا استحضار کرے کہ بہت سے انبیاء، اولیاء، سلاطین وامراء بھی بے اولاد رہے۔

قانون تبنیت کے مفاسد

لے پالک بچوں کو قانونا نسبی اولاد کا درجہ دینا بہت سے مفاسد کا ذریعہ ہے، ظاہر

ہے کہ کوئی جوڑا اپنے پیارے لڑکے یا لڑکی کو اپنے سے ہمیشہ کے لئے جدا کرکے کسی اجنبی جوڑے کے حوالہ اسی وقت کرتا ہے جب کہ اسے خطیر معاوضہ ملتا ہے، یا اس بات کا لالچ ہوتا ہے کہ میرا بچہ دوسرے کی منھ بولی اولاد بن کر اس کے مرنے کے بعد زیادہ سرمایہ اور جائیداد کا مالک بن جائے گا، متبنیٰ کو قانونی شکل دینے کے بعد وہی لاولد جوڑے مصنوعی طور پر صاحب اولاد بن سکتے ہیں جو صاحبِ ثروت ہوں، معاشی طور پر مستحکم ہوں، اس طرح ان لاولد جوڑوں کا احساسِ محرومی بڑھ جاتا ہے جو معاشی طور پر کمزور ہوتے ہیں، نہ وہ متبنیٰ کی بھاری قیمت ادا کرسکتے ہیں نہ ان کے پاس لمبی جائداد اور سرمایہ ہے کہ اس کا لالچ دلا کر دوسروں کے بچوں کو اسیر دام کرلیں۔

بچوں کی تجارت

دورِ حاضر میں لے پالک (متبنیٰ) کو قانونی شکل دینے کی وجہ سے بچوں کی خرید وفروخت کا سلسلہ قائم ہوگیا ہے، ملکی اور بین الاقوامی مارکیٹ کھل گئے، مالدار ممالک کے بے اولاد جوڑے غریب ممالک سے تندرست اور توانا بچے خرید کرلے جاتے ہیں، اس پیشہ کی دلالی کرنے والوں کی بن آئی ہے، عالمی پیمانے پر بچوں کا کاروبار ہونے لگا ہے، انسانیت کی اس سے زیادہ گراوٹ کیا ہوگی کہ مرغی کے چوزوں کی طرح انسانی بچوں کی خرید وفروخت ہونے لگی ہے، بہت سی عورتوں نے یہ پیشہ اختیار کرلیا ہے کہ سالانہ بچے پیدا کرکے بڑی قیمت پر مالدار لاولد جوڑوں کے ہاتھ فروخت کردیں، اس سلسلہ کی چند شرمناک خبریں عبرت کے لئے پڑھئے:

مولانا سلطان اصلاحی لکھتے ہیں:

''بچوں کی درآمد نے یورپ میں بچوں کے مستقل کاروبار کی شکل اختیار کرلی ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو'' سہ روزہ دعوت نئی دہلی'' یکم دسمبر ۱۹۸۸ء جائزہ بعنوان'' متبنیٰ ہندوستانی بچے اور غیر ملکی سرپرست'' اٹلی کا ایک

گارڈن ''انٹی مو'' بچوں کے اس طرح کے کاروبار کا سب سے بڑا اور مشہور مرکز ہے، جہاں خوبصورت، تندرست بچوں کی خرید وفروخت کے علاوہ خوبصورت، تندرست حاملہ عورتوں کو پیشگی رقم دے کر یہ معاہدہ بھی کیا جاتا ہے کہ مستقبل میں ہونے والا بچہ پیشگی رقم دینے والے کے سپرد کیا جائے گا، اٹلی کے گوشے گوشے سے بے اولاد والدین اس بازار میں اکٹھا ہوتے ہیں، جہاں ایک بچہ کی نیلامی کی قیمت کم از کم پانچ لاکھ لیرا (ہندوستانی چالیس ہزار روپیہ) سے لے کر بارہ لاکھ لیرا (تقریباً ایک لاکھ روپیہ) تک ہوتی ہے، محتاط اندازے کے مطابق اس منڈی میں سالانہ کم از کم ۵۰۰ بچوں کی نیلامی ہوتی ہے، اٹلی میں یہ کاروبار اس قدر بڑھ گیا ہے کہ دولت کمانے کی لالچ میں کچھ عورتیں ہر سال حاملہ ہو رہی ہیں، اور ہر سال ایک بچہ کو پیشگی بیچ رہی ہیں، امریکہ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں گود لینے کا جو رجحان بڑھ رہا ہے اس کے نتیجے میں بے اولاد جوڑوں کے جذبات جگا کر بیوپاری لوگ چاندی لوٹتے ہیں، ایک اندازے کے مطابق گذشتہ سال صرف امریکا میں ۲۴۰ جوڑوں نے قانونی یا غیر قانونی طریقے سے بچوں کو گود لیا، ملاحظہ ہو پندرہ روزہ تعمیر حیات، ندوۃ العلماء لکھنؤ ۲۵ر دسمبر ۱۹۸۸ء، رپورٹ بعنوان: مجھے جنم دینے سے پہلے بیچ دیا گیا، تازہ اطلاعات کے مطابق طویل خانہ جنگی کا شکار لبنان بھی بے اولاد مغربی جوڑوں کے نام پر لبنانی دلالوں اور جعلبازوں ڈاکٹروں اور وکیلوں کی سازش سے باقاعدہ ان کی تجارت ہو رہی ہے، گود لینے کا خواہش مند مغربی جوڑا مختلف شکل وشباہت کے اعتبار سے ایک لبنانی بچے کی پانچ ہزار سے پندرہ ہزار ڈالر تک قیمت ادا کرتا ہے، اس کاروبار میں صرف اس سال کے اوائل سے اب تک تقریباً چھ سو لبنانی بچوں کو غیر ملکیوں نے گود لیا، جن میں سے کم سے کم پانچ سو غیر ملکی جوڑوں کو لبنانی

دلالوں کے توسط سے غیر قانونی طور پر فروخت کر دیئے گئے، بحوالہ قومی آواز نئی دہلی ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۹ء خبر بعنوان: لبنان بے اولاد جوڑوں کا ''سپر بازار'' مغربی ممالک میں اس مقصد سے ایشیا لاطینی امریکہ اور مشرقی یورپ کے مختلف ملکوں سے بچوں کی درآمد اور خرید وفروخت کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مضمون ''مغربی ممالک میں بچوں کی درآمد کا رجحان'' تلخیص کردہ از جناب سید خورشید عالم، سہ روزہ دعوت نئی دہلی ۱۶ر دسمبر ۱۹۹۱ء۔'' (اسلام کا نظریۂ جنس، مولانا سلطان احمد اصلاحی، ص ۲۷۵- ۲۷۶، پہلا ایڈیشن ۱۹۹۴ء)

مختلف ممالک میں لے پالک کو قانونی حیثیت دینے سے بچوں کی خرید وفروخت کو فروغ ہوا، غریبوں کی غربت کا بدترین استحصال ہوا، اور عموماً لے پالک بچے ان جوڑوں کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکے جنہوں نے ان بچوں کو گود لیا، لے پالک بچہ باشعور ہونے کے باوجود اپنے والدین اور خاندان سے جدائی اور محرومی کے احساس کی بنا پر اپنے کو اس طوطے کی طرح محسوس کرتا ہے جسے گلستان سے پکڑ کر سونے کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو، وہ کٹی پتنگ کی طرح ہو جاتا ہے، مصنوعی والدین کے لئے اکثر اس کے دل میں محبت کے بجائے نفرت وحقارت کے جذبات ہوتے ہیں، وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ یہ بناوٹی ماں باپ جلد از جلد رخصت ہوں، تاکہ ان کا سرمایہ اور جائداد اس کی ملکیت اور قبضہ میں آئے، اور اپنے حقیقی والدین کے بارے میں اس کے دل میں یہ خیال بیٹھ جاتا ہے کہ انہوں نے مجھے دوسروں کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔

قانونی طور پر گود لیئے ہوئے بچے عموماً گود لینے والے جوڑوں کے احساس بے اولادی کا مداوا نہیں بن پاتے، بلکہ ان کے مسائل ومصائب میں اضافہ کرتے ہیں، ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے محروم ہو کر وہ بچے نفسیاتی الجھنوں کے شکار ہو جاتے ہیں، ان کا چڑچڑا پن، غم وغصہ گھر کے ماحول کو کشیدہ اور سوگوار بنا دیتا ہے، چند سالوں سے امریکہ

ویورپ میں گود لیے ہوئے بچوں کے بارے میں جو جائزے آرہے ہیں وہ قانون تبنیت کے حامیوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں۔

کیا قانونِ تبنیت بچوں کی مشکلات کا حل ہے

قانونِ تبنیت کی تائید میں پیش کردہ دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ قانونِ تبنیت لاوارث، یتیم اور نادار بچوں کے مسئلہ کا حل نہیں بلکہ ان کی لاچاری اور مجبوری کا بدترین استحصال ہے، اس قانون کی وجہ سے آم کے پودوں کی طرح انسانی بچے فروخت ہونے لگے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مغربی کلچر اور مغربی قوانین کے فروغ سے سب سے زیادہ بچوں کے حقوق ومفادات پامال ہوئے ہیں، ننھے منے بچے ہمارے سماج کا سب سے کمزور عنصر ہیں، انہیں نہ اپنے حقوق کا شعور ہے نہ اس کے لئے وہ ایجی ٹیشن اور مظاہرے کرسکتے ہیں، اس لئے دور حاضر کے انسانی قوانین میں ان کے حقوق کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی قانون تبنیت بھی ہے۔

سوال یہ ہے کہ لاوارث بچوں کی تعداد روز بروز کیوں بڑھتی جارہی ہے، لاوارث بچے جن مرد عورتوں کی ہوس رانیوں کا ثمرہ ہیں وہ اتنے سفاک اور سنگدل کیوں ہوگئے کہ نوزائیدہ معصوم بچوں کو سنسان جگہوں پر چپکے سے چھوڑ کر کیوں چلے جاتے ہیں، مغربی تہذیب نے عریانیت، فحاشی، جنسی اباحیت کا ایسا مزاج پیدا کردیا ہے کہ مغرب زدہ نوجوان مرد اور عورتیں نکاح وازدواج کی پابندیوں سے گریزاں ہیں، جنسی عمل کے بعد اپنے نتیجہ وعمل کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں، نئی نسل کی آمد کو روکنے یا انہیں فنا کے گھاٹ اتارنے کے لئے تمام طبی تجربات استعمال کیے جارہے ہیں، مانعِ حمل ادویہ کا کثرت سے رواج ہورہا ہے، ان کے پرچار کے لئے سارے ذرائع استعمال کئے جارہے ہیں، استقرار حمل ہونے کے بعد اسقاط کی وحشیانہ تدبیریں کی جاتی ہیں، ماں کی کوکھ میں پناہ لیے ہوئے بچے کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے، اور اس کام کے لئے بڑی سے بڑی فیس دے

کر ماہر ڈاکٹرس کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، اور جو بچے ان مراحل سے بچ بچا کر صحیح سالم رحم مادر سے باہر آجاتے ہیں، انہیں کسی سنسان جگہ لاوارث بنا کر ڈال دیا جاتا ہے، اور پھر ہمدردی جتا کر انہیں قانون تبنیت کی آڑ میں نیلام کی منڈی میں پیش کیا جاتا ہے، اس صورت حال کا اصل علاج یہ ہے کہ ان اسباب پر کنٹرول کیا جائے جن کے نتیجے میں لاوارث بچوں کی تعداد روز افزوں ہے۔

یتیم ونادار بچوں کے مسئلہ کا حل بھی یہ نہیں ہے کہ انہیں ان کے گھر اور خاندان سے کاٹ کر ان کی یتیمی اور ناداری کا استحصال کیا جائے، بلکہ انہیں ان کے گھر اور خاندان کا فرد رکھتے ہوئے ان کی کفالت اور پرورش وپرداخت کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں اسلام نے تفصیلی احکام دیئے ہیں اور یتیم ونادار بچوں کی کفالت اور پرورش کا ایسا نظام پیش کیا ہے کہ یہ بچے اپنے گھر اور خاندان میں رہتے ہوئے سماج میں باعزت مقام پاسکیں، ان کی کفالت کا معقول انتظام ہوجائے۔

(ماہنامہ الفرقان، فروری تا اپریل ۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆

نفقۂ مطلقہ کے بارے میں
پروفیسر مشیر الحق صاحب کے مقالہ کاجائزہ

نفقۂ مطلقہ کے بارے میں
پروفیسر مشیر الحق صاحب کے مقالہ کا جائزہ

ہفت روزہ نئی دنیا نے ۲۹/اکتوبر ۱۹۸۵ء کے شمارہ میں نادار مطلقہ کے نان ونفقہ اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ سے متعلق پروفیسر مشیر الحق کا مقالہ شائع کیا ہے مشیر الحق صاحب نے اس مقالہ میں بعض نئی بحثیں اٹھائی ہیں، اور بعض نئی تجویزیں پیش کی ہیں اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون میں مشیر الحق صاحب کے مقالہ کا تحقیقی اور منصفانہ جائزہ پیش کیا جائے۔

مشیر الحق صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مطالعات اسلامی کے پروفیسر ہیں، عارف محمد خاں نے اپنے پارلیمانی بیان میں بعض باتیں مشیر الحق صاحب کے حوالہ سے ذکر کی تھیں، اس لئے کچھ لوگوں نے محسوس کیا کہ غالباً عارف محمد صاحب کے بیان کی تیاری میں مشیر الحق صاحب کا مشورہ کا بھی دخل ہے، بہرصورت نئی دنیا کے اس تازہ مقالہ میں اصل مسئلہ سے متعلق مشیر صاحب کے خیالات بڑی وضاحت سے آگئے ہیں، جائزہ شروع کرنے سے پہلے آیئے ان کے مقالہ کے مرکزی خیالات کو مختصر طور پر پیش کردیا جائے۔

مقالہ کا خلاصہ

مقالہ کے ابتدائی حصہ میں انہوں نے زیر بحث مسئلہ میں علماء کا موقف بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے، اس کے بعد دو تین پیراگراف میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی

ہے کہ عدت گذرنے کے بعد نادار مطلقہ کو نان نفقہ دلانے کا مسئلہ منصوص نہیں ہے، یعنی عدت کے بعد شوہر کے ذمہ نفقہ لازم ہونے یا نہ ہونے کی کوئی صراحت قرآن یا حدیث میں موجود نہیں، لہذا یہ مسئلہ قیاسی اور اجتہادی ہے، اس کے بعد مشیر صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے ''اس سلسلہ میں ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا کوئی ایسی بنیاد موجود ہے، جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ عدت گذر جانے کے بعد بھی بعض مخصوص حالات میں نان ونفقہ کی ذمہ داری سابق شوہر پر لازمی قرار دی جاسکتی ہے؟'' یہ سوال اٹھا کر انہوں نے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی کتاب ''المرأۃ بین الفقہ والقانون'' کے حوالہ سے ''طلاق المریض'' پر قیاس کرتے ہوئے عدت کے بعد مطلقہ بیوی کو سابق شوہر سے نفقہ دلوانے کا جواز فراہم کرنا چاہا ہے، اور اس کے لئے متعۂ طلاق کو بنیاد بنایا ہے۔

زیر بحث مسئلہ قیاسی نہیں بلکہ منصوص ہے

پروفیسر مشیر الحق صاحب کی تجویز وقیاس کے بارے میں پہلی بات تو یہ عرض ہے کہ عدت گذر جانے کے بعد مطلقہ کو نفقہ دینے یا نہ دینے کا مسئلہ قیاسی ہے ہی نہیں، اصول فقہ کی تمام کتابوں میں یہ اصول بڑی وضاحت وصراحت سے موجود ہے کہ کسی مسئلہ میں قیاس واستنباط کرنے کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حکم مذکور ہے، تو کسی بڑے سے بڑے امام ومجتہد کو بھی قیاس واستنباط کرنے کی اجازت نہیں، قرآن وحدیث کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کو اس سے روگردانی کرنے اور قیاس واستنباط کرنے کی جرأت نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمراً أن يكون لهم الخيرة من أمرهم ومن يعصى الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا﴾ [سورۂ أحزاب:۳۶]

''اور کسی مؤمن یا مؤمنہ کے لئے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ

کسی امر کا حکم دیدیں تو پھر ان کو اپنے (اس) امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔''

عقلی اعتبار سے سب سے زیادہ ہمدردی اور نان ونفقہ کی مستحق وہ نادار مطلقہ عورت ہوتی ہے جو حمل کی حالت میں ہو، کیونکہ حمل کے آخری ایام میں اور بچہ پیدا ہونے کے بعد کم از کم چند مہینوں تک وہ عورت کوئی کام کرنے کے لائق نہیں ہوتی، محنت مزدوری کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتی، لیکن حاملہ مطلقہ عورت کے سلسلہ میں قرآن نے بڑا واضح حکم دیا:

﴿وإن كن أولات حمل فانفقوا عليهن حتى يضعن حملهن﴾ [طلاق:۶]

''اور اگر حمل والیاں ہوں تو انہیں خرچ دیتے رہو اور ان کے حمل کے پیدا ہونے تک''۔

اس آیت میں لفظ ''حتی'' کا استعمال کیا گیا ہے، جو اس سے پہلے مذکور حکم کو خاص مدت تک محدود کرنے کے لئے آتا ہے، یعنی یہ بتانے کے لئے آتا ہے کہ حتی سے پہلے جو حکم دیا گیا ہے وہ حتی کے بعد ذکر شدہ وقت پر ختم ہوجاتا ہے، مشیر الحق صاحب بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ''حتی'' انگریزی میں ''TILL'' یا ''UNTILL'' کے ہم معنی ہے، حتی کا یہ معنی تمام فقہاء ومجتہدین اور ائمہ لغت کے یہاں متفق علیہ ہے، اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں، سورۂ طلاق کی آیت نمبر ۶ میں تمام مطلقہ حاملہ عورتوں کے بارے میں خواہ خود کفیل ہوں یا نادار اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ شوہر کے ذمہ انہیں نان ونفقہ دینے کی ذمہ داری صرف زمانۂ حمل تک رہتی ہے، جو ان کی عدت کا زمانہ ہے، ولادت ہوتے ہی ان کے نان ونفقہ کی ذمہ داری شوہر سے ختم ہوجاتی ہے، لہذا حاملہ مطلقہ کی عدت ختم ہونے کے بعد بھی دوسرے نکاح تک اس کا نان ونفقہ سابق شوہر پر عائد کرنا قرآن کی واضح خلاف ورزی ہے۔

اس بات کو آسان طریقہ پر یوں سمجھئے کہ دفعہ ۱۲۵ میں نادار مطلقہ کو سابق شوہر سے نفقہ دلانے کی حد بندی ان الفاظ میں کی گئی ہے، Till She Remarriages جس کا

مطلب یہ ہے کہ جب تک مطلقہ عورت دوسرا نکاح نہیں کر لیتی وہ سابق شوہر کی بیوی شمار کی جائے گی اور نادار ہونے کی صورت میں اسے سابق شوہر سے نفقہ پانے کا حق ہوگا، دفعہ ۱۲۵ کے مذکورہ بالا حصہ کا معمولی لکھا پڑھا شخص بھی یہی مطلب سمجھتا ہے کہ دوسرا نکاح کر لینے کے بعد مطلقہ عورت اس دفعہ کی رو سے سابق شوہر سے نفقہ پانے کی مستحق نہیں ہے، اور سابق شوہر پر قانوناً نکاح ثانی کے بعد مطلقہ عورت کے نفقہ کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاسکتی ہے، قانون میں اس حد بندی کے باوجود اگر کوئی عدالت نادار مطلقہ کو دوسرا نکاح کرنے کے بعد بھی سابق شوہر سے نان ونفقہ دلوائے تو ہر شخص اسے دفعہ ۱۲۵ کی خلاف ورزی تصور کرے گا، بالکل یہی صورت حال مطلقہ حاملہ کے بارے میں سورہ طلاق کی آیت ۶ کی ہے، قرآن نے بلا کسی قید وشرط تمام حمل والی مطلقہ عورتوں کے نان ونفقہ کی ذمہ داری ولادت تک محدود کر دی، لہذا ولادت کے بعد بھی سابق شوہر پر نان ونفقہ کی ذمہ داری ڈالنا قرآن کی صریح خلاف ورزی ہے۔

جب حمل والی مطلقہ عورت کو عدت گذر جانے کے بعد قرآن کی روشنی میں سابق شوہر سے نان ونفقہ نہیں دلایا جاسکتا، حالانکہ ولادت کے بعد وہ زیادہ معذور ومجبور ہو جاتی ہے، تو غیر حاملہ مطلقہ عورت کو عدت کے بعد نفقہ دلانے کا نہ شرعاً سوال پیدا ہوتا ہے نہ عقلا، غیر حاملہ مطلقہ بائنہ کو شوہر سے نفقہ دلانے کا قرآن میں صراحۃً کوئی ذکر نہیں ہے، اس لئے بہت سے ائمۂ اسلام نے فرمایا کہ غیر حاملہ مطلقہ بائنہ زمانۂ عدت میں بھی طلاق دینے والے شوہر سے نفقہ پانے کا قانونی حق نہیں رکھتی، لیکن امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے فقہاء نے قرآنی اشارات اور بعض روایات کی روشنی میں غیر حاملہ مطلقہ بائنہ کو زمانۂ عدت میں نان ونفقہ پانے کا مستحق قرار دیا ہے۔

ایک مغالطہ

سورۂ طلاق کی آیت ۶ کے تعلق سے جس کی مختصر وضاحت ہم نے اوپر کی، پروفیسر

مشیر الحق نے اپنے مقالہ میں دانستہ یا نادانستہ کچھ مغالطہ انگیزی سے کام لیا ہے اس لئے آیئے اس کا بھی جائزہ لیتے چلیں، لکھتے ہیں:

> ''چونکہ اس آیت میں وضاحت سے کہا گیا ہے کہ وضعِ حمل تک نان ونفقہ کی ذمہ داری ہے، اس لئے بالعموم اس کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس کے بعد کی مدت کا اضافہ خلاف شریعت ہوگا، عربی کے لفظ حتی انگریزی ''TILL'' یا ''UNTILL'' کے ہم معنی ہے، یہ لفظ دو صورتوں کے درمیان حد فاصل کا کام کرتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اگر کوئی بات بنفسہ ممنوع ہو، لیکن کسی خاص وقت تک کے لئے اس کی اجازت دی جائے تو اس صورت میں وہ حکم جواز اتنے ہی وقت تک کے لئے محدود ہوگا.....لیکن وضعِ حمل کے سلسلہ میں جو قرآن پاک کی آیت ہے اس میں کسی ممنوع بات کو ایک متعین وقت کے لئے جائز نہیں قرار دیا گیا ہے، بلکہ جو بات بذاتہ جائز ہے اس کے بارے میں ایک خاص حالت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک حکم دیا گیا ہے کہ اس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وضعِ حمل تک تو نفقہ دینا لازمی ہے اور اس کے بعد ممنوع ہے۔''

مغالطہ کا ازالہ

اس عبارت میں مشیر صاحب نے سلجھے ہوئے مسئلہ کو الجھانا چاہا ہے، حتی کے بارے میں مشیر صاحب اتنی بات تسلیم کرتے ہیں یہ پہلے والے حکم کو ایک خاص وقت تک محدود کرنے کے لئے آتا ہے، اگر حتی سے پہلے کسی چیز کا وجوب بیان کیا گیا ہے تو حتی کے بعد بیان کردہ مدت پر وجوب ختم ہو جائے گا، اگر حتی سے پہلے کسی کام کی حرمت بیان کی گئی ہے تو حتی کے بعد حرمت کا حکم ختم ہوگا ئے گا، اگر کسی چیز کا جواز حتی سے پہلے مذکور ہے تو حتی پر جواز ختم ہو جائے گا، زیر بحث آیت میں حتی سے قبل انفاق کا وجوب بیان کیا گیا ہے کہ مطلقہ حاملہ کا

نفقہ دینا شوہر پر واجب ہے پھر حتی کے بعد وضع حمل کا ذکر ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ولادت کے بعد شوہر کے ذریعہ نفقہ واجب نہیں رہتا ہے، اس موقع پر یہ کہنا کہ ''قرآن نے وضعِ حمل کے بعد نفقہ دینے سے کہاں منع کیا ہے'' بالکل غیر معقول بات ہے، فقہاء وعلماء نے کب کہا کہ عدت کے بعد سابق شوہر کے لئے نفقہ دینا ممنوع یا حرام ہے؟ سابق شوہر اپنی مرضی سے اس مطلقہ عورت کو عدت گذرنے کے بعد ہی نہیں، بلکہ نکاح ثانی کرنے کے بعد بھی دے سکتا ہے، اگر وہ عورت نادار ہے تو سابق شوہر کو اس کا اجر بھی ان شاء اللہ ملے گا، یہ چیز سابق شوہر ہی تک محدود نہیں، بلکہ مشیر الحق صاحب یا کوئی بھی صاحب خیر اگر نادار مطلقہ عورتوں کی کفالت کریں تو بڑے ثواب کی بات ہے، علماء کا کہنا صرف اتنا ہے کہ قرآن نے جب زمانۂ عدت تک نفقہ کا وجوب محدود کر دیا ہے تو عدت گذرنے کے بعد بھی سابق شوہر پر نفقہ لازم کرنا قرآن کی خلاف ورزی اور اسلام کے ایک متفقہ مسئلہ میں مداخلت ہے۔

ایک سنگین اور خطرناک بات

مشیر الحق صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس میں سب سے زیادہ سنگین ان کا یہ جملہ ہے:

> ''بلکہ جو بات بذاتہ جائز ہے اس کے بارے میں ایک خاص حالت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک حکم دیا گیا ہے۔''

سورۂ طلاق کی آیت ۶ کے الفاظ میں تو عموم ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مطلقہ حاملہ عورتوں کے لئے تمام حالات میں یہی حکم شرعی ہے، لیکن مشیر صاحب لکھتے ہیں کہ آیت میں مطلقہ حاملہ کے بارے میں ایک خاص حالت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک حکم دیا گیا ہے، اس ایک خاص حالت کی وضاحت نہ تو ہمیں قرآن میں کہیں ملتی ہے نہ کسی حدیث میں، مشیر صاحب ہی اس کی وضاحت کر سکتے، چنانچہ مقالہ کے ایک دوسرے ٹکڑے میں انہوں نے اس کی وضاحت کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''صدر اول کے اسلامی سماج کے بارے میں ہم اتنا جانتے ہیں کہ ان کے یہاں بیواؤں اور طلاق شدہ عورتوں کی دوسری شادی کوئی مسئلہ نہیں تھی، بہ ظاہر ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عدت سے نکلنے کے بعد عورتوں کی دوسری شادیاں ہو جاتی تھیں، بلکہ قرآن کی ایک آیت سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ دوران عدت ہی اپنا پیغام دینے لگتے تھے، جسے قرآن نے منع کیا، ایسی صورت میں یہ کہنا بالکل ہی بے بنیاد نہ ہوگا کہ اس وقت عدت کے بعد کے نان ونفقہ کا مسئلہ شائد پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔''

مشیر صاحب کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صدر اول کے اسلامی سماج میں چونکہ عدت کے بعد فوراً نکاح ہو جاتا تھا اس خاص سماج کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مطلقہ حاملہ کا نفقہ عدت کی مدت تک محدود کر دیا تھا، اور آج کل چونکہ وہ خاص حالت باقی نہیں ہے، عدت کے بعد مطلقہ عورتوں کا نکاح عموماً نہیں ہو پاتا، اس میں غیر معمولی تاخیر ہوتی ہے، لہذا اب نفقہ کا وجوب زمانۂ عدت تک محدود نہیں ہونا چاہئے، خصوصاً اس وقت جب کہ شوہر نے بلا وجہ طلاق دی ہو۔

میرا خیال ہے کہ مشیر صاحب نے قلم کی جولانی وروانی میں اتنی سنگین بات لکھ دی، جس کے مضمرات اور اثرات کا اندازہ وہ خود نہیں لگا سکتے، قرآن وسنت کے کسی عام حکم میں تخصیص یا تبدیلی قرآن وسنت ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے، قیاس آرائی کے بل پر قرآن وسنت کے حکم میں تبدیلی یا تخصیص الحاد کے سوا کچھ نہیں، اگر اس کی اجازت دے دی گئی تو اسلام کی شکل بگڑ کر رہ جائے گی، مثلاً ایک آدمی کہہ سکتا ہے کہ زنا اور بدکاری کی حرمت کا حکم صدر اول کے اسلامی سماج کو پیش نظر رکھ کر دیا گیا تھا، جب کہ نکاح کرنا انتہائی سہل تھا، اس دور میں چونکہ نکاح بڑا مشکل اور گراں ہو گیا ہے، اس لئے زنا کی حرمت موجودہ سماج کے لئے نہیں ہے، یہ اسی قسم کی بات ہے جو مستشرقین کی طرف سے بار بار دہرائی جاتی رہی کہ قرآن وسنت کے احکام چھٹی صدی عیسوی کے عرب معاشرہ کے لئے تھے، اب چونکہ انسانی اقدار اور سماجی ڈھانچہ بالکل تبدیل ہو چکا، لہذا وہ احکام اس دور میں قابل تنفیذ نہیں، اور موجودہ حالات کا

ساتھ نہیں دے سکتے۔

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں

عام معاشرہ میں غیر اسلامی رسم ورواج اور نظریات کے فروغ پاجانے کی وجہ سے اگر قرآن وسنت کے کسی حکم پر عمل کرنا بڑا دشوار ہورہا ہو تو قرآن وسنت کے حکم کو نہیں بدلا جائے گا، بلکہ مسلم معاشرہ میں تبدیلی لانے کی کوشش ضروری ہوگی، غیر اسلامی رسوم ونظریات کی بیخ کنی کرکے خالص اسلامی معاشرہ برپا کرنا پڑے گا، خواہ اس کے لئے کتنی ہی جدوجہد اور قربانی کرنی پڑے، تاکہ اسلامی احکام پر عمل کرنا بالکل آسان ہوجائے، آج کل مسلم سماج میں نکاح وطلاق اور معاشرت کے تعلق سے بے شمار ناجائز رسمیں داخل ہوگئی ہیں، شادی کی بیہودہ رسموں، جہیز اور تلک کی لعنت اور طلاق کے بارے میں غیر اسلامی نظریہ کی بنا پر عدت کے بعد مطلقہ کا نکاح واقعی دشوار ہوگیا ہے، لیکن ان حالات کا بہانہ کرکے حکم قرآنی بدلنے کی کوشش بڑی بدبختانہ اور ملحدانہ ہے، قرآن کا حکم بدلنے کے بجائے ہمیں مسلم معاشرہ میں تبدیلی لانا چاہئے، اور صحیح مسلم معاشرہ کی تشکیل کرنی چاہئے۔

کیا نادار مطلقہ کا مسئلہ نیا ہے؟

صدر اول کے اسلامی سماج کے بارے میں یہ سمجھنا کہ ''اس وقت عدت کے بعد نان ونفقہ کا مسئلہ شاید پیدا ہی نہیں ہوتا تھا'' ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے، تاریخ کے کسی دور کے بہتر دور یا صالح دور ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ اس میں برائیوں کا نام ونشان نہیں تھا، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس دور میں بھلائی غالب تھی، برائیوں کا زور کم تھا، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین کے زمانے میں بھی برائیاں اور جرائم ہوتے تھے، اسی لئے اسلامی حدود وتعزیرات اور قاضی وعدالت کی ضرورت پڑتی تھی، اس دور میں بھی نادار مطلقہ کے نان ونفقہ کا مسئلہ پیش آتا تھا، لیکن ان ادوار میں چونکہ اسلام کے نفقہ سے متعلق احکام عملاً رائج تھے، جس کی رو سے ایسی نادار مطلقہ کا نان ونفقہ اس کی اولاد، والدین اور خونی رشتہ داروں پر واجب ہے، اس

لئے ایسی نادار مطلقہ کو عدالت میں جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی، بلکہ عموماً اس کی اولاد، والدین اور رشتہ دار اپنا مذہبی فریضہ اور کار ثواب سمجھ کر خوشی خوشی اس کی کفالت کرتے تھے۔

نادار مطلقہ کا مسئلہ حدیث اور فقہ میں

ذخیرۂ احادیث پر نظر ڈالنے سے ہمارے اس دعوی کی تصدیق ہوتی ہے، ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے اپنی اس لڑکی پر خرچ کرنے کو بہترین بھلائی اور افضل ترین صدقہ قرار دیا ہے جو طلاق ہوجانے یا شوہر کی وفات کی بنا پر بے سہارا ہوگئی۔

''ألا أدلك على أعظم الصدقة ابنتك مردودة إليك ليس لها كاسب غيرك۔'' [مسند امام احمد عن سراقۃ بن مالک، حدیث: ۱۷۷۲۹، ابن ماجہ، حدیث: ۳۶۶۷]

''کیا میں تمہیں سب سے عظیم بھلائی کے بارے میں رہنمائی نہ کروں، تمہاری وہ بیٹی جو تمہاری طرف لوٹا دی گئی، اور تمہارے سوا اس کے لئے کوئی کمانے والا نہیں۔''

اسی تعلیم نبوت پر عمل کرتے ہوئے حضرت زبیر بن العوامؓ نے اپنی طلاق شدہ صاحبزادیوں کے لئے کچھ گھر وقف کردیے تھے۔

فقہاء کرام نے بھی نادار مطلقہ عورتوں کے نان ونفقہ سے بحث کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نادار مطلقہ کے گذر بسر کا مسئلہ ہر زمانہ میں پیش آتا تھا، چھٹی صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ قاضی خاں اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں:

> ''اگر چھوٹے بچے کی ماں طلاق ہوجانے کی وجہ سے نفقہ کی ضرورت مند ہوگئی، تو اسے اپنے اولاد کی کمائی سے کھانے کا حق ہے، خواہ اولاد چھوٹی ہو یا بڑی۔'' (فتاوی قاضی خاں، ج۱، ص۴۴۷)

آٹھویں صدی ہجری کے مایۂ ناز فقیہ ومحقق ابن ہمام لکھتے ہیں:

> ''باپ پر اس کی لڑکیوں کا نفقہ اس وقت تک ہے جب تک ان کا نکاح نہ ہوجائے..... جب لڑکی کو طلاق ہوجائے، اور اس کی عدت پوری ہوجائے تو

اس کا نفقہ دوبارہ باپ پر عائد ہوگا۔‘‘ (فتح القدیر، ج ۳، ص ۲۳۴)

ایک بات جو بار بار دہرائی جاتی ہے

اس سلسلہ میں ایک بات سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے مؤیدین کی طرف سے بار بار کہی جاتی رہی ہے، مشیر الحق صاحب نے بھی اسے دہرایا ہے کہ قرآن کی کس آیت اور کس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عدت کے بعد نفقہ دلوانا ممنوع ہے؟ لکھتے ہیں:

’’یہ صحیح ہے کہ شریعت میں ہمیں عدت کے بعد مطلقہ کو نان ونفقہ دلانے کے سلسلہ میں کوئی حکم نہیں ملتا، مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی درست ہے کہ قرآن یا حدیث یا فقہ میں کوئی واضح ممانعت بھی نہیں ملتی۔‘‘

اس قسم کی بات فقہ وقانون سے بے بہرہ انسان ہی کے لئے زیب دے سکتی ہے، کسی کے ذمہ دوسرے کا نفقہ لازم کرنے والے کو دلیل دینی پڑتی ہے، انکار کرنے والے کو نہیں، مشیر صاحب نے فقہ اسلامی کا یہ اصول بار بار پڑھا ہوگا ’’**البینة علی من ادعی والیمین علی من أنکر**‘‘ (دعوی کرنے والے کے ذمہ ثبوت پیش کرنا ہے اور انکار کرنے والے کے ذمہ حلفیہ بیان دینا ہے) اس کی روشنی میں یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہوسکتا ہے، فرض کیجئے زید نے عدالت میں دعوی کیا کہ میرا نفقہ عمر کے ذمہ لازم ہے تو جج زید سے کہے گا کہ بتاؤ کس دفعہ کی رو سے تمہارا نفقہ عمر پر لازم ہے، وہ دفعہ میرے سامنے پیش کرو، عمر سے نہیں کہے گا کہ بتاؤ کس دفعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تم پر زید کا نفقہ واجب نہیں، اسی طرح جو لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ عدت گذرنے کے بعد بھی اسلامی عائلی قانون کی رو سے بعض حالات میں سابق شوہر پر مطلقہ کا نان ونفقہ واجب ہوتا ہے، انہیں اس کے لئے قرآن وسنت اور فقہ اسلامی سے ثبوت پیش کرنا چاہئے، جو حضرات عدت تک نفقہ کا وجوب محدود کرتے ہیں ان کے لئے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ چونکہ قرآن وسنت نے عدت تک نفقہ کو محدود کیا ہے، اس لئے عدت کے بعد سابق شوہر پر نفقہ عائد نہیں کیا جاسکتا۔

اوپر ذکر کردہ تفصیل سے معلوم ہو چکا ہے کہ زمانۂ عدت کے بعد مطلقہ کو نان ونفقہ دلانے کا مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ جس کے بارے میں قرآن وحدیث خاموش ہوں چونکہ قرآن میں واضح آیت موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ عدت کے بعد سابق شوہر پر نان ونفقہ واجب نہیں رہتا، اس لئے اب اس مسئلہ میں قیاس واستنباط کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے، لہذا غیر شرعی قیاس کا سہارا لے کر مشیر الحق صاحب نے زیر بحث مسئلہ پر جو قیاس آرائیاں کی ہیں، ان پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں، پھر بھی آیئے اس دلچسپ قیاس پر ایک نظر ڈال لیں۔

قیاس کا تجزیہ

مشیر الحق صاحب کے دلچسپ قیاس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک شوہر مرض الموت میں مبتلا ہونے کے بعد بیوی کو اس کی رضامندی کے بغیر طلاق بائنہ دے تو امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک وہ مطلقہ بیوی طلاق دینے والے کے ترکہ میں میراث کی مستحق ہوتی ہے بہ شرطیکہ اس نے دوسرا نکاح نہ کرلیا ہو، خواہ شوہر کا انتقال مطلقہ عورت کی عدت گذرنے کے بعد ہوا ہو، اور امام مالکؒ کا مسلک تو یہ ہے کہ اگر اس طلاق شدہ بیوی نے دوسرا نکاح کرلیا ہو تو بھی اسے سابق شوہر کے ترکہ میں میراث ملیگی، میراث دلوانے کی وجہ یہ ہے کہ پہلے شوہر نے چونکہ اسے وراثت سے محروم کردینے کی نیت سے مرض الموت میں طلاق دی، اس لئے اس کی سزا یہ ہے کہ اس کے مال میں مطلقہ کو وراثت دلائی جائے، خلاصہ یہ ہے کہ شوہر کے مرض الموت میں طلاق پائی ہوئی عورت عدت گذر جانے کے بعد بھی امام احمد بن حنبلؒ اور امام ملک کے نزدیک وراثت کے بارے میں اپنے سابق شوہر کی بیوی تسلیم کی جاتی ہے، لہذا اگر اس پر قیاس کرتے ہوئے ہم بلاوجہ طلاق دینے کی صورت میں عدت گذرنے کے بعد بھی مطلقہ بیوی کو نان ونفقہ دیے جانے کے بارے میں سابق شوہر کی ’’بیوی‘‘ قرار دیں، اور شوہر نے چونکہ اسے ظلماً طلاق دی ہے، اس لئے سزا کے طور پر نکاح ثانی تک اس مظلومہ ونادار مطلقہ کا نفقہ ظالم شوہر پر عائد کردیں، تو اس میں کیا شرعی قباحت ہے، زمانۂ عدت کے بعد بعض حالات میں شوہر پر

نفقہ لازم کرنے کے لئے انہوں نے متعہ سے متعلق قرآنی آیت کو بنیاد بنانا چاہا ہے۔

اس قیاس کا دلچسپ پہلو

اس قیاس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ امام احمد اور امام مالک نے مطلقہ کے نفقہ کے سلسلہ میں جو واضح رائے دی ہے اسے بالکل نظر انداز کر کے سباعی صاحب اور مشیر صاحب ایک دوسرے غیر متعلق مسئلہ میں ان کے مسلک کا سہارا لے کر قیاس واستنباط کر رہے ہیں، امام مالک اور امام احمد کے نزدیک جو مطلقہ بائنہ حاملہ ہو وہ صرف زمانۂ عدت تک شوہر کی طرف سے نفقہ کی مستحق ہے، اور جو حاملہ نہ ہو وہ عدت کے زمانہ میں بھی سابق شوہر سے نفقہ پانے کی مستحق نہیں ہے، کتنی دلچسپ بات ہے کہ جو ائمہ غیر حاملہ بائنہ کے لئے زمانۂ عدت میں بھی سابق شوہر سے نفقہ دلوانے کے حق میں نہیں ہیں ان کے ایک غیر متعلق قول کو لے کر عدت گذرنے کے بعد بھی نفقہ لازم کرنے کی بات کی جائے، اس کی مثال بالکل اس طرح ہے جیسے کسی مسئلہ سے متعلق قرآن کی کسی آیت میں واضح حکم دیا گیا ہو، اسے بالکل نظر انداز کر کے ہم ایک غیر متعلق آیت سے کھینچ تان کر اس مسئلہ کا ایک دوسرا حکم ثابت کریں۔

دور قدیم میں ظالمانہ طلاق کے واقعات

یہ باور کرانا کہ ائمہ اربعہ کے دور میں ظالمانہ طلاق کے واقعات بالکل پیش نہیں آتے تھے سادہ لوحی ہے یا فریب کاری؟ بلاوجہ طلاق دینے کے واقعات عہد نبوی، عہد صحابہ اور تمام ادوار میں پیش آتے تھے، ذخیرۂ احادیث اور تاریخ اسلامی پر جس کی نظر ہے اور انسانی نفسیات سے جسے واقفیت ہے، وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔

اگر بلاوجہ طلاق دینے کی صورت میں طلاق دینے والے شوہر پر عدت کے بعد بھی نادار مطلقہ کا نفقہ عائد کرنے کی کوئی گنجائش ہوتی تو ائمہ مجتہدین اور چودہ صدیوں کے فقہاء اسلام اس میں کوتاہی سے کام نہ لیتے، وہ حضرات مظلوم کو انصاف دلانے میں ہم سے کہیں زیادہ سرگرم اور قرآن وسنت کی تعلیمات اور مقاصدِ شریعت سے ہم سے کہیں زیادہ واقف تھے۔

ہمیں اسلام کی پوری تاریخ میں کسی صحابی، مجتہد یا فقیہ کا مسلک نہیں ملتا کہ اس نے کسی حال میں عدت کے بعد بھی مطلقہ کا نفقہ سابق شوہر پر لازم کیا ہو اور امام مالک نیز امام احمد تو غیر حاملہ بائنہ کے لئے زمانہ عدت میں بھی نفقہ کا حق تسلیم نہیں کرتے۔

کتنی غیر منطقی بات ہے کہ ایک طرف ہم تسلیم کریں کہ خلفاء راشدین اور ائمہ مجتہدین کے دور میں بیوی کو میراث سے محروم کرنے کے لئے مرض الموت میں طلاق دینے کے شرمناک واقعات پیش آتے تھے اسی لئے صحابہ کرام اور فقہاء اسلام نے اس ظلم کے تدارک کی صورت نکالی اور امام مالک نے اس مظلومہ کی دادرسی میں یہاں تک کہہ دیا کہ دوسرا نکاح کرنے کے باوجود اسے میراث ملے گی اور دوسری طرف ہم یہ بھی دعوی کریں کہ قرون اولی میں ناروا طلاق کے واقعات پیش ہی نہیں آتے تھے کہ اس دور میں بہ طور سزا عدت کے بعد نفقہ دلوانے کی بات کہی جاتی، اپنے استدلال کا یہ تضاد پروفیسر مشیر الحق صاحب ہی دور کر سکتے ہیں۔

ایک ضروری وضاحت

امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے مرض الموت میں طلاق شدہ عورت کے بارے میں زمانۂ عدت کے بعد میراث دیے جانے کی جو بات فرمائی اس کا یہ مطلب نکالنا کہ ان حضرات نے عدت گذرنے کے بعد بھی مطلقہ عورت کو طلاق دینے والے کی بیوی قرار دیا فقہ اسلامی سے ناواقفیت کی بات ہے، اگر میراث دلانے کا یہی مطلب ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک ایک عورت ایک ہی وقت میں شرعاً پانچ دس مردوں کی بیوی قرار دی جاسکتی ہے مثلاً ایک عورت نے یکے بعد دیگرے چند مردوں سے نکاح کیا اور ہر مرد نے مرض الموت میں گرفتار ہونے کے بعد اسے طلاق دے دی تو وہ عورت امام مالکؒ کے نزدیک ان تمام مردوں کے ترکہ میں میراث پائے گی، یہ صورت حال امام مالکؒ کے مسلک پر اس لئے زیادہ ممکن ہے کہ کیونکہ ان کے نزدیک شوہر کے مرض الموت میں طلاق شدہ عورت اگر

غیر مدخول بہا ہو یعنی ابھی صرف اس کا نکاح ہوا ہو رخصتی نہ ہوئی ہو تو بھی اسے میراث ملے گی اور غیر مدخول بہا عورت کو طلاق کے بعد عدت نہیں گذارنی ہوتی ہے طلاق کے فورا بعد نکاح کرسکتی ہے، لہذا اگر ایک عورت کا نکاح ہوا اس کے بعد عورت کی رخصتی ہونے سے پہلے شوہر نے مرض الموت میں گرفتار ہو کر اسے طلاق دیدی، طلاق کے بعد عورت نے فوراً دوسرا نکاح کرلیا، نکاح کرنے کے بعد دوسرا شوہر بھی مرض الموت میں گرفتار ہو گیا اس نے بھی عورت کو رخصتی سے قبل طلاق دیدی، اسی طرح اس عورت نے یکے بعد دیگرے دس مردوں سے نکاح کیا اور ہر بار یہی صورت حال پیش آئی تو امام مالک کے مسلک پر یہ عورت بہت سے مردوں سے میراث پانے کی مستحق ہوگی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ امام مالک اس عورت کو بہ یک وقت بہت سے مردوں کی بیوی قرار دیتے ہیں، تمام مذاہب اور تمام مہذب اقوام میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ایک عورت ایک وقت میں ایک ہی مرد کی بیوی ہوسکتی ہے، پھر امام مالک ایسی مضحکہ خیز بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔

زیر بحث مسئلہ میں امام مالک اور امام محمد کے مسلک کی بنیاد

فقہ اسلامی کی کتاب المیراث اور کتاب الوصیۃ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ قریب المرگ انسان کے مال میں اس کے ورثہ کا استحقاق وراثت اس کی وفات کے بعد شروع نہیں ہوتا بلکہ مرض الموت ہی کے زمانے سے شروع ہوجاتا ہے، ورثہ کا استحقاق ہوجانے ہی کی وجہ سے مرض الموت میں گرفتار شخص کے اختیارات شریعت نے محدود تر کردیئے ہیں اب وہ اپنے مال میں زمانۂ صحت کی طرح تصرفات نہیں کرسکتا، ایک تہائی سے زائد مال نہ کسی کو ہبہ کرسکتا ہے نہ کسی کے لئے اقرار کرسکتا ہے امام مالک کے نزدیک تو مرض الموت میں گرفتار مرد یا عورت اپنا نکاح بھی نہیں کرسکتے، واختلفوا في نكاح المريض، فقال أبو حنيفة والشافعي يجوز وقال مالك في المشهور عنه: إنه لا يجوز۔[بدایۃ المجتہد ۲/۴۶]

حدیث شریف سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً تو مرض الموت کے زمانہ میں پورے مال سے اس کا تصرف واقتدار اٹھ جاتا ہے اور ورثہ کا استحقاق قائم ہوجاتا ہے لیکن یہ اللہ کا صدقہ واحسان ہے کہ اس نے ایک تہائی مال پر مرض الموت میں بھی اس کا اقتدار تسلیم کیا ہے تاکہ زندگی بھر مصارف خیر میں خرچ کرنے اور اصحاب حقوق کے مالی حقوق ادا کرنے میں اس سے جو کوتاہی ہوئی ہو اس کی تلافی کرسکے، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''إن الله تعالى تصدق عليكم بثلث أموالكم في آخر أعماركم زيادة لكم في أعمالكم تضعونها حيث شئتم۔'' [مسند امام احمد، حدیث: ۲۸۰۳۰]

حاصل کلام یہ ہے کہ استحقاق میراث کا دارومدار انسان کی وفات کے بعد کی صورت حال سے نہیں بلکہ مرض الموت کے وقت آغاز کی صورت حال سے ہے، مرض الموت کے آغاز میں چونکہ وہ عورت اپنے شوہر کی زوجہ (بیوی) تھی اس لئے اس کا استحقاق میراث ثابت ہوگیا، اس کا استحقاق ثابت ہونے کے بعد شوہر کی طلاق کے ذریعہ اسے میراث سے محروم کرنے کی کوشش اللہ اور رسول کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ ہے، لہذا شریعت نے اس ناروا کوشش کو مسترد کردیا۔

امام مالک کے مسلک کی تفصیل

امام مالکؒ کے نزدیک مرض الموت میں مبتلا ہونے کے بعد شوہر کے طلاق دینے کی صورت میں عورت ہر حال میں میراث کی مستحق ہوتی ہے حتی کہ اگر شوہر نے بیوی کی خواہش پر طلاق دی ہو یا شوہر نے بیوی کو طلاق کا اختیار دے دیا ہو اور بیوی نے خود مرض الموت میں طلاق واقع کی ہو تو بھی وہ میراث کی مستحق ہوگی، حالانکہ ان صورتوں میں شوہر کی طرف سے میراث سے فرار کی بات صادق نہیں آتی ہے۔

غرضیکہ امام مالکؒ نے مکمل طور سے استحقاق میراث کو مرض الموت سے وابستہ کردیا ہے، خواہ مرض الموت میں طلاق دینے کا سبب کچھ ہی ہو۔

اگر شوہر نے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد جسے خواہ وہ مرض الموت تصور کرتا ہے بیوی کو طلاق بائن دی، لیکن اس کے بعد وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوگیا، ابھی مطلقہ عورت عدت گذار رہی ہے اسی دوران اچانک مرد کا انتقال ہوگیا تو امام احمد اور امام مالک بھی اس مطلقہ کو میراث نہیں دلواتے، کیونکہ طلاق کی نوعیت اور صورت حال ایسی نہیں ہے جس میں یقین سے کہا جاسکے کہ میراث سے محروم کرنے ہی کے لئے وہ طلاق کا اقدام کررہا ہے حالانکہ سارے قرائن اس کے موجود ہیں۔

یہ قیاس درست نہیں ہے

مشیر الحق صاحب نے جس مسئلہ کو طلاق المریض پر قیاس کیا ہے وہاں ظلم کی صورت حال اتنی واضح نہیں ہے، طلاق دینے والے شوہر کے مال میں نہ کسی خاص عورت کا استحقاق نفقہ متعلق ہوچکا ہے نہ آنکھ بند کرکے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شوہر نے بالکل بلاسبب محض نفقہ کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے طلاق دی ہے لہذا طلاق کی اتنی غیر واضح صورت حال کو طلاق المریض جیسی بدیہی حقیقت پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے۔

علامہ ابن ہمام نے بڑی صفائی سے لکھا ہے کہ اصول کا تقاضا تو وہی ہے جو امام مالک کا مسلک ہے کیونکہ وہ عورت چونکہ مرض الموت کے آغاز میں بیوی تھی اس لئے میراث میں وہ بیوی کے حصہ کی مستحق ہوگئی اور اس کا حق پختہ ہوگیا لہذا مرض الموت میں طلاق دیے جانے کے بعد خواہ سابق شوہر کا انتقال اس کے عدت کے زمانہ میں ہو یا عدت کے بعد یا دوسرا نکاح کرلینے کے بعد اسے بہرصورت میراث ملنی چاہئے لیکن امام ابوحنیفہ نے محض آثار وروایات وغیرہ کی روشنی میں یہ قید لگادی ہے ہے کہ میراث ملنے کی شرط یہ ہے کہ اس مطلقہ کے زمانۂ عدت ہی میں شوہر کا انتقال ہوگیا اور امام احمد نے دوسرا نکاح نہ ہونے کی قید لگادی ہے۔ (فتح القدیر ج ۳)

سابقہ گفتگو کا خلاصہ

اوپر کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ اولاً تو زمانہ عدت کے بعد نفقہ کا مسئلہ منصوص ہے،

اس کے سلسلہ میں قرآن وسنت کی واضح تعلیمات موجود ہیں، لہذا اس میں قیاس واستنباط کی گنجائش نہیں، اگر بالفرض یہ مسئلہ قیاس واستنباط کے دائرے میں آتا تو بھی مشیر صاحب کا قیاس بالکل ناقابل تسلیم ہوتا کیونکہ جن دوائمہ کے مسلک پر اس قیاس کی پوری عمارت کھڑی کی جارہی ہے ان کے اقوال اصل مسئلہ میں اس قیاس کے برعکس موجود ہیں، ان دونوں حضرات کے نزدیک غیر حاملہ مطلقہ بائنہ تو سرے سے نفقہ کی مستحق نہیں ہوتی نہ زمانۂ عدت میں نہ اس کے بعد اور حاملہ صرف ایام حمل کے نفقہ کی مستحق ہوتی ہے۔

آیئے ایک قدم اور آگے بڑھ کر دیکھیں کہ اگر اصل مسئلہ سے متعلق امام مالک اور امام احمد کی تصریح موجود نہ ہوتی تو مشیر صاحب کے اس قیاس کی قدر وقیمت کیا ہوتی، گہرائی میں جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق المریض کے مسئلہ پر زمانہ عدت کے بعد کے نان ونفقہ کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، شوہر نے بیوی کے ساتھ پوری زندگی گذاردی، اور اب زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے، مرض الموت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے دوسرے ورثہ کی طرح بیوی کا استحقاق میراث بھی شوہر کے مال سے متعلق ہوچکا ہے، اب ایسے وقت میں طلاق دینے کا دودوچار کی طرح مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی دانست میں اپنی وفادار رفیقۂ حیات کو میراث کے حق سے محروم کرنا چاہتا ہے، لہذا اسلام نے اس عریاں ظلم کا انسداد کیا اور اس مطلقہ کو میراث دلوائی اس لئے جن صورتوں میں میراث سے محروم کرنے کا مقصد اتنا واضح نہ ہو وہاں امام مالک اور امام احمد بھی مطلقہ کو میراث نہیں دلواتے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشیر الحق صاحب کے مذکورہ بالا قیاس کی ذمہ داری خود ان سے زیادہ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم پر ہے، مشیر صاحب نے دراصل سباعی صاحب کی اس تجویز اور خیال کو پھیلا کر کچھ اضافہ کے ساتھ پیش کیا ہے جو سباعی صاحب کی ''المرأۃ بین الفقہ والقانون'' میں درج ہے، مصطفیٰ سباعی مرحوم کے دعوتی اور فکری کاموں سے انکار نہیں،

ان کے کام اور پیغام کی پوری قدر ہمارے دلوں میں ہے لیکن امت مسلمہ کے ایک مسلمہ کے مقابلہ میں تنہا ان کے قیاس کو کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی خصوصاً جب کہ وہ قیاس دین وشریعت، عقل ومنطق کی کسوٹی پر پرکھنے سے کھوٹا ثابت ہو، چند اور فقہی مسائل کے بارے میں بھی جمہور امت سے مختلف ان کی آراء ہیں جن پر اب ہم ان کے لئے مغفرت کی دعا ہی کرسکتے ہیں۔

پروفیسر مشیر الحق صاحب کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ فقہ وقانون ان کا موضوع نہیں ہے، فقہی مسائل پر وہ خاص حالات میں اور خاص محرکات کے تحت ہی قلم اٹھایا کرتے ہیں اس لئے قدم قدم پر ان کا قلم ٹھوکریں کھاتا ہے۔

بعض غلطیاں

مشیر صاحب نے اس مقالہ میں بعض بھونڈی غلطیاں کی ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ ''عام حالات میں طلاق رجعی پانے والی عورت کا شوہر اگر دوران عدت مرجائے تو اسے ورثہ نہیں ملے گا''، حالانکہ تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق رجعی دی ہو خواہ صحت کے زمانہ میں یا مرض الموت کے زمانہ میں اور زمانۂ عدت ہی میں شوہر کا انتقال ہوجائے تو مطلقہ بیوی کو میراث ملے گی۔

مشیر الحق صاحب نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کی شرعی بنیاد فراہم کرنے کے لئے ملایا میں جاری عادت لابھی ذکر کیا ہے جس کے تحت طلاق شدہ بیوی کو شوہر کے مال سے بعض حالات میں آدھا اور بعض حالات میں ایک تہائی دلایا جاتا ہے، اس قسم کا استدلال جتنا پرانا ہے اتنا ہی کمزور بھی ہے، ہمیں اعتراف ہے کہ بعض مسلم ممالک کے ملحدانہ ذہنیت رکھنے والے ڈکٹیٹروں نے مغربی فلسفہ وقانون سے مرعوبیت کے نتیجہ میں اسلامی قوانین میں من مانی تحریفات کردی ہیں لیکن مسلم ممالک کے ان برخود غلط حکمرانوں کے ملحدانہ اقدام سے نہ قرآن وسنت پر مبنی اسلامی شریعت بدل سکتی ہے، نہ اس سے ہندوستان میں جاری مسلم پرسنل لا میں

تحریف کا جواز پیدا ہوتا ہے۔

اگر ہندوستان کو اپنا جمہوری اور سیکولر کردار باقی رکھنا ہے اور دستور ہند پر عمل کرنا ہے تو مسلم ممالک کے فوجی حکمرانوں کی آمرانہ روش اختیار کرنے کے بجائے اس سے کوسوں دور رہنا پڑے گا۔

پاکستان عائلی کمیشن رپورٹ کا حوالہ

اس سلسلہ میں پاکستان کی عائلی کمیشن رپورٹ کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے عجیب تضاد ہے کہ ایک طرف پاکستان کا نام لینا ملک دشمنی تصور کیا جاتا ہے دوسری طرف وہاں کے عائلی کمیشن کی رپورٹ کو قابل تقلید قرار دیا جاتا ہے، ۱۹۵۵ء میں اس کمیشن کی تشکیل ہوئی، اس کے چھ ارکان میں تین خواتین اور صرف ایک عالم دین مولانا احتشام الحق تھانوی تھے، عائلی کمیشن کی رپورٹ پر واحد عالم ممبر مولانا تھانوی نے بڑا سخت اور تفصیلی اختلافی نوٹ لکھا، ۱۹۵۶ء میں اس کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تو مسلمانوں کے ہر مسلک اور ہر طبقہ کی طرف سے اس پر شدید احتجاج ہوا، لہذا حکومت نے اس رپورٹ کو التواء میں ڈال دیا، ۱۹۶۱ء میں ایوب خاں کی فوج نے اس دفن شدہ رپورٹ کو سرد خانے سے نکال کر نافذ کرنا چاہا تو مفتی محمد شفیع صاحب کے بیان کے مطابق ''لاہور میں مختلف مکاتب فکر کے چودہ مشاہیر علماء نے جمع ہوکر اس نافذ ہونے والے قانون پر تنقید کی، اسی طرح چالیس سے زائد علماء سرحد کی طرف سے پھر مشرقی پاکستان کے چوراسی مشاہیر علماء کی طرف سے اس کے خلاف احتجاج کیا گیا'' پاکستان کے تمام ممتاز علماء اور ارباب فتویٰ نے عائلی کمیشن کی رپورٹ پر سخت تنقیدیں اور تبصرے کئے، پاکستان کے سب سے مستند ومعتبر عالم مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب نے اس پر ایک رسالہ تصنیف کیا جسے جواہر الفقہ جلد دوم میں دیکھا جاسکتا ہے۔

نادار مطلقہ کی مشکل کا حل

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نادار مطلقہ کا عدت کے بعد گذر بسر کیسے ہو؟ تو

اسلام نے نادار مطلقہ ہی نہیں بلکہ تمام نادار معذور افراد کے گذر بسر کا بڑا ہمہ گیر عادلانہ نظام پیش کیا ہے، فقہ اسلامی کے کتاب النفقہ، کتاب المیراث میں اس کی پوری تفصیل دیکھی جاسکتی ہے، نادار مطلقہ کے نان ونفقہ کا اسلام نے جو انتظام کیا ہے وہ دفعہ ۱۲۵ سے کہیں زیادہ مکمل، منصفانہ اور ہمدردانہ ہے، اس سلسلے میں اسلام کا نظامِ نفقہ متعدد وجوہ سے بہت فائق ہے۔

(۱) اسلام نے مطلقہ کے نادار ہونے کی صورت میں اس کا نان ونفقہ اولاد، والد، والدہ، دادا وغیرہ پر عائد کیا ہے، علی الترتیب جن اعزہ پر نفقہ عائد کیا گیا ہے ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ نادار مطلقہ کے اعزہ میں سے کوئی نہ کوئی ضرور مل جائے گا جس پر قانوناً اس کا نفقہ لازم کیا جائے گا، ہزاروں میں اگر دو ایک ایسی نادار مطلقہ ہوں جن کا کوئی عزیز نہ ہو تو بیت المال ان کا نان ونفقہ برداشت کرے یا مسلمان اجتماعی طور پر اس کا انتظام کریں، اس کے برخلاف دفعہ ۱۲۵ میں نادار مطلقہ کے گذر بسر کا جو انتظام کیا گیا ہے وہ انتہائی ناقص اور مشکل الحصول ہے، دفعہ ۱۲۵ میں نادار مطلقہ کا نفقہ سابق شوہر کے ذمہ اسی وقت عائد کیا گیا ہے جب وہ ''معقول ذرائع آمدنی'' کا مالک ہو، سابق شوہر کے پاس معقول ذرائع آمدنی نہ ہونے کی صورت میں نادار مطلقہ کے نان ونفقہ کا کیا انتظام ہوگا؟ اس بارے میں دفعہ ۱۲۵ بالکل خاموش ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے قانون کے پاس نادار مطلقہ کے درد کا کوئی مداوا موجود نہیں ہے۔

(۲) اولاد والدین اور عزیز واقارب کے بجائے طلاق دینے والے شوہر پر عدت کے بعد نادار مطلقہ کے نان ونفقہ کی ذمہ داری عائد کرنے سے مطلقہ کے ''جذبہ انتقام'' کو کچھ تسکین شاید ہوجائے لیکن اس کا مسئلہ بالکل حل نہیں ہوتا، کیوں کہ طلاق دینے والے شوہر میں عموماً اپنی سابقہ بیوی کے لئے اتنا بھی جذبۂ ہمدردی نہیں ہوتا جتنا ایک بالکل اجنبی آدمی میں ہوتا ہے، لہٰذا وہ اس مطلقہ کے نفقہ کی ذمہ داری سے ہر قیمت پر بچنا چاہے گا، خصوصاً جب کہ اسے معلوم ہے کہ اب نان ونفقہ ادا کرنا میری مذہبی ذمہ داری نہیں ہے، لہٰذا ایسے ہر کیس

میں ہر نادار مطلقہ کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا، جو عموماً نادار انسان کے لئے ممکن نہیں ہوتا اس کے برخلاف اگر قانونی طور پر عملاً بھی شریعت کے قانونِ نفقہ کو نافذ کردیا گیا تو نادار مطلقہ کو عدالت میں جانے کی ضرورت بہت کم پڑے گی کیونکہ رشتہ داروں میں خواتین کے لئے جذبۂ ہمدردی فطری طور پر ہوتا ہے، طلاق کے سانحہ کے بعد ہمدردی میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں اگر اقرباء کو معلوم ہوجائے کہ نادار مطلقہ کی نگہداشت کرنا اور اس کا نان ونفقہ مہیا کرنا شرعی ذمہ داری کے علاوہ ہماری قانونی ذمہ داری بھی ہوگئی ہے تو اس کے اقرباء، خوشی خوشی اس ذمہ داری کو پورا کریں گے اور اسے عدالت میں جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

(۳) نان ونفقہ کی ذمہ داری عائد ہونے کے بعد مطلقہ کے خاندانی اعزہ اس کیلئے مناسب رشتہ تلاش کرنے کی پوری جدوجہد کریں گے جلد از جلد اس کا نکاح کردینے کی تدبیر کریں گے، اس کے برخلاف سابق شوہر پر نفقہ کی ذمہ داری کرنے کی صورت میں اگر عدالت نے معقول رقم ماہانہ دلانے کا فیصلہ کردیا تو ایسے سنگ دل رشتہ دار بھی ہوسکتے ہیں جو عدالت کی طے کردہ ماہانہ رقم باقی رکھنے کی لالچ میں اس بات کی کوشش کریں کہ اس کا کہیں نکاح نہ ہوسکے ورنہ ہماری ماہانہ آمدنی موقوف ہوجائے گی۔

''شریعت اپیلی کیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء'' کے تحت اسلام کا قانونِ نفقہ ہندوستانی مسلمانوں پر قانوناً نافذ ہے، اگر ہماری عدالتیں اسے عملاً بھی نافذ کردیں تو نادار مطلقہ کا مسئلہ بڑی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے اسلام کے دائرے میں حل ہوسکتا ہے اگر اسے ناکافی سمجھا جارہا ہے تو پارلیمنٹ میں کوئی ایسا بل پیش کیا جاسکتا ہے کہ نادار مسلم مطلقہ عورت کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے عزیز واقارب پر قانونِ اسلامی کے مطابق عائد ہوگی۔

موجودہ عدالتی نظام میں اصلاحات کی ضرورت

جن حضرات کو نادار مطلقہ اور تمام نادار ومظلوم افراد سے واقعی ہمدردی ہے انہیں

سب سے پہلے ہندوستان کے عدالتی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی کوشش کرنی چاہئے، انگریزوں نے اپنی خاص مصلحتوں اور سامراجی مقاصد کے تحت جو پیچیدہ عدالتی نظام ہندوستان میں نافذ کردیا تھا وہی ہو بہو اب بھی جاری ہے، آزادی کے بعد اس نظام میں اصلاحات کے بجائے ہمارے قومی کیرکٹر کی کمزوریوں سے بہت سے مزید نقائص شامل ہوگئے ہیں۔

عدالتی نظام کی ابتری کی بنا پر انصاف بڑا مہنگا ہوگیا ہے، اپنا حق اور انصاف حاصل کرنے کے لئے مظلوم کو اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے ظلم پر صبر کرنے کو ترجیح دیتا ہے، بسا اوقات مقدمہ کے اخراجات اس جائداد یا رقم سے بہت بڑھ جاتے ہیں جس کے ملنے کی امید اسے کامیابی ملنے کی صورت میں ہے، سالہا سال تک دفتر گردی، چپراسی سے لے کر اوپر تک ہر ایک کی خدمت میں ''نذرانہ'' پیش کرنے کے باوجود بھی انصاف ملنے کا اطمینان نہیں ہوتا، ان حالات میں عدالت میں جانے کی ہمت وہی لوگ کرتے ہیں جو یا تو پیشہ ور مقدمہ باز ہیں یا اتنا فالتو سرمایہ رکھتے ہیں کہ ہر قانون کو سرمایہ کے بل پر خرید سکتے ہیں، موجودہ عدالتی نظام کی خرابیوں کے برقرار رہتے ہوئے نادار مطلقہ کو نان ونفقہ دلوانے کے لئے کتنا ہی خوشنما اور منصفانہ قانون بنادیا جائے وہ اپنا حق حاصل نہیں کرسکتی، بیچاری وہ ''نادار بے سہارا'' عورت مقدمہ کے اخراجات کے لئے بے پناہ سرمایہ کہاں سے لائے گی، سالہا سال تک دفتر گردی اور تگ ودو کے لئے ہمت اور توانائی کہاں سے فراہم کرے گی، اگر ہماری سپریم کورٹ اور دانشوروں کو نادار مطلقہ اور مظلوموں سے واقعی ہمدردی ہے تو عدالتی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے لئے پوری جدوجہد کرنی چاہئے، عدالتی نظام اتنا سادہ اور سستا بنادیا جائے کہ ہر مظلوم اور دادخواہ بہ آسانی عدالت میں پہنچ کر کم سے کم وقت اور کم سے کم خرچ میں اپنا حق حاصل کرسکے، ورنہ محض قانون سازی کسی مظلوم اور دادخواہ کے درد کا مداوا نہیں۔

☆☆☆☆

عارف محمد خاں
کے
پارلیمانی بیان کا تجزیہ

عارف محمد خاں آج کل حکومت ہند کی طرف سے کیرلا کے گورنر ہیں، اپنی ''خدمات'' کا صلہ وصول کررہے ہیں، شاہ بانو کیس کا جب فیصلہ آیا اس وقت وہ کانگریسی حکومت کے وزیر تھے، ان کا یہ بیان اسی وقت کا ہے۔

''تحفظ حقوق مطلقہ بل'' جو شاہ بانو کیس کے فیصلہ ۱۹۸۵ء سے اسلامی شریعت میں ہونے والی مداخلت کو ختم کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی کوششوں سے پارلیمنٹ میں پیش اور پاس ہوا، اس کی مخالفت کرنے کی وجہ سے عارف محمد خاں کو کانگریس سے الگ ہوکر بھاجپا کی گود میں پناہ لینی پڑی، اس وقت سے وہ مسلسل بھاجپا سے رابطہ میں ہیں۔

عارف محمد خاں
کے پارلیمانی بیان کا تجزیہ

مرکزی وزیر عارف محمد خاں کا ایک پارلیمانی بیان آج کل بحث ونظر کا موضوع بنا ہوا ہے، اخبارات ورسائل میں اس بیان کی موافقت ومخالفت میں مضامین اور مراسلے شائع ہورہے ہیں، اسلام دشمن پریس اور عناصر اس بیان کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں، کچھ ملت فروش یا مغرب زدہ مسلمان بھی اس پر پسندیدگی کا اظہار کررہے ہیں، کمیونسٹ اور مغرب زدہ اخبار ورسائل اس کی تشہیر اور تائید کی باقاعدہ مہم چلا رہے ہیں لیکن مسلمانوں کا سواد اعظم اس بیان پر غم وغصہ کا اظہار کررہا ہے، مسلمانوں کی تمام جماعتیں اور ہر فرقہ ومسلک کے علماء ومفتیان کرام اسے انتہائی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں، زیر نظر مضمون میں ہم عارف محمد خاں کے اس بیان اور اسی بیان سے متعلق ان کے ایک انٹرویو کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے جارہے ہیں، عارف محمد خاں سے ہمیں نہ کوئی پرخاش ہے نہ ذاتی اختلاف، اور نہ ان سے کبھی ملاقات، اگر ان کا یہ بیان کسی سیاسی مسئلہ سے متعلق ہوتا تو ہم اس پر تبصرہ کی جرأت نہ کرتے، لیکن ان کا بیان چونکہ خالص ایک مذہبی مسئلہ اور قرآن وسنت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اپنا دینی فریضہ سمجھ کر ہم اس کا حقیقت پسندانہ اور ناقدانہ جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

بیان کا پس منظر

تبصرہ اور جائزہ شروع کرنے سے پہلے ہم اس بیان کا پس منظر واضح کردینا

ضروری سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کن حالات میں اور کس ضرورت سے یہ طویل ترپارلیمانی بیان دیا۔

مؤرخہ ۲۳؍اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ کی آئینی بنچ نے چیف جسٹس چندچوڑ کی سرپراہی میں ''محمد احمد خان بنام شاہ بانو بیگم'' مقدمہ میں اپنا فیصلہ صادر کیا، سپریم کورٹ نے ''شریعت اپلیکشن ایکٹ ۱۹۳۷ء'' (مسلم پرسنل لا) اور ''ضابطہ فوجداری ۱۹۷۳ء، دفعہ ۱۲۷ (۳) (ب) کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے محض ضابطہ فوجداری دفعہ (۱۲۵) کو بنیاد بنا کر فیصلہ کیا کہ طلاق دینے والا محمد احمد مطلقہ عورت شاہ بانو بیگم کو اس وقت تک نان ونفقہ دیتا رہے جب تک شاہ بانو بیگم کہیں دوسری شادی نہ کرلے'' سپریم کورٹ نے صرف یہی فیصلہ نہیں کیا بلکہ اسلام پر ناروا حملے کئے اور ''مسلم عائلی قانون'' کو ختم کرکے یکساں سول کوڈ'' نافذ کرنے کی سفارش کی، اپنے فیصلہ میں یہ ثابت کرنے کی بھی ناکام کوشش کی کہ یہ فیصلہ اسلامی شریعت اور قرآن وسنت کے خلاف نہیں بلکہ قرآن وسنت اور اسلامی شریعت کے عین مطابق ہے، اس مقصد کے لئے سپریم کورٹ کی اس آئینی بنچ نے قرآنی آیات کی من مانی تفسیر بھی کی۔

اس فیصلہ کا آنا تھا کہ مسلمانان ہند میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی، تمام مسلم جماعتوں اور ہر فرقہ ومسلک کے علماء نے دینی معاملات میں ناروا مداخلت تصور کرکے اس فیصلہ کی مذمت کی، ہندوستان کے مسلمانوں نے اس فیصلہ کو اپنے عقیدہ ومذہب، تہذیب وثقافت کے لئے کھلا چیلنج قرار دیا، مسلمانوں کے خدشات اور جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری غلام محمود بنات والا (ایم پی) نے ۱۰؍مئی ۱۹۸۵ء کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کی خاطر پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا، ۲۶؍جولائی کو انہوں نے مذکورہ بالا بل کی حمایت اور وضاحت میں بڑی سنجیدہ اور مدلل تقریر کی، اسی بل پر بحث کرتے ہوئے مرکزی وزیر عارف محمد خاں نے ۲۴؍اگست کو پارلیمنٹ میں وہ طویل تقریر کی جو آج کل اخبارات میں بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔

ژولیدہ بیانی کا اعلیٰ نمونہ

بلٹز (۱۴ ستمبر ۱۹۸۵ء) کی رپورٹ کے مطابق انہوں نے ۳۴ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ تقریر سو (۱۰۰) منٹ میں پوری کی، تقریر ژولیدہ بیانی کا اعلیٰ نمونہ ہے، تقریر کا کم از کم تین چوتھائی حصہ موضوع سے ہٹا ہوا، غیر مربوط اور انتہائی مہمل ہے، اگر بے مقصد، مہمل، ژولیدہ بیانی اور الجھاؤ نگاری پر دنیا میں کوئی ایوارڈ ملتا ہو وہ ضرور عارف محمد خاں کو ملنا چاہئے، ان کی تقریر پڑھ کر بے اختیار ''غالب اینڈ گوئٹے'' والا لطیفہ یاد آتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ان پڑھ کسان سائنس کی کسی ایسے مسئلہ پر جس کے بارے میں سائنس داں متفق ہوں ان سے اختلاف کر رہا ہو اور سب کو چیلنج دے کر کہہ رہا ہو کہ تم لوگوں کی متفقہ تحقیق غلط ہے اور میری رائے صحیح ہے، عارف محمد خاں نے اپنے طور پر یہ تقریر کی ہو یا کسی اور طاقت کے اشارے پر کی ہو، بہر حال اس تقریر کا یہ ناقابل تلافی نقصان ضرور ہوا کہ اسلام دشمن عناصر کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل گیا کہ خود مسلم ممبران پارلیمنٹ بنات والا کے بل پر متفق نہیں ہیں اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کو مذہبی اعتبار سے صحیح قرار دیتا ہے۔

پارلیمانی بیان ناقابل التفات

ہندوستان کی مؤقر پارلیمنٹ میں اگر یہ تقریر نہ کی گئی ہوتی اور ملکی پریس نے اسے زیادہ نہ اچھالا ہوتا تو ہم اسے ناقابل التفات تصور کر کے نظر انداز کر دیتے لیکن ہمارے ملکی خصوصاً فرقہ پرست اور کمیونسٹ پریس نے ''نعمت غیر مترقبہ'' تصور کر کے اس بیان کی خوب پبلسٹی کی اور یہ پروپیگنڈہ کیا کہ مسلمان خود اس مسئلہ میں متحد نہیں ہیں، لہذا بنات والا کا بل بالکل لغو اور بے معنی ہے، اس لئے علماء کو بھی بادل نخواستہ عارف محمد خاں کے بیان کا تنقیدی جائزہ لینا پڑ رہا ہے۔

بیان کا حاصل

نئی دنیا (جلد ۱۴، شمارہ بارہ) میں شائع شدہ عارف محمد خاں کی تقریر کا متن ہمارے

سامنے ہے، تقریر کا پورا متن پڑھ کر اگر کوئی بات سمجھی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ بنات والا کے پیش کردہ ترمیمی بل کی مخالفت اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کی تائید میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں، یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ مطلقہ کے نفقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ قرآن وسنت کے عین مطابق ہے، آیئے پہلے عارف محمد خاں کی تقریر کے آئینے میں مطالعہ کریں کہ ان کی دینی معلومات کے حدود اربعہ کیا ہیں؟ اور ایک ایسے مسئلہ جو چودہ سو سال تک مسلمانوں میں متفقہ رہا اختلاف کرتے ہوئے انہوں نے کن حوالوں کو استعمال کیا ہے؟ قرآن وسنت اور اسلامی قانون کی بنیادی کتابوں تک ان کی رسائی ہے کہ نہیں؟

انہوں نے تقریر کے شروع میں بڑے زور وشور سے اعلان کیا ہے:

> ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قرآن شریف اور حدیث کے علاوہ اور دوسرا حوالہ نہیں دوں گا اور اگر کوئی دوسرا حوالہ دوں تو معزز ممبران سے میری درخواست ہے کہ اس دوسرے حوالہ کو قطعی کنڈیشن میں لیں۔''

اس یقین دہائی کے بعد تو قارئین کو امید ہو چکی ہوگی کہ عارف محمد خاں نے اپنی تقریر میں احادیث کے حوالوں کے انبار لگا دئے ہوں گے لیکن سو منٹ کی پوری تقریر پڑھ جایئے آپ کو حدیث کا کہیں ایک بھی حوالہ نہیں ملے گا، اب ان کی قرآن فہمی اور قرآنی حوالوں کا حال بھی نگاہ عبرت سے ملاحظہ فرمایئے، موصوف نے تقریر کے دوران چند آیتوں کے ترجمے سنائے تو بعض مسلم ممبران نے کہا: قرآن کی اصل آیات سنایئے، اس معقول مطالبہ پر برہم ہو کر وزیر صاحب اپنا توازن کھو بیٹھے اور فرمانے لگے:

> ''بنات والا صاحب کہہ رہے ہیں کہ پڑھئے اگر کسی زمانہ میں پڑھا ہو لیکن میں نے تو شروعات ہی یہ کہہ کر کی تھی کہ مجھے اپنی کم علمی کا اپنی کم مائیگی کا پورا احساس ہے، آپ ٹھیکیدار بنے رہئے، میں ٹھیکیدار نہیں بننا چاہتا، کیوں کہ مجھے اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا پورا احساس ہے..... میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اپنی ٹھیکیداری کی رسم کو برقرار رکھیئے۔''

عارف محمد خاں کے مصادر اجتہاد

پورا بیان پڑھ جایئے کہیں کسی تفسیر، حدیث، فقہ کی کتاب کا حوالہ نہیں ملے گا، کسی حدیث کا حوالہ نہیں ملے گا، بس کسی ترجمۂ قرآن سے چند متعلق، غیر متعلق آیات کے ترجمے نقل کردیئے ہیں، اگر حوالہ ہے تو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور پاکستان لاکمیشن پروسیڈنگ کا، دوران تقریر انہوں نے اپنے مبلغ علم اور ''مآخذ اجتہاد'' کا بھانڈا خود ان الفاظ میں پھوڑ دیا ہے۔

''چونکہ سیٹھ صاحب نے پابندی لگادی ہے، اس لئے اس تفصیل میں اب نہیں جارہا ہوں اور اپنے کو محدود رکھ رہا ہوں قرآن وحدیث تک ورنہ میرے پاس ''اسپرٹ آف اسلام''، ''امیر علی''، ''رومن لا اینڈ اسلام''، ظہیر الدین صدیقی ان سب کے نظریات ہیں۔''

عارف محمد خاں کی تقریر کے آئینہ میں آپ نے ان کی دینی معلومات کے حدود اربعہ اور ''مصادر اجتہاد'' معلوم کرلئے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کی علمی پرواز صرف قرآن کے چند اردو، انگریزی ترجموں تک ہے، عربی زبان وادب جو علوم دینیہ، تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی کنجی ہے، اس سے بالکل نابلد ہیں، عربی سمجھنا تو دور کی بات ہے قرآن کی آیات پڑھنا ان کے لئے مشکل ہے، انہوں نے اپنی تقریر میں بار بار یہ بھی صراحت کی ہے کہ مجھے اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا پورا احساس ہے، اس کے باوجود انہیں اجتہاد کرنے اور قرآنی آیات کو ایسے نئے معانی پہنانے پر اصرار ہے جن کی ایک بھی تائید اسلامیات کے قدیم وجدید ذخیرے میں نہیں ملتی، اسلام اور مسلمانوں کی اس سے زیادہ بے کسی اور بے وقعتی کیا ہوگی کہ علم دین سے بالکل کورا ایک شخص قرآنی آیات میں من مانی تحریف کررہا ہے، چودہ صدیوں کے تمام محدثین، مفسرین، ائمہ ومجتہدین کے متفقہ فیصلے سے بغاوت کرکے دعوئ اجتہاد کررہا ہے۔

عذر اور توجیہ

بعض حضرات عارف محمد خاں کے پارلیمانی بیان کی سنگینی کم کرنے کے لئے عذر

بیان کرتے ہیں کہ ''عارف محمد خاں نے اس تقریر میں نفقۂ مطلقہ کے بارے میں کوئی فتوی صادر نہیں کیا بلکہ اس سے متعلق اپنے چند شبہات اور خیالات کا اظہار کیا تاکہ علماء کرام اور قانون کے ماہرین اس پر غور کرکے کسی نتیجہ تک پہنچیں،'' یہ عذر اس لئے عذر لنگ ثابت ہوتا ہے کہ اول تو پارلیمنٹ استفسار کرنے اور خام خیالات اگلنے کی جگہ نہیں ہے، نفقۂ مطلقہ جیسے نازک اور حساس موضوع پر تو بڑی تحقیق اور احتیاط سے تقریر کرنے کی ضرورت تھی، عارف محمد خاں کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں اور مکاتب فکر کے علماء اور فقہاء نفقہ سے متعلق سپریم کورٹ کے فیصلہ کو قرآن وسنت اور قانون شریعت کی روشنی میں غلط قرار دے چکے ہیں، اگر انہیں واقعی اس سلسلے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں کچھ اشکالات تھے تو سنجیدہ اور آسان طریقہ یہ تھا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں یا کسی بڑے مذہبی ادارے (دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ) کے علماء اور مفتیان کرام سے گفتگو کرکے اطمینان حاصل کرلیتے، تاکہ اسلام اور مسلمانوں کی وہ جگ ہنسائی نہ ہوتی جس کا انہوں نے موقع فراہم کیا، لیکن آخر وہ ایسا معقول طریقہ کیوں اختیار کرتے، وہ تو ائمہ مجتہدین اور محدثین ومفسرین کو خاطر میں نہیں لاتے پھر عصر حاضر کے علماء ان کی نظر میں کیا چیز ہیں؟ علوم دینیہ اور عربی زبان وادب سے نابلد ہونے کے باوجود انہیں اپنے ''حق اجتہاد'' پر اصرار ہے، چنانچہ بلٹز (۱۴ ستمبر ۸۵ء) میں شائع شدہ اپنے ایک انٹرویو میں اس سوال کے جواب میں

''عارف صاحب! علمائے دین کا کہنا ہے کہ ایسے نازک ترین موضوع پر بولنے والے کو اسلامی تعلیمات اور علوم کا ماہر ہونا چاہئے، اسے قرآن شریف کا بار بار مطالعہ کرنا چاہئے، کیا آپ ان شرائط پر پورے پورے اترتے ہیں؟ کہتے ہیں ''علماء دین کی قدر کرتا ہوں، ان کا احترام کرتا ہوں لیکن بہ قول شاعر مشرق علامہ اقبال ''میں اس صورت حال کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جہاں ہم اماموں کو بتوں کا درجہ دے دیں اور اپنے آپ کو ذہنی تساہلی میں مبتلا کرکے اپنی آزادئ فکر کو پابند بنالیں۔

عارف محمد خاں کا اپنے موقف پر اصرار

عارف محمد خاں کی پارلیمانی تقریر کو استفسار قرار دینا اس لئے بھی غلط ہے کہ ان کے بعد کے بیانات سے یہ بات دو دو چار کی طرح عیاں ہوگئی کہ انہیں اپنی رائے اور موقف کے صحیح ہونے پر بے انتہا یقین واصرار ہے، اپنے وضاحتی بیان (شائع شدہ ۱۸ ستمبر ۸۵ء) میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر کوئی ان کی رائے کو غلط ثابت کردے تو وہ (اپنی سب سے عزیز متاع یعنی) کرسی وزارت چھوڑنے کو تیار ہیں، بیچارے کرسیٔ وزارت کیا چھوڑتے، وزارت ہی کی بقاء استحکام اور ترقی کے لئے تو انہیں یہ سب پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں، قدرت کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ کچھ دنوں قبل مرکز کی وزارتی ردوبدل میں انہیں بااختیار وزیر صنعت کے اہم منصب سے ہٹا کر وزارت توانائی کا ماتحت وزیر بنا دیا گیا، خیر یہ تو کوئی اہم بات نہیں، دنیا میں تو ایسے انقلابات آتے ہی رہتے ہیں، ہمیں اس سے کیا بحث، کہنا صرف یہ تھا کہ اپنے موقف کے غلط ثابت ہونے کی صورت میں وزارت چھوڑنے کا اعلان اتنی بات ضرور ثابت کرتا ہے کہ انہیں اپنے موقف کے صحیح ہونے کا بڑی حد تک یقین ہے، اس لئے ان کے پارلیمانی بیان کو محض استفسار یا اشکالات باور کرانا سادہ لوحی یا فریب دہی کے سوا کچھ نہیں۔

سستی شہرت مہنگی پڑے گی

اس پارلیمانی تقریر سے مرکزی وزیر عارف محمد خاں کو کچھ اور حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن سستی شہرت ضرور حاصل ہوئی، کاش انہیں احساس ہوجائے کہ یہ سستی شہرت انہیں آخرت میں کتنی مہنگی پڑے گی، ان کی تقریر سے اسلام دشمن پریس اور عناصر کی بن آئی، انگریزی، ہندی اخبارات نے خوب خوب سرخیاں سجائیں، اخبارات کے صفحات کے صفحات عارف محمد خاں کے بیانات، انٹرویوز، اور ان کی تائید میں لکھے جانے والے مضامین اور مراسلوں کے لئے وقف کردیئے گئے، ہمارا قومی پریس جو مسلمانوں سے متعلق اہم سے اہم خبر شائع کرنے میں افسوسناک بخل سے کام لیتا ہے اس نے عارف محمد خاں کے ساتھ

بڑی دریا دلی کا مظاہرہ کیا، کیونکہ اسلام دشمن پریس اور عناصر نے محسوس کیا اور بالکل صحیح محسوس کیا کہ جو کام بڑے سے بڑے تنگ نظر ہندو فرقہ پرست کے بس کا نہیں وہ عارف محمد خاں نے بہ حسن خوبی کر دکھایا، پھر بھی عارف محمد خاں کی خود فریبی کا حال یہ ہے کہ اسلام دشمن پریس کے اس رویہ پر پھولے نہیں سمارہے، سمجھتے ہیں کہ میں نے پالا مار لیا، ان کی تقریر کے دوران ہندو ممبران خصوصاً ہندو احیاء پسند ممبران نے تالیاں بجا بجا کر خوب داد دی، ایوان تالیوں کی آوازوں سے گونج اٹھا تو انہوں نے سمجھا کہ میری تقریر سے متأثر ہوکر یہ لوگ اسلام کی عظمت کا اعتراف کررہے ہیں مرکزی وزیر ہوکر یہ احساس نہیں کرسکے کہ غیر مسلم ممبران کی داد کی حیثیت ''تحسین ناشناس'' اور ''غزل ہے تو واہ وا'' سے زیادہ کچھ نہیں۔

وزیر صاحب کی خوش فہمی

وزیر صاحب نے اپنے بلٹز کے انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں کہا:

''بہار کے ایم پی منان انصاری کا میری تقریر کے بارے میں کہنا ہے کہ اسلام کی عظمت بیان ہورہی تھی اور اغیار سے داد مل رہی تھی، یعنی پارلیمنٹ میں غیر مسلم ممبران خوشی کا اظہار کررہے تھے، بھگوت جھا آزاد اور رام دلاری سنہا نے بھی میری تقریر کو سراہا ہے۔''

وہ لوگ تالیاں نہیں بجارہے تھے بلکہ مسلمانوں کے حال زار اور بعض مسلم رہنماؤں کی عقل وخرد پر تالیاں پیٹ رہے تھے، کاش عارف محمد خاں سستی شہرت کے اس خطرناک دلدل سے نکل کر ایک باضمیر مسلمان کی حیثیت سے اپنی اب تک کی کاروائیوں کا محاسبہ کریں اور ان سے اس سلسلہ میں جو پہاڑ جیسی غلطیاں ہوئی ہیں ان کی تلافی کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں۔

عارف محمد خاں کے استدلال کی بنیاد

اب تک جو تفصیلات آپ کے سامنے آئیں ان سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہمارے

''وزیر با تدبیر'' کی ''خام خیالیاں'' اس قابل ہرگز نہیں ہیں کہ ان کا نوٹس لیا جائے اور خوامخواہ اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کیا جائے، نفقہ مطلقہ کے سلسلہ میں ان کے استدلال کی پوری عمارت اس پر کھڑی ہے کہ بعض مفسرین نے ''متاع'' اور ''متعوھن'' کا ترجمہ نان نفقہ یا خرچہ کر دیا، اسی پر وزیر موصوف اچھل پڑے کہ بس سپریم کورٹ کے فیصلے کا قرآن کے مطابق ہونا ثابت ہو گیا۔

ترجمہ اصل قانون کی جگہ نہیں لے سکتا

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ قرآن کے ترجمہ پر کسی معرکۃ الآراء مذہبی مسئلہ کی بنیاد رکھنا اصولی طور پر بالکل غلط ہے، کسی بھی ترجمۂ قرآن کو اصل قرآن کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، یہ صرف علماء کا بنایا ہوا اصول نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق عقل عام سے ہے اور ساری دنیا میں اسی پر عمل ہو رہا ہے، یہ بات ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔

ہندوستان کے قانون ساز ادارے نے انگریزی زبان میں ہندوستان کا مجموعۂ قوانین وضع کیا، کسی شخص نے اپنے طور پر مجموعۂ قوانین کا اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرا دیا، قانون کی ایک دفعہ کی سپریم کورٹ کے یکے بعد دیگرے مقرر کئے جانے والے متعدد چیف جسٹس ایک خاص توضیح وتشریح کرتے رہے اور اسی بنیاد پر ان لوگوں نے سیکڑوں مقدمات کے فیصلے کئے، فرض کیجئے کہ مجموعہ قوانین ہند کا اپنے طور پر ترجمہ کرنے والے نے اپنی سمجھ کے مطابق اس دفعہ کا ایسا ترجمہ کر دیا جو مذکورہ بالا تعبیر وتشریح سے ٹکراتا ہے، اب ایک شخص اسی دفعہ کو بنیاد بنا کر ایک مقدمہ سپریم کورٹ میں دائر کرتا ہے اور دلیل کے طور پر وہی ترجمہ پیش کرتا ہے تو چند چوڑ صاحب اور عارف محمد خاں بتائیں کہ سپریم کورٹ کے موجودہ چیف جسٹس کا رویہ کیا ہوگا؟ کیا وہ اس ترجمہ کو سند مان کر سابقہ تمام فیصلوں کو کالعدم کر دے گا، یا اسے ناقابل سماعت قرار دے کر فوراً مقدمہ خارج کر دے گا؟ ظاہر ہے کہ موجودہ چیف جسٹس صاحب ترجمہ کو ناقابل استناد قرار دے کر وہی فیصلہ دیں گے جو اب تک اس طرح

کے مقدمات میں دیا جاتا رہا۔

اس دور میں محکمہ وضع قانون اور وزارت قانون کی طرف سے قوانین کے جو ترجمے شائع ہوتے ہیں انہیں بھی اصل قوانین کا درجہ نہیں دیا جاتا اس وقت جب کہ وہ ترجمہ سپریم کورٹ کے سابقہ فیصلوں سے ہم آہنگ نہ ہو، اور قوانین اسلامی کے سلسلہ میں ہر کس وناکس کے ترجمہ قرآن کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے خواہ وہ تمام صحابہ، تابعین، مفسرین ومجتہدین، فقہاء کی تعبیر وتشریح سے متصادم ہو، حالانکہ قانونی اعتبار سے ترجمہ قرآن کی استنادی اور استدلالی حیثیت مجموعہ قوانین ہند کے اس ترجمہ سے مختلف نہیں جسے کسی نے اپنے طور پر شائع کر دیا ہو، آخر ملکی قوانین اور اسلامی قوانین کے بارے میں یہ دوہرا معیار کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب ہمارے نام نہاد دانشوران، سابق چیف جسٹس چند چوڑ اور عارف محمد خاں ہی دے سکتے ہیں۔

احکام اسلامی کے سلسلہ میں اگر قرآنی تراجم کو سند کا درجہ دے دیا گیا اور ججوں کو اختیار دیا گیا کہ کسی بھی ترجمہ کو سامنے رکھ کر اسلامی قانون کی تعبیر وتشریح کریں تو اسلام کا حلیہ بگڑ جائے گا اور بالکل ہی ''نئے اسلامی قوانین'' وجود میں آجائیں گے، قرآن کا ترجمہ کرنے والوں میں ہر سطح اور ہر نظریہ کے لوگ ہیں پھر تو یہ ہوگا کہ ہمارے جج صاحبان کسی مستشرق، قادیانی، باطنی یا مغرب پرست کے ترجمۂ قرآن کا سہارا لے کر اسلام کے بنیادی عقائد واحکام کو منہدم کر کے رکھ دیں گے۔

ترجمہ کی نزاکت

زبان وادب اور لسانیات سے معمولی مناسبت رکھنے والے جانتے ہیں کہ کسی بھی زبان کی کتاب کا دوسری زبان میں اس طرح ترجمہ کرنا کہ اصل کتاب کے تمام معانی اور مضامین ترجمہ میں آجائیں ممکن ہی نہیں، کیونکہ ہر زبان میں بہت سے ایسے الفاظ، ترکیبیں اور محاورے ہوتے ہیں جن کا دوسری زبانوں میں کوئی بدل نہیں ہوتا، ایسے موقع پر ترجمہ

کرنے والا ایسا لفظ لاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ اصل لفظ کی وسعتوں اور تقاضوں پر دلالت کرے، کسی زبان کی کتاب کا دوسری زبان میں کامیاب ترجمہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مترجم کو دونوں زبانوں پر مکمل عبور ہو، اور دونوں زبانوں کے محاورات، ضرب الامثال، اسالیب بیان پر اہل زبان کی طرح نظر رکھتا ہو، پھر ترجمۂ قرآن کا مسئلہ تو اور نازک اور مشکل ہے، اس کے لئے عربی زبان وادب پر فنی عبور کے ساتھ ساتھ علوم دینیہ خصوصاً تفسیر، حدیث، فقہ کلام وغیرہ میں فنی اور محققانہ دستگاہ کی ضرورت ہے، میں نہیں سمجھتا ہوں کہ عبداللہ یوسف علی جن کے ترجمہ قرآن کا بار بار حوالہ دیا جاتا ہے ان شرائط پر پورے اترتے ہیں، ترجمہ قرآن کی اسی نزاکت اور دشواری کے پیش نظر ہمارے مستند مترجمین نے ترجمہ قرآن کے ساتھ تفسیری حواشی کی ضرورت محسوس کی تا کہ مطالعہ کرنے والے جابجا غلط فہمی اور گمراہی میں نہ مبتلا ہوں۔

متاع کا ترجمہ ''مینٹی نینس'' (نان نفقہ) کرنا سنگین غلطی ہے

اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۱ ﴿**وللمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین**﴾ میں متاع کا ترجمہ ''مینٹی نینس'' (نان نفقہ) کرنا عبداللہ یوسف علی کی بڑی سنگین غلطی ہے، اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کسی صحابی، تابعی، مجتہد یا مفسر نے اس آیت میں متاع سے نان نفقہ مراد نہیں لیا اور نہ ہی انگریزی یا اردو کے کسی مستند مترجم نے یہ ترجمہ کیا، حدیث وفقہ پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے ان سے یہ بھیانک غلطی ہوئی۔

اس ترجمہ کے نتائج واثرات

اس ترجمہ کو صحیح ماننے کا مطلب تو ہے کہ جن مطلقہ عورتوں کو عدت نہیں گذارنی ہے انہیں بھی نان نفقہ دلایا جائے حالانکہ اسلامی قانون میں نان ونفقہ عدت سے وابستہ رکھا گیا ہے، طلاق کے بعد جس عورت پر عدت نہیں ہے اسے نان ونفقہ دلانے کی ایک بھی نظیر پوری

اسلامی تاریخ سے پیش نہیں کی جاسکتی۔

ذرا غور کیجئے ایک عورت سے کسی نے نکاح کیا، نکاح کے وقت مہر بھی مقرر ہوگیا، لیکن عورت کی رخصتی اور شوہر سے ملاقات سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آگئی تو سورۂ بقرہ آیت ۲۳۷ کی صراحت کے مطابق اسے آدھا مہر ملے گا ہی، ساتھ ہی ساتھ عبداللہ یوسف علی کے آیت ۲۴۱ کے ترجمہ کے مطابق اسے نان نفقہ بھی ملے گا، عبداللہ علی نے نان نفقہ ملنے کی مدت نہیں بیان کی، اب مدت کی تعیین سابق چیف جسٹس چند چوڑ اور عارف محمد خاں جیسے لوگ کررہے ہیں کہ دوسرے نکاح یا وفات تک عورت کو نفقہ دینا پڑے گا۔

جمہور مفسرین کی تفسیر وتشریح

جمہور مفسرین نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے کہ آیت ۲۴۱ میں مطلقہ عورتوں سے مراد اگر وہی مطلقہ عورتیں لی جائیں جن کا ذکر آیت ۲۳۶ میں آیا ہے (یعنی نکاح کے وقت جن کا مہر طے نہیں ہوا تھا اور نہ رخصتی ہوئی تھی) تو متاع سے مراد وہ ہدیہ اور تحفہ ہوگا جو اس مطلقہ کی دلداری کے لئے شوہر پر واجب ہوتا ہے اور اگر آیت ۲۴۱ میں تمام مطلقہ عورتیں مراد لی جائیں تو متاع سے لغوی معنی مراد ہوگا یعنی نفع پہنچانا، اور ہر مطلقہ کو قرآن وحدیث میں مذکورہ تفصیلات کے مطابق نفع پہنچانا واجب ہوگا۔

جو حضرات تمام صحابہ، مجتہدین، محدثین حتی کہ خلیفہ راشد حضرت عمرؓ بن الخطاب کی تعبیر وتشریح اور فیصلہ کو چیلنج کرنے کی بے جا جسارت کرتے ہیں اور ''ائمہ کو بت کا درجہ دینے پر احتجاج کرتے ہیں'' پھر عبداللہ یوسف علی کو بت بنا کر پوجتے ہیں اور ان کے ترجمہ پر ''استدلال واجتہاد'' کی پوری عمارت کھڑی کرتے ہیں ان کی بے دانشی اور کم عقلی پر رحم آنے لگتا ہے، اور ان کی عقل وخرد کا مرثیہ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔

عارف محمد خاں صاحب نے اپنی پارلیمانی تقریر، انٹرویو اور بعض وضاحتی بیانات میں بڑی فریب کاری اور مغالطہ انگیزی سے کام لیا ہے، انہوں نے مولانا عبد الماجد

دریابادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام بار بار اس طرح لیا ہے گویا نفقہ مطلقہ کے سلسلہ میں ان حضرات کا وہی خیال ہے جس پر عارف محمد خاں اصرار کررہے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، یہ سب حضرات متاع کی وہی تعبیر وتشریح کررہے ہیں جو جمہور علماء کرتے چلے آئے ہیں، نمونہ کے طور پر وزیر موصوف کی صرف ایک مغالطہ انگیزی ذکر کرتا ہوں تاکہ انصاف پسند قارئین اسی کی روشنی میں ان کے دوسرے حوالوں کی قدر وقیمت سے بھی واقف ہوجائیں۔

مولانا دریابادی کے ترجمہ سے استدلال

مولانا عبدالماجد دریابادی نے سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں متاع کا ترجمہ ''خرچہ'' کیا ہے، موصوف متاعا بالمعروف حقا علی المحسنین کا ترجمہ کرتے ہیں ''یہ خرچ شرافت کے موافق ہو (اور یہ) واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر'' پس پھر کیا تھا ہمارے وزیر صاحب اچھل پڑے کہ ہمارا دعویٰ ثابت ہے، انہوں نے مولانا دریابادی کا نام بار بار لیا کہ مولانا دریابادی کا ترجمہ بڑا مستند ہے، ''رابطہ عالم اسلامی'' سے تصدیق شدہ ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مطلقہ کو نکاح ثانی تک نان نفقہ ملنا چاہئے، آیئے ذرا مطالعہ کریں کہ مولانا دریابادی نے خود اپنے ترجمہ خرچ کی کیا تشریح کی ہے، اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(متعوھن کا لفظ قرآن میں عام ہے اور مذاق بشری کی ہمہ گیری اس عموم کو چاہتی بھی ہے، أي ملكوهن ما يتمتعن به وذلك الشيئ يسمى متعه (روح) متعة الطلاق أعلاها الخادم ودون ذلك الورق و دون ذلك الكسوة (روح عن ابن عباس) أدنى ما يكون من المتعة ثلاثون درهما (روح عن ابن عمر) البتہ فقہاء نے یہاں عموماً تین کپڑوں کا جوڑا مراد لیا ہے، لیکن خود یہ جوڑا ابھی یقیناً حسب رواج ملک وقوم ہوگا) (القرآن الحکیم مع ترجمہ وتفسیر از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی) مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹیڈ،

لاہور وکراچی)

مولانا دریابادی مرحوم نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ متعہ کپڑوں میں منحصر نہیں تفسیر روح المعانی کے ایک عربی عبارت پیش کی ہے، ہم اس کا ترجمہ لکھ دیتے ہیں تاکہ فریب کاری کا پردہ بالکل چاک ہوجائے (مطلقہ عورتوں کو ایسی چیز کا مالک بناؤ جس سے وہ نفع اٹھائیں، اسی دی ہوئی چیز کو متعہ کہتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے متعہ کی تفسیر فرمائی کہ سب سے اعلیٰ متعہ خادم ہے، اوسط درجہ کا متعہ چاندی کے روپے، ادنی درجہ کا متعہ پوشاک ہے، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ متعہ کی کم از کم مقدار تیس چاندی کے روپئے (دراہم) ہیں۔

شاید وزیر صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ میدان سیاست میں جو مغالطہ انگیزیاں چل جاتی ہیں میدانِ علم وتحقیق میں ان کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی۔

تین طلاق کی غیر متعلق بحث

پارلیمانی تقریر میں عارف صاحب نے طلاق ثلاثہ کی غیر متعلق بحث چھیڑ کر اپنا اور باوقار پارلیمنٹ کا بڑا وقت ضائع کیا، بنات والا کا ترمیمی بل نفقہ مطلقہ اور دفعہ ۱۲۵ سے متعلق تھا اور وزیر موصوف نے طریق طلاق، اقسام طلاق اور طلاق ثلاثہ کی بحث چھیڑ کر وہ وہ ''گل افشانیاں'' کیں کہ الامان والحفیظ! (دو تین اقتباس دل پر جبر کرکے پڑھ لیجئے)

> ''اس سے الگ ہوکر قرآن وسنت سے الگ بھی کتنے قوانین ایسے ہیں جن کی سیدھی بنیاد قرآن وسنت نہیں ہے، جیسے طلاق دینے کا جو طریقہ ہے، جب تین بار طلاق دے دی جائے تو وہ طلاق افیکٹیو ہوگی، اس کا تصور قرآن نہیں کرتا، حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں یہ طریقہ رائج نہیں تھا، ابوبکر صدیق کے زمانہ میں یہ طریقہ نہیں تھا، اب میں کہتا ہوں کہ یہ ستم ظریفی ہوئی ہے قسمت کی کہ عمرؓ بن الخطاب نے اس کی اجازت دی۔''
>
> ''حضرت عمرؓ بن الخطاب نے اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس

رائے کو بہتر سمجھا اس کے لئے انہوں نے قرآن کا جو طریقہ تھا اس میں تبدیلی کی اور جو حضرت ابوبکرؓ صدیق کا طریقہ تھا اس میں تبدیلی کی۔''

انہوں نے غیر متعلق بحث چھیڑ کر اصل مسئلہ کو نظر انداز کرنا اور الجھانا چاہا ہے، اس لئے ہم بھی اس غیر متعلق بحث میں قارئین کا زیادہ وقت لینا پسند نہیں کرتے، لیکن اس خیال سے کہ شاید ان کی مغالطہ انگیزیوں سے ہمارے بعض اردو خواں نوجوان شک وشبہ میں گرفتار ہو گئے ہوں اس مسئلہ پر بہت مختصر طور پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

احکامِ شریعت میں تبدیلی کا اختیار کسی کو نہیں

ایک عام مسلمان کو بھی معلوم ہے کہ قرآن وسنت میں جو احکام صاف اور صریح طور پر آ گئے ہیں ان میں تبدیلی کا اختیار کسی بھی شخصیت کو حاصل نہیں ہے خواہ وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہی کیوں نہ ہوں، اگر قرآن یا حدیث میں یہ حکم آ گیا ہوتا کہ وہی طلاق معتبر اور واقع مانی جائے گی جو ایک طہر میں ایک بار دی جائے، اور ایک مجلس یا ایک طہر میں دی ہوئی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی اور عہد صدیقی میں بھی اسی پر عمل ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ قطعاً اس کو بدلنے کی جرأت نہ کرتے، حضرت عمرؓ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ''شیطان اس راہ سے کترا جاتا جس سے حضرت عمرؓ کا گذر ہوتا ہے'' دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

''إن الله جعل الحق على لسان عمر وقلبه۔'' [ترمذی، کتاب المناقب، حدیث:۳۶۸۲]

''بیشک اللہ نے عمر کی زبان اور دل پر حق جاری کیا ہے۔''

ایک اور موقع پر زبان رسالت سے یہ بلند کلمات صادر ہوتے ہیں:

''لو كان بعدي نبي لكان عمر بن الخطاب۔'' [ترمذی، حدیث:۳۶۸۶]

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔''

جس شخصیت کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے اتنی بلند شہادتیں دی ہوں ان پر یہ کتنا سنگین اور بدبختانہ الزام ہے کہ انہوں نے قرآن وسنت اور اجماع امت سے ثابت شدہ حکم اپنی طرف سے تبدیل کر دیا، پھر بات یہیں تک محدود نہیں رہتی بلکہ تمام صحابہ کرام پر اس کی زد پڑتی ہے، صحابہ کرام تو بڑے حق پسند اور بیباک تھے، ان کے لئے تو ممکن ہی نہیں تھا کہ قرآن وحدیث میں ذرا تبدیلی کی جائے، یا قرآن وسنت کے کسی حکم کو معطل ومنسوخ کیا جائے اور وہ خاموش بیٹھے رہیں وہ لوگ اپنی جان پر کھیل کر بھی قرآن سنت کی حفاظت اور حق وصداقت کی حمایت اپنا فریضہ سمجھتے تھے، صحابہ کرام کی پوری تاریخ ہمارے اس دعوی کی شاہد ہے۔

ذرا غور کیجئے

ذرا غور کیجئے کہ اگر واقعی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نعوذ باللہ طلاق کے سلسلہ میں قرآنی حکم اور طریقہ کو بدلا ہوتا تو ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا، ہر طرف سے مخالفت کی آوازیں بلند ہو جاتیں لیکن حدیث اور تاریخ وسوانح کا پورا ذخیرہ چھان ڈالئے آپ کو کسی صحابی کے بارے میں کوئی ایسی روایت نہیں ملے گی کہ انہوں نے طلاق ثلاثہ کے بارے میں حضرت عمرؓ کے موقف کو قرآن وسنت اور اجماع کے مخالف قرار دے کر مسترد کر دیا ہو بلکہ ہمیں تمام فقہاء صحابہ اس مسئلہ میں ان کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔

صحابہ سے بے اعتمادی

ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بارے میں عارف صاحب کی بیان کردہ تفصیل کو صحیح تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نعوذ باللہ دین کے بارے میں خلفاء راشدین اور صحابہ کرام پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں کہ خدا جانے خلفاء راشدین نے قرآنی احکام میں کیا کیا تبدیلیاں کی ہوں اور نعوذ باللہ تمام صحابہ نے مداہنت سے کام لے کر اسے خاموشی سے تسلیم ہی نہ کیا ہو بلکہ اس کی بھرپور تائید بھی کی ہو، پھر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ قرآن وحدیث اور اسلامی احکام کا ذخیرہ ہم تک اپنی اصلی حالت میں پہنچا ہے، صحابہ کرام سے اعتماد اٹھ جانے کے بعد بعد

والے طبقات پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

ایک مجلس کی تین طلاق کا حکم

اس سے ہمیں اختلاف نہیں کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینا مکروہ تحریمی اور گناہ ہے، اسی طرح مدخولہ عورت کو حیض کے زمانہ میں طلاق دینا باعث گناہ ہے اسی لئے فقہاء نے ان دونوں طلاقوں کو طلاق البدعۃ میں شمار کیا ہے لیکن کسی کام کے گناہ یا مکروہ قرار دیے جانے کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت اس عمل کا اعتبار نہ کرے اور اسے بالکل مسترد قرار دے، قرآن وسنت پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہمیں بے شمار افعال ملتے ہیں جنہیں شریعت نے ممنوع اور حرام قرار دیا ہے، پھر بھی اگر کوئی مسلمان اسے کر ڈالے تو وہ کام شریعت کی نظر میں معتبر مانا جاتا ہے اور اس پر احکام جاری ہوتے ہیں، عورت سے ظہار کرنا، اذان جمعہ کے بعد خرید وفروخت کرنا، حیض کی حالت میں طلاق دینا، یہ سب چیزیں شرعاً ممنوع ہیں لیکن مسلمان ان میں سے کوئی کام اگر کر لیتا ہے تو شریعت اسے معتبر مان کر احکام جاری کرتی۔

حیض کے زمانہ میں طلاق دینا قرآن وحدیث کی روشنی میں ممنوع ہے لیکن حضرت عبداللہؓ بن عمر کا یہ واقعہ حدیث کی تمام مستند کتابوں میں موجود ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں ایک طلاق دی، حضرت عمرؓ نے نبی اکرم ﷺ کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو اس پر نبی اکرم ﷺ نے خفگی کا اظہار فرمایا اور حضرت عمرؓ سے فرمایا: ان سے کہو طلاق سے رجوع کرلیں، اور اگر طلاق دینا ہی ہے تو طہر کے زمانہ میں طلاق دیں، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حالت حیض کی طلاق کو ممنوع ہونے کے باوجود معتبر مانا تبھی تو ابن عمرؓ کو رجوع کرنے کا حکم دیا، اسی لئے امام بخاری نے ابن عمرؓ کے مذکورہ بالا قصہ پر عنوان قائم کیا ہے (باب اس چیز کے بیان میں کہ اگر حیض والی عورت کو طلاق دے دی گئی تو اس طلاق کا اعتبار کیا جائے گا) صحیح مسلم میں بھی اسی قسم کا عنوان قائم کیا گیا ہے، تمام دوسرے محدثین نے بھی اس واقعہ کو زمانۂ حیض کی طلاق معتبر ہونے کے سلسلہ میں ذکر فرمایا۔

تین طلاق کا مسئلہ خیر القرون

اتنی بات تو صحیح ہے کہ عہد نبوی میں ایک مجلس میں تین طلاق دینے کا عمومی رواج نہیں تھا، کیونکہ صحابہ کرام اللہ اور رسول کے احکام پر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے لیکن یہ سمجھنا کہ عہد نبوی میں طلاق کے ایسے واقعات بالکل نہیں پیش آئے ذخیرۂ حدیث سے بڑی بے خبری کی بات ہے، ممانعت نہ معلوم ہونے کی بنا پر یا غصہ سے بے قابو ہوکر بعض صحابہ کرام نے ایک مجلس میں بلکہ ایک جملہ میں تین یا اس سے زائد طلاقیں دیں اور اس طرح کے معاملات نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش ہوئے تو نبی اکرم ﷺ نے ان اقوام پر ناراضگی کا اظہار تو فرمایا لیکن ان طلاقوں کو غیر معتبر نہیں قرار دیا بلکہ صراحۃً یا خاموش رہ کر ان طلاقوں کے معتبر ہونے کا اعتراف کیا اور حرمت غلیظہ کا حکم لگایا، حدیث کی تمام مستند کتابوں بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، مصنف ابن شیبہ، سنن دار قطنی، سنن بیہقی، طبرانی، مصنف عبدالرزاق، کنز العمال، جمع الجوامع وغیرہ میں اس قسم کے واقعات مل جائیں گے، نمونہ کے طور پر ہم چند واقعات کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم حضرت عویمر عجلانی کا واقعہ بخاری شریف اور اکثر صحاح میں موجود ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی سے لعان کرنے کے بعد نبی اکرم ﷺ سے اجازت لئے بغیر آپ ﷺ کی موجودگی میں تین طلاق دے دی، نبی اکرم ﷺ نے اس پر یہ نہیں فرمایا کہ ایک مجلس میں تین طلاق معتبر نہیں ہوتی ہے بلکہ خاموش رہ کر اس کے معتبر ہونے کی سند عطا فرمائی، امام بخاری نے حدیث بالا کو اس عنوان کے تحت ذکر کیا ''تین طلاق کے نافذ ہونے کا باب'' اس باب کے تحت دو حدیثیں اور لائے ہیں۔

طبرانی اور سنن بیہقی کی روایت ہے کہ عائشہ بنت الفضل حضرت حسنؓ بن علی کے نکاح میں تھیں، حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جب حضرت حسنؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو ان کی بیوی عائشہ بن الفضل نے انہیں مبارک باد پیش کی، اس پر حضرت حسنؓ نے برہم ہوکر فرمایا کہ

تم امیر المؤمنین حضرت علیؓ کے قتل پر اظہار خوشی کر رہی ہو" تمہیں تین طلاق ہے" اس کے بعد حضرت حسنؓ کو طلاق دینے پر افسوس ہوا اور فرمایا اگر میں نے اپنے والد کے واسطے سے نانا جانﷺ کا یہ فرمان نہ سنا ہوتا تو تم سے رجوع کر لیتا کہ کوئی مرد اپنی بیوی کو تین طہر میں تین طلاق دے یا ایک ساتھ تین طلاق دے بیوی اس کے لئے حرام ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ دوسرے شوہر سے نکاح کر لے۔

مصنف عبدالرزاق کی روایت ہے جسے ابن ہمام نے فتح القدیر میں اور ابن نجیم نے البحر الرائق میں نقل کیا ہے کہ عبادہؓ بن صامت کے والد نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دے دی، حضرت عبادہؓ نے نبی اکرمﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا تو حضورﷺ نے فرمایا: ان کی بیوی ان کے نکاح سے تین طلاق کے ساتھ خارج ہو گئی وہ معصیت میں مبتلا ہو گئے، اور نو سو ستانوے طلاقیں ظلم و سرکشی بن کر صادر ہوئیں، اللہ چاہے تو انہیں معاف کر دے اور چاہے تو عذاب میں مبتلا کر دے۔

ذخیرہ حدیث پر جس کی نظر ہو وہ اتنی بے وزن بات کبھی کہہ ہی نہیں سکتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں ایک مجلس میں تین طلاق دینے کے واقعات پیش ہی نہیں آئے، یا پیش آئے لیکن نبی اکرمﷺ اور ابوبکرؓ صدیق نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک قرار دیا، بیچارے عارف محمد خاں اس کوچے سے بالکل ناواقف تھے، ان کے کسی بدخواہ مشیر نے انہیں بدنام کرنے کے لئے ادھر ادھر سے ناقص اور غلط معلومات فراہم کر کے انہیں اس میدان میں جھونک دیا، ہمیں ان کی حالت پر ترس آ رہا ہے، جس علم و فن سے انسان بالکل ناواقف ہوتا ہے اس میں رائے زنی کرنے سے وہی مضحکہ خیز، قابل رحم صورت پیش آتی ہے جو عارف خاں کے ساتھ پیش آئی کہ انسان ناواقفیت کی بنا پر کوئی غلط اور بھونڈی بات کہہ جاتا ہے پھر اس غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے غلطیوں کا طومار لگا دیتا ہے اور لوگ اس کی باتوں پر ہنستے ہیں، اس کا حال بالکل اس پرندہ کا سا ہے جس کا پر شکاری کے جال میں پھنس گیا ہے، اب وہ جس قدر الٹتا پلٹتا اور پرواز کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی جال میں پھنستا جاتا ہے۔

بنیادی اصطلاحات سے بے خبری

قارئین کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مرکزی وزیر عارف محمد خاں صاحب طلاق کے سلسلے کی بنیادی اصطلاحات سے بے خبر ہیں، پھر بھی طلاق کے مسئلہ پر داد تحقیق دینے چلے ہیں، بلٹز (۱۴ ستمبر ۱۹۸۵ء میں شائع شدہ اپنے انٹرویو میں بڑے طمطراق سے کہتے ہیں:
"دراصل یہ مسئلہ طلاق بائن کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، اور طلاق بائن غیر قرآنی طریقہ ہے، اس کا رواج نہ حضورﷺ کے زمانے میں تھا نہ خلیفہ اول کے دور میں، حضرت عمرؓ کے اولین دور میں بھی طلاق بائن رائج نہ تھی بعد میں حضرت عمرؓ ہی نے تین بار طلاق بائن کی اجازت دی۔"

دینیات کے ابتدائی طالب علم بھی اس اقتباس کو پڑھ کر اپنی ہنسی نہیں روک سکتے، ہمارے وزیر صاحب نے طلاق بائن کو سرے سے غیر قرآنی طریقہ قرار دیا، لیکن اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ بتانے والے نے ان کو یہی بتایا ہوگا کہ صرف ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق کو طلاق بائن کہتے ہیں، حالانکہ قرآن و حدیث اور فقہ کا ابتدائی طالب علم بھی طلاق بائن کی یہ تعریف جانتا ہے کہ "جس طلاق کے بعد شوہر کو رجوع کا اختیار نہیں ہوتا اسے طلاق بائن کہتے ہیں" خواہ ایک طلاق ہو یا دو یا تین، طہر میں دی گئی ہو یا حیض میں، ایک طہر میں دی گئی ہو یا تین طہروں میں، ایک نشست میں دی گئی ہو یا مختلف نشستوں میں، طلاق بائن کی یہ تعریف فقہ کی کسی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے، سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۹، ۲۳۰ جس کا موصوف نے حوالہ دیا ہے اس میں بھی طلاق بائن کا ذکر ہے، ایک یا دو بار طلاق دینے کے بعد عدت میں رجوع نہیں کیا تو بائن ہو گئی جسے قرآن نے "تسریح باحسان" سے تعبیر کیا ہے، دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق دے دی تو طلاق بائنہ ہو گئی جسے قرآن نے اس طرح تعبیر کیا ہے "فإن طلقها فلا تحل الخ"۔

عارف محمد خاں کی پارلیمانی تقریر اور انٹرویو کا جائزہ خاصا طویل ہو گیا، اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ موصوف نے اپنی طویل ترین پارلیمانی تقریر میں اصل مسئلہ سے توجہ

ہٹانے کے لئے زیادہ تر غیر متعلق مسائل چھیڑے ہیں، صرف دو تین کالم نفقہ مطلقہ اور ترمیمی بل کے بارے میں ہیں اور ان میں بھی مغالطہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔

خدا کرے عارف محمد خاں کو اپنی بے جا جسارت کا احساس ہو اور وہ اپنے باطل گمراہ کن خیالات سے توبہ کر کے اپنے موجودہ طرزِ عمل کو ترک کر دیں، قرآن کی من مانی تاویل اور قانون اسلامی کی غلط تشریح پر نادم ہو کر باری تعالیٰ سے توبہ و استغفار کریں، ان کے طرز عمل سے ملت اسلامیہ کو جو نقصان پہنچ چکا ہے اس کی تلافی کی کوشش کریں۔

☆☆☆☆

اصغر انجینئر کے مضمون
''قرآن میں عورت کا درجہ''
کا
عملی جائزہ

اصغر علی انجینئر کے مضمون ''قرآن میں عورت کا درجہ'' کا علمی جائزہ

ہفتہ وار بلٹز میں آصف علی انجینئر نے ''قرآن میں عورت کا درجہ'' کے عنوان سے قسطوار مضمون شائع کیا، آٹھ قسطوں میں یہ مضمون مکمل ہوا، ۲۴/اگست ۱۹۸۵ء کے شمارہ سے شروع ہوکر ۱۲/اکتوبر ۱۹۸۵ء کے شمارہ میں آخری قسط منظر عام پر آئی، بلٹز نے بڑی اہمیت اور بڑے آب وتاب سے یہ مضمون شائع کیا۔

مضمون نگار کے نام کے ساتھ ''مشہور دانشور اور مفکر'' کا لیبل چسپاں کیا جاتا رہا۔ یہ پورا مضمون قرآن کے معنی میں تحریف اور من مانی تفسیر وتاویل کا بدترین نمونہ ہے۔ ''مشہور مفکر اور دانشور صاحب'' نے صرف جرم تحریف ہی کا ارتکاب نہیں کیا ہے بلکہ دو ایسی زبردست قینچیاں تیار کرلی ہیں جن کے ذریعہ قرآن کی جس آیت اور جس حکم کو چاہیں کاٹ چھانٹ کر بے اثر بنادیں اور اپنی جس خواہش اور جس باطل نظریہ کو چاہیں قرآن کی طرف منسوب کردیں اس مضمون میں بڑی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی کے ساتھ اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلایا گیا ہے اور قرآن کو منسوخ ومعطل کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، مضمون میں قدم قدم پر مشہور ''دانشور'' صاحب کی ''بے دانشی'' کے عبرت ناک مناظر موجود ہیں۔ ہم اس

مضمون میں انجینئر صاحب کے ''معرکۃ الآراء'' مضمون کا جائزہ لینے جارہے ہیں تاکہ قارئین حق وصداقت سے واقف ہوجائیں اور انجینئر صاحب کے باطل نظریات کا اثر قبول نہ کریں۔

قرآن قیامت تک کے لئے کتاب ہدایت

جائزہ شروع کرنے سے پہلے ہم اسلام اور قرآن کے بارے میں چند بنیادی باتیں لکھ دیتے ہیں جو اہل حق مسلمانوں کے یہاں متفق علیہ ہیں۔ اسلام وہ آخری مذہب ہے جو قیامت تک انسانوں کی رہبری اور رہنمائی کے لئے بھیجا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين﴾ [سورۂ آل عمران: ۸۵]

''اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کرے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔''

قرآن وہ آخری آسمانی صحیفۂ ہدایت ہے جو قیامت تک انسانیت کی رہبری کا فریضہ انجام دیتا رہے گا، قرآن کی تعلیمات واحکام ہر ملک اور ہر زمانہ میں واجب العمل ہیں، قرآن کے احکام وقوانین میں قیامت تک پیش آنے والے حالات کی پوری رعایت موجود ہے قرآن میں ذکر کردہ احکام کی حیثیت ابدی اور دائمی ہے وقتی اور ہنگامی نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ قرآن کے الفاظ ومعانی دونوں کو شامل ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے مفسر وشارح

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو جس طرح قرآن کی تبلیغ وتلاوت کی ذمہ داری سونپی تھی، اسی طرح معانی قرآن کی تشریح وتفسیر کا اہم کام بھی انہیں کے سپرد کیا تھا، نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو الفاظ قرآن کے ساتھ ساتھ معانی ومطالب کی بھی پوری تعلیم دی، نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی قرآن کی عملی تفسیر تھی، اس لئے نبی اکرم ﷺ کے اقوال وافعال، اس

کے بعد صحابہ کرام کے آثار کو تفسیر قرآن کے سلسلہ میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے، قرآن کے کسی لفظ یا آیت کی ایسی تفسیر جو نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کرام سے منقول تفسیر کے خلاف ہو ہرگز قابل قبول نہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

(وقد تبين بذلك أن) من فسر القرآن أو الحديث وتأوله على غير التفسير المعروف عن الصحابة والتابعين فهو مفتر على الله، ملحد في آيات الله، محرف للكلم عن مواضعه، وهذا فتح لباب الزندقة والإلحاد وهو معلوم البطلان بالاضطرار من دين الإسلام۔" [فتاوی ابن تیمیۃ، ج ۱۳، ص: ۲۴۳]

"جو شخص قرآن یا حدیث کی ایسی تشریح کرے جو صحابہ وتابعین سے منقول تشریح کے خلاف ہو وہ اللہ تعالیٰ پر افتراء کرنے والا، اللہ کی آیتوں میں الحاد کرنے والا اور قرآن وحدیث میں تحریف کرنے والا ہے، ایسا کرنا بددینی اور الحاد کا دروازہ کھولنا ہے اس کا باطل ہونا بداہۃً معلوم ہے۔"

محض رائے وقیاس اور صرف لغت کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر

مفسر قرآن کے لئے جو بنیادی شرطیں ہیں ان پر پورا اترے بغیر محض اپنی رائے وقیاس یا محض عربی لغت کے سہارے قرآن کی تفسیر کرنا سنگین جرم ہے ایسا کرنے والے کا ٹھکانہ جہنم ہے، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من قال فی القرآن بغير علم وفی رواية برأيه فليتبوأ مقعده من النار۔" قال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح۔ (ترمذی أبواب تفسیر القرآن، باب ماجاء فی الذي يفسر القرآن برأيه، حدیث: ۲۹۵۰)

"جس نے محض رائے وقیاس سے قرآن کی تفسیر کی اس نے جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالیا۔"

انجینئر صاحب کے دو اصول

اصغر علی انجینئر کے طویل مضمون میں دو اصول کارفرما نظر آتے ہیں دونوں اصول اصغر علی انجینئر کے بنائے ہوئے ہیں، ان کا ثبوت نہ قرآن سے ہے نہ حدیث سے، نہ کسی مجتہد یا مفسر کے کلام سے، بلکہ قرآن کی بیشمار آیات، احادیث کا ذخیرہ اور امت مسلمہ کا اجماع ان دونوں اصولوں کی تردید کرتے ہیں، انجینئر صاحب نے اپنے وضع کئے ہوئے ان اصولوں کے سہارے قرآنی آیات پر خوب خوب ہاتھ صاف کیا ہے اور قرآنی آیات کو منسوخ یا معطل کرنے کا "زبردست کارنامہ" انجام دیا ہے، آئیے آپ بھی ان دونوں اصولوں اور ان کی "کرشمہ سازیوں" کو ملاحظہ فرمائیے۔

آیات قرآنی کی ایک نئی تقسیم

انجینئر صاحب لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کی بعض آیات حالات کے سیاق وسباق میں نازل ہوئی ہیں جنہیں ہم انگریزی میں (Contentual Verses) کہیں گے اور بعض آیات معیاری اور ماورائی ہیں جنہیں ہم (Normative) کا نام دیں گے، سیاق وسباق والی آیات حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر نازل ہوئی ہیں اور حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ موجودہ حالات کو نظر انداز نہ کیا جائے، اگر موجودہ حالات کو نظر انداز کیا گیا تو وہ تعلیمات فیصلہ کن طریقے سے موجودہ سماجی ڈھانچے پر اثر انداز نہیں ہوسکیں گی، رسول اکرم ﷺ کے بہت سے فرمودات کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔"

[بلٹز ۲۴ راگست ۱۹۸۵ء، صفحہ ۵، کالم ۱،۲]

اسی مضمون میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"یہ (قرآن) ہدایت کی بھی کتاب ہے اور حکمت کی بھی، قرآن

مجید کے کچھ احکام بر بنائے حکمت زمان ومکان کے حدود کا لحاظ کرتے ہیں
اور کئی احکامات زمان ومکان کے اعتبار سے ماورائی اہمیت رکھتے ہیں۔''
[۲۱/اکتوبر ۱۹۸۵ء، صفحہ ۵، کالم ۴]

مسلمانوں کا تو متفقہ عقیدہ ہے کہ قرآن کی چند آیات اور چند احادیث کے علاوہ جن کا منسوخ ہونا قرآن وسنت سے ثابت ہے پورا قرآن اور تمام احادیث ہر زمانہ اور ہر ملک میں مسلمانوں کے لئے واجب العمل ہیں، قرآن وحدیث میں جو تعلیمات دی گئی ہیں وہ ہر قوم وملت، ہر زمان ومکان، ہر ملک اور سماج کے لئے ہیں۔ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین میں قیامت تک پیش آنے والے حالات کی رعایت موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی صورت میں ایسا صحیفۂ ہدایت انسانوں کو عطا فرمایا ہے جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں قابل عمل اور دنیا وآخرت کی کامیابی کا ضامن ہے، اللہ کے بنائے ہوئے قوانین انسان کے وضع کردہ قوانین کی طرح نہیں ہیں جن میں ہر سال دوسال میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے لیکن انجینئر صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن کا ایک حصہ ماورائی اور دائمی ہے مگر ایک حصہ وقتی اور ہنگامی ہے جو خاص طور سے نزولِ قرآن کے وقت عرب سماج کے جو حالات اور تقاضے تھے انہیں مدنظر رکھ کر نازل ہوا، لہذا قرآن کی جو آیتیں عرب کے مخصوص حالات کی بنا پر نازل ہوئیں انہیں ہر زمانہ اور ہر ملک میں نافذ نہیں کیا جانا چاہئے۔

دائمی آیات اور ہنگامی آیات

قرآنی آیات کی یہ بالکل نئی تقسیم پہلی بار انجینئر صاحب کے نوک قلم سے سامنے آئی ہے، نہ قرآن نے کوئی ایسی صراحت کی کہ ماورائی، دائمی آیات یہ ہیں اور ہنگامی آیات یہ ہیں، اور نہ ہی ذخیرۂ احادیث میں کہیں اس تقسیم اور تفصیل کا سراغ ملتا ہے، لہذا انجینئر صاحب کے بہ قول ہر کس وناکس اور ہر بوالہوس اور دانشور کو اختیار ہے کہ جس آیت اور جس حدیث کو چاہے ہنگامی اور وقتی سمجھ کر نا قابل عمل اور معطل قرار دے، انجینئر صاحب کے اس

خود ساختہ اصول کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآن وحدیث کھلونا بن جائیں گے اور ہر ملک اور ہر قوم ہی کا نہیں بلکہ ہر شخص کا اپنا ایک الگ اسلام ہوگا، جرأت اجتہاد کی داد دیجئے کہ موصوف قرآن کے بارے میں اتنا جادوئی اور سنسنی خیز اصول بیان کرتے ہیں اور کوئی فرضی دلیل پیش کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

انجینئر صاحب کی تیار کردہ جادوئی چھڑی کی جو کرشمہ سازیاں خود ان کے اس مضمون میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں اس کے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔

اسلام میں عورت کا مقام اور مرد وعورت کا باہمی رشتہ

اسلام نے عورت کو ان تمام مظالم سے نجات دلائی جو اسلام سے پہلے اس صنف نازک پر پوری دنیا میں ڈھائے جارہے تھے، انہیں سارے انسانی حقوق دلائے اور اپنے قانون میں عورتوں کے مفادات کا پورا لحاظ کیا، قرآن کا یہ اعلان ﴿**ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف**﴾ [سورۂ بقرہ: ۲۲۸ کا جزء] (اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے مطابق) دنیا کا بڑا انقلاب آفریں اعلان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جو مرد، عورت دونوں کا خالق اور دونوں کی صلاحیتوں اور جنسی خصوصیات سے بخوبی واقف ہے اس نے عورت کے حقوق کا اعلان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ﴿**وللرجال عليهن درجة والله عزيز حكيم**﴾ [سورۂ بقرہ، آیت: ۲۲۸] (اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا)۔

مرد کی اس فضیلت کی تفصیل سورہ نساء کی آیت ۳۴ کے اس ٹکڑے میں ہے ﴿**الرجال قوامون على النساء بماء فضل الله بعضهم على بعض وبما أنفقوا من أموالهم**﴾ (مرد عورتوں کی نگہداشت کرنے والے ہیں اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال) اسی آیت کا اگلا ٹکڑا ہے۔

﴿**فالصلحت قانتت حفظت للغيب بما حفظ الله والتى تخافون**

نشوزهن فعظوهن واهجروهن في المضاجع واضربوهن فإن أطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا إن الله كان عليا كبيرا﴾[نساء:۳۴]

"سو نیک بیویاں اطاعت کرنے والی اور پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم ان کی سرکشی کا علم رکھتے ہو تو انہیں نصیحت کرو، اور انہیں خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو، اور انہیں مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان کے خلاف بہانے نہ ڈھونڈو، بیشک اللہ بڑا رفعت والا ہے، بڑا عظمت والا ہے۔"

مرد اور عورت میں تقسیم کار

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنس مرد اور جنس عورت کی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر دونوں کی ذمہ داریاں تقسیم کردی ہیں تاکہ خاندانی نظام حسن وخوبی کے ساتھ قائم رہے، عورت پر خانگی امور کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ اولاد کی پرورش اور تربیت میں اپنی تمام تر صلاحیتیں استعمال کرے اور مرد کو حکم ہے کہ تجارت، زراعت، صنعت، ملازمت، محنت مزدوری جس طرح ممکن ہو بیوی اور بچوں کے اخراجات فراہم کرے پھر جس طرح ہر اجتماعی نظام کے لئے ایک سربراہ کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے عائلی نظام میں اس ذمہ داری کے لئے مرد کو منتخب فرمایا کیونکہ عموماً مردوں میں علمی وعملی صلاحیتیں عورتوں اور بچوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔

مرد چونکہ عائلی نظام میں زیادہ ذمہ داری سنبھالتا ہے اس لئے بھی گھر کی سربراہی کے لئے اسی کا انتخاب موزوں تھا، مرد کی سربراہی کا ایک ثمرہ یہ بھی ہے کہ اگر عورت کی طرف سے نافرمانی اور مسلسل سرکشی کا ظہور ہو تو گھریلو نظام درست رکھنے کے لئے حق تعالیٰ نے شوہر کو مناسب سرزنش اور تنبیہ کا بھی اختیار دیا، شوہر کو تعلیم دی گئی کہ عورت کی نافرمانی کی صورت میں ان کی اصلاح کا پہلا درجہ یہ ہے کہ نرمی سے انہیں سمجھاؤ، اگر محض سمجھانے سے باز نہ آئیں تو ان کا بستر الگ کردیں تاکہ عورت شوہر کی ناراضگی کا احساس کر کے اپنے رویہ پر

شرمندہ ہو اور راہِ راست پر آجائے، اس شریفانہ سزا سے اگر عورت متأثر نہ ہو تو ناگزیر تدبیر کے طور پر شوہر کو معمولی مار مارنے کی بھی اجازت ہے جس سے اس کے بدن پر داغ نہ پڑے، ہڈی ٹوٹنے اور زخم لگنے کی نوبت نہ آئے، چہرہ پر مارنے سے مطلقاً منع کیا گیا ہے ناگزیر حالات میں معمولی طور پر مارنے کی اجازت تو ہے مگر نبی اکرم ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا اور اس حکیمانہ اسلوب میں اپنی اس منشاء کا اظہار فرمایا (ولن يضرب خياركم) (اچھے مرد مارنے کی سزا عورتوں کو نہیں دیں گے)۔

مرد کو ایک گونہ فضیلت اور گھر کی سربراہی کا منصب اس کی خداداد صلاحیتوں اور زائد کارکردگی کی بنا پر دنیا کی زندگی میں دیا گیا ہے، ورنہ اچھے اور برے عمل کی جزا وسزا اور درجات آخرت میں دونوں برابر ہیں آخرت میں اگر کسی کو فضیلت حاصل ہوگی تو ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے، مرد یا عورت ہونے کی وجہ سے نہیں۔

وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم انسانی ذہن

انسانی ذہن وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم ہونے کے بعد حقیقت وصداقت سے بہت دور ہوجاتا ہے، خداوندی رہنمائی کو نظر انداز کرنے اور بھلانے کے بعد ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے کسی بھی مسئلہ پر سوچتے وقت نقطۂ اعتدال سے ہٹ کر افراط وتفریط میں مبتلا ہوجاتا ہے، عورت کے منصب ومقام کے بارے میں بھی انسان کے وضع کردہ مذہب اور فلسفے اسی افراط وتفریط میں مبتلا ہوئے، زمانہ قدیم میں وحی الٰہی سے محروم مفکرین عورت کو انسان ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، روما کی بعض مجلسوں میں تبادلۂ خیالات اور مشورے کے بعد طے پایا کہ عورت ایک ناپاک جانور ہے جو انسانی روح سے خالی ہے، اسلام سے پہلے عورت کی حیثیت گھر میں برتتے جانے والے کسی سامان سے زیادہ نہیں تھی۔

عورت کے منصب ومقام کی نئی حد بندی

اب ادھر دو تین صدیوں سے مغربی مفکرین اور ارباب سیاست نے عورت کے

منصب ومقام کی نئی حد بندی شروع کی تو یہ لوگ دوسری انتہاء پر پہونچ گئے، ان لوگوں نے اس بدیہی حقیقت کا بھی بڑے زور وشور سے انکار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مرد عورت کی جسمانی ساخت اور ظاہری خلقت میں فرق رکھا ہے اسی طرح دونوں کی صلاحیتوں میں بھی فرق رکھا ہے، دونوں کا میدان کار ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہے، ان لوگوں نے مرد اور عورت کے سلسلہ میں تقسیمِ کار کے اس اصول کو بالکل نظر انداز کر دیا جس پر دنیا کا سارا نظام قائم ہے اور مساوات مرد وزن کا خوشنما نعرہ لگا کر یہ دعوی کیا کہ عورت مرد کے شانہ بشانہ ہر میدان میں کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، بڑی بلند آہنگی سے یہ دلیل پیش کی کہ عورت کو گھر کی چہار دیواری میں محصور رکھنا دنیا کی آدھی قوت کارکردگی اور توانائی کو ضائع کرنا ہے، صنفِ نازک کے ان مصنوعی ہمدردوں نے صنفِ نازک پر دوہری ذمہ داری ڈالنی چاہی۔

عورت پر دوہری ذمہ داری

امریکن نومسلمہ مریم جمیلہ لکھتی ہیں:

''آزادی نسواں کا جو پروپیگنڈہ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سنیما کے ذرائع سے کیا جاتا ہے اس میں عورت کی ماں اور بیوی کی حیثیت نظر انداز کر دی جاتی ہے اور عورتوں کا وجود (جو اپنے گھر چلانے اور بچوں کی پرورش میں وقت صرف کرتی ہیں) ناقابل معافی گناہ بتایا جاتا ہے انہیں قوم کی نصف انسانی قوت کے بے کار مشاغل میں صرف کرنے اور معاشی نقصان کا موجب بتایا جاتا ہے، آزادی نسواں کے یہ حامی زور دیتے ہیں کہ ہر لڑکی کو اسکول کالج میں اس طرح تربیت دینا چاہئے کہ دفتر اور فیکٹری میں مرد کا مقابلہ کر سکے، ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی ادعا کرتے ہیں کہ آزاد عورت کا پہلا فرض اپنے گھر کی دیکھ بھال ہے دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید خاتون کو دوہرا بوجھ اٹھانا چاہئے، پورا وقت گھر سے باہر رہ کر نوکری کر کے اپنی روزی کمانے کے علاوہ اس کو اپنے شوہر اور بچوں کے متعلق بھی تمام فرائض کو کما حقہ انجام دینے اور گھر کی تنہا نگہداشت کرنے کی ذمہ داری کو بھی

نبھانا چاہئے، ایک خاتون کے لئے یہ سب کام انجام دینا تقریباً ناممکن ہے، کیا یہ انصاف ہے؟'' [ندائے ملت لکھنؤ، ص۴، ۶/ اکتوبر ۱۹۸۵ء]

مغربی ممالک میں عورت کی صورتِ حال

مساوات مرد وزن کا پرزور پروپیگنڈہ کرنے کے باوجود نہ مغربی بلاک عورت کو مرد کا مدمقابل بنا سکا، نہ کمیونسٹ بلاک، اب تک امریکہ کے منصب صدارت پر ایک بار بھی کوئی عورت فائز نہ ہو سکی اور کمیونسٹ روس کی سربراہی کسی خاتون کو نہیں مل سکی، مغربی ممالک میں اعلی عہدوں پر دس فیصدی بھی عورتیں نہیں ملیں گی، عورتیں اگر کچھ ہیں تو فیکٹریوں، دفاتر، اور ادنی ملازمتوں میں، خلاف فطرت آزادی نسواں کی تحریک سے مغربی ممالک میں نہ تو عورت کو مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑا کیا جا سکا، نہ ملک کی کارکردگی میں قابل ذکر اضافہ ہوا، صرف اتنا ہوا کہ زندگی کے ہر میدان میں مرد وزن کے اختلاف سے ناجائز جنسی تعلقات، عریانیت، بے حیائی کا طوفان امڈ پڑا، بے قید جنسی تعلقات اور اخلاقی جرائم کے نتیجہ میں سماجی ڈھانچہ شکست وریخت کا شکار ہو گیا، عورتوں کے گھر سے نکل آنے سے خانگی نظام درہم برہم ہو گیا، بچوں کی پرورش وپرداخت کے لئے نرسری اور بورڈنگ اسکول قائم کرنے پڑے، بچے ماں کی مامتا اور اس کی مشفقانہ پرورش وتربیت سے محروم ہو گئے، خاندان کے افراد کا ایک دوسرے سے تعلق محض رسمی رہ گیا، نہ والدین کے دلوں میں اولاد کے لئے محبت ودلسوزی رہی، نہ اولاد کے دلوں میں والدین سے لگاؤ اور ان کی عظمت واحترام، ماں باپ ضعیف ومعذور ہونے کے بعد اولاد کے لئے ناقابل برداشت بوجھ معلوم ہونے لگے، معذور والدین کو ساتھ رکھنے کے بجائے ان اداروں کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو ان کے لئے صبح وشام کھانے پینے کا بندوبست کر دیتے ہیں، معذور والدین بڑے کرب والم کی حالت میں ان اداروں میں اپنی زندگی کا بقیہ وقت کاٹتے ہیں۔

آزادیٔ نسواں کا فریب

جولوگ آزادیِ نسواں اور مساوات مرد وزن کے مغربی نظریہ پر ایمان لا چکے ہیں انہیں قرآن کی وہ آیتیں بڑی شاق گذرتی ہیں جن میں مرد کو عورت پر یک گونہ فضیلت دی گئی ہے، یا مرد کو گھر کا سربراہ بتایا گیا ہے، مرد کو شہادت (گواہی) کے بارے میں ممتاز درجہ دیا گیا ہے، اصغر علی انجینئر کا تعلق بھی اسی مساوات زدہ گروہ سے ہے، اس لئے موصوف بھی اس قسم کی آیات پر بہت کڑھتے اور جھنجھلاتے ہیں، واضح طور پر تو آیات کا انکار اس لئے نہیں کرتے تاکہ ناواقفوں کو اپنا مسلمان دانشور ہونا باور کرا سکیں اور اسلام کا لیبل لگا کر سادہ لوح مسلمانوں کو قرآن کے نام پر بہکا سکیں، لہذا انہوں نے اس قسم کی آیتوں کو بے اثر بنانے کے لیے یہ اصول وضع کیا کہ قرآن کی کچھ آیتیں آفاقی اور ماورائی ہیں اور کچھ آیتیں وقتی اور ہنگامی، عورت سے متعلق مذکورہ بالا قسم کی آیتیں وقتی اور ہنگامی تھیں جو عرب کے اس وقت کے مخصوص حالات کے لئے نازل ہوئیں، اس دور میں وہ آیتیں قابل عمل نہیں ہیں۔ یہ بالکل وہی بات ہے جو اسلام دشمن مستشرقین کی طرف سے بار بار کہی جاتی رہی، صرف لب ولہجہ بدلا ہوا ہے کہ قرآنی تعلیمات چودہ سو سال قبل کی وحشی، غیر متمدن عرب قوم کے لئے تھیں اس ترقی یافتہ اور سائنس وٹیکنالوجی کے دور میں قرآنی تعلیمات قابل عمل نہیں ہیں اسلامی عقائد واحکام از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔

آیات قرآنی کے معانی میں تحریف

قرآنی آیات کے بارے میں انجینئر صاحب کی دیدہ دلیری کے چند نمونے ملاحظہ کیجئے اور اسلام کی بے کسی پر ماتم کیجئے:

''قرآن کے گہرے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ انسان کی حیثیت سے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے ان کو بالکل مساوی درجہ دیا گیا ہے، البتہ اس دور کے سماجی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض حیثیت سے عورت اور مرد میں کچھ تفریق ضرور کی گئی

ہے لیکن اس تفریق کی حقیقت اور اس کا منشا ہم اس وقت سمجھ سکتے ہیں جب ہم اس دور کے سماجی ڈھانچے کو مدِ نظر رکھیں۔'' [بلٹز ص ۵ کالم ۳، ۱۴/ اکتوبر ۱۹۸۵ء]

سورۂ نساء کی آیت ۳۴ ﴿الرجال قوامون علی النساء﴾ لکھنے کے بعد انجینئر صاحب رقم طراز ہیں:

''یہ آیت ہم نے یہاں خاص طور پر اس لئے پیش کی ہے کہ ایک طرف اس میں عورتوں پر مردوں کی فضیلت کا ذکر ہے اور دوسری طرف عورتوں کو زدوکوب کرنے کی بھی اس میں اجازت دی گئی ہے عورتوں سے متعلق یہ قرآن مجید میں سخت ترین آیت ہے لیکن اس آیت کو بھی جیسا کہ ہم نے عرض کیا اس کے سماجی سیاق وسباق میں سمجھنے کی ضرورت ہے عورتوں کے سماجی مقام اور ان کے ساتھ برتاؤ سے متعلق اسے ہر دور میں اور ہر حالت میں قطعی اور آخری حکم تصور نہیں کرنا چاہئے۔'' [بلٹز ۱۴/ ستمبر ۱۹۸۵ء صفحہ ۵ کالم ۴]

سورۂ نساء کی اسی آیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انجینئر صاحب لکھتے ہیں:

''آزادی نسواں کے حامیوں کی طرف سے بجا طور پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ عورت کو زدوکوب کرنے کی اجازت دینا ہی جنسی مساوات کے تصور کے خلاف ہے لیکن ہم اپنے دور کے تصورات یا سماجی شعور کو ماضی پر عائد نہیں کر سکتے، یہ بات بنیادی طور پر سماجی اور اصلاحی حکمت کے خلاف ہوگی، ہر دور کے اپنے تصورات ہوتے ہیں اور مخصوص سماجی شعور، ہمیں کسی دور کے سماجی مسائل کے حل کو اس دور کے تصورات یا سماجی شعور کی روشنی میں سمجھنا چاہئے، آیت میں زدوکوب کرنے کی اجازت ہر دور اور ہر حالت میں نہیں ہے اس کا تعلق اس دور کے عرب سماج سے ہے۔'' [بلٹز ۲۱/ ستمبر صفحہ ۷ کالم ۱]

دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر کیوں؟

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں لین دین کے معاملات میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے، یہ بات اصغر علی انجینئر صاحب کو کیسے ہضم ہوتی، وہ تو یہ

ثابت کرنے کے لئے کاغذ قلم لے کر بیٹھے تھے کہ قرآن نے مرد اور عورت کو تمام معاملات میں بالکل برابر کا درجہ دیا ہے اور مرد کو کسی بھی پہلو سے عورت پر ذرہ برابر فضیلت حاصل نہیں اس لئے انہوں نے اس آیت کو بے اثر بنانے کے لئے اپنی وہی تیز دھار والی قینچی پھر استعمال کی جس کے ذریعہ وہ متعدد آیات کو قطع و برید کر چکے تھے، قرآن پاک کی اس صاف وصریح آیت پر بڑی ڈھٹائی اور بے جا جسارت سے انجینئر صاحب ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''پہلے تو ہمیں یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے کہ یہ آیت قرض لینے اور قرض کے سلسلہ میں لکھا پڑھی کر لینے سے متعلق ہے تا کہ آپس میں جھگڑے نہ ہوں اس لئے قرآن مجید ہر چھوٹے بڑے قرض کی لکھا پڑھی کر لینے پر زور دیتا ہے، اس سلسلہ میں شہادت کا ذکر آیا اور یہ ہدایت کی گئی کہ یا تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں شاہد کے طور پر مقرر کر لو۔ ظاہر ہے اس سماج میں عورتیں تجارت اور دیگر مالی امور میں عملی اور فعال حصہ نہیں لیتی تھیں اور انہیں ان معاملات کا زیادہ تجربہ بھی نہیں تھا اس لئے احتیاطاً قرآن مجید میں یہ کہا گیا کہ دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ کر لو تا کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے یا درست کر دے..... بھول کے اس امکان کو نا تجربہ کاری (مالی امور میں) پر ہی محمول کیا جائے گا، عورت کے ذہنی اعتبار سے کم تر ہونے پر نہیں، اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ زچگی اور دیگر عورتوں کے امور میں فقہاء نے عورتوں کی ہی شہادت کو قابل قبول قرار دیا ہے، کیونکہ ان امور میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کو بہتر تجربہ ہوتا ہے دراصل بات تجربہ کی ہے اگر آج عورتوں کو تجارتی اور مالی امور میں بھی خاطر خواہ تجربہ حاصل ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کی گواہی مردوں کی برابری میں قبول نہ کی جائے۔'' [بلٹز ۱۲/اکتوبر ۱۹۸۵ء صفحہ ۵ کالم ۳]

انجینئر صاحب کی الٹی منطق سے کوئی ہوش وخرد رکھنے والا انسان مطمئن نہیں ہوسکتا یہ بات یاد رکھنے کے لئے کہ زید نے عمر سے ایک ہزار (۱۰۰۰) روپئے قرض لئے، تجارتی اور مالی امور میں تجربہ کاری کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے لئے تو قوت یادداشت کی ضرورت ہے

نہ کہ بزنس میں تجربہ کاری کی، قرآن نے خود ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کے گواہ بنانے کی جو حکمت بیان کی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ چونکہ عورت کی عقلی قوت اور یادداشت مرد سے کمزور ہوتی ہے اس لئے قرآن نے دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر مانا، ارشاد خداوندی ہے: ﴿**واستشهدوا شهيدين من رجالكم فإن لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهداء أن تضل إحداهما فتذكر إحداهما الأخرى**﴾ [سورۂ بقرہ آیت: ۲۸۲] (اور گواہ کر دو دو شاہد اپنے مردوں میں سے پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں تا کہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلا دے اس کو دوسری)

جہاں تک زچگی اور عورتوں کے دیگر مخصوص معاملات میں عورتوں کی گواہی قبول کرنے کی بات ہے تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان معاملات میں عورتوں کو زیادہ تجربہ کار تسلیم کر کے یہ حکم دیا گیا ہے بلکہ اس کی بدیہی وجہ یہ ہے کہ شریعت بعض انتہائی ناگزیر حالات کے علاوہ مردوں کے لئے عورتوں کے مخصوص معاملات سے واقفیت اور ان کا مشاہدہ پسند نہیں کرتی تا کہ بے حیائی اور اخلاقی انارکی کو فروغ نہ ہو اس لئے عورتوں کے مخصوص امور میں عورتوں ہی کی گواہی کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

انجینئر صاحب کی دوسری قینچی

قرآنی آیات واحکام کی قطع و برید کے لئے انجینئر صاحب نے جو دوسری قینچی تیار کی ہے اس کا بھی تھوڑا سا حال پڑھئے، واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بندوں کو جو احکام دئے ہیں ان میں بے شمار حکمتیں اور فوائد ہوتے ہیں، اللہ کے مؤمن بندے اللہ کی صفتِ حکمت پر یقین کرتے ہوئے اس کے ہر حکم پر جان ودل نثار کرتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہمارے ذہن کی رسائی ہو یا نہ ہو لیکن اللہ کا ہر حکم بے شمار حکمتوں اور فوائد سے مالا مال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کا التزام نہیں کیا ہے کہ اپنے ہر حکم کی

حکمتیں بیان فرمائے لیکن کہیں کہیں اپنے بعض احکام کی بعض حکمتیں صراحۃً یا اشارۃً بیان فرمادیتا ہے اور احکام کے بعض اسباب کی نشاندہی کردیتا ہے لیکن کسی حکم کے بعض اسباب اور حکمتوں کے نہ پائے جانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ ہم اس حکم کو کالعدم قرار دیدیں۔

انجینئر صاحب علت، سبب، حکمت کے باہمی فرق سے واقف نہیں ہیں انہوں نے تینوں کو ایک سمجھ کر قرآن کے بیان کردہ سبب یا حکمت کے نہ پائے جانے کی صورت میں بھی حکم کو معطل یا موقوف کرنے کی بے جا جسارت کی ہے۔ اس طرح انہوں نے بہت سی آیتوں میں قطع و برید کی ہے، اس تمہید کے بعد ان کا وضع کردہ دوسرا اصول پڑھئے۔

سورۂ نساء کی آیت ۳۴ (جس میں عورت پر مرد کی فضیلت کا ذکر ہے اور جسے انجینئر صاحب عورتوں سے متعلق سب سے سخت آیت قرار دیتے ہیں) پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آیات قرآنی کی ایک اور نئی تقسیم

''قرآن مجید میں دو قسم کی آیتیں ہیں ایک **مدللہ** اور دوسری غیر **مدللہ**، یعنی وہ آیتیں جس میں کسی خاص حکم دئے جانے کی دلیل پیش کی گئی ہے اور وہ آیتیں جس میں کوئی دلیل نہیں پیش کی گئی، اس آیت میں ایک دلیل پیش کی گئی ہے، یعنی عورت پر مرد کو فضیلت بخشنے کی وجہ بیان کی گئی ہے ایک طرف مرد کو قوام یعنی بندوبست کرنے والا قرار دیا گیا ہے جس پر خاندان کی بنیاد قائم ہے اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے فضیلت دیتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ مرد اپنا مال عورتوں کی زندگی کی ضروریات پر خرچ کرتے ہیں مردوں کی عورت پر فضیلت کی یہ اہم وجہ ہوجاتی ہے، اگر فضیلت کی یہی وجہ ہے تو عورتوں کو بھی یہ فضیلت حاصل ہوسکتی ہے، اگر فضیلت کی یہی وجہ ہے تو عورتوں کو بھی یہ فضیلت حاصل ہوسکتی ہے اگر وہ کمانے لگ جائیں اور مردوں پر اپنا مال خرچ کرنے لگیں، اللہ کسی خاص حکمت سے ایک کو دوسرے پر فضیلت عطا کرتا ہے۔

اگر معاشرہ عورت کے لئے بھی کمانے کی سہولتیں مہیا کردے (جیسا کہ ہمارے معاشرہ میں ہورہا ہے) تو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے عورتوں کو فضیلت عطا کرسکتا ہے اور اگر مرد عورت مشترکہ طور پر خاندان کے اخراجات پورے کرتے ہیں تو ان کو مساوی درجہ عطا کرسکتا ہے، چونکہ اس دور کے عرب سماج میں یہ ممکن نہیں تھا، اللہ تعالیٰ کی حکمت اس پر محمول تھی کہ مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہو لیکن یہ **مدللہ** آیت ہے اور فضیلت عطا کرنے کی وجہ بھی بیان کردی گئی ہے اگر یہ وجہ باقی نہ رہے تو فضیلت بھی باقی نہ رہے گی اس لئے اسے قطعی اور آخری نہیں سمجھنا چاہئے۔ (بلٹز ۱۴ ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۵ کالم ۴، ۵)

پہلی تقسیم کی طرح قرآنی آیات کی یہ دوسری تقسیم بھی بالکل طبع زاد ہے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون لکھتے وقت انجینئر صاحب نے طے کیا تھا کہ اس مضمون کے سارے افادات اور اصطلاحات طبع زاد ہونگی، ایک بات بھی ایسی درج نہیں کی جائے گی جس کا اسلامیات کے پورے ذخیرہ میں کوئی سراغ لگ سکے، مدلل اور **مدللہ** عربی زبان میں اس معنی میں کہیں استعمال ہی نہیں ہوئے ہیں جس کا مضمون نگار نے ذکر کیا ہے اور جس مفہوم میں ہم اسے اردو میں استعمال کرتے ہیں، عربی کی مستند ڈکشنریاں لسان العرب، القاموس، صحاح وغیرہ دیکھ ڈالئے کہیں آپ کو مدلل انجینئر صاحب کے ذکر کردہ معنی میں نہیں ملے گا، پھر خدا جانے انجینئر صاحب کی اس نئی اصطلاح اور نئی تفسیر کا ماخذ کیا ہے؟ انجینئر صاحب ہی اس کی نشاندہی کرسکتے ہیں بالفرض ہم انجینئر صاحب کی اس نئی تقسیم کو قبول کرلیں تو بھی اس کا مدعا ثابت نہیں ہوتا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۳۴ کے سلسلہ میں انجینئر صاحب نے خود اپنا تصنیف کیا ہوا اصول بڑی بددیانتی سے استعمال کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مرد کے سربراہ (قوام) مقرر کرنے کے دو اسباب بتائے ہیں (۱) اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت عطا فرمائی ہے اللہ تعالیٰ مرد اور عورت کی فطری صلاحیتوں اور جنسی خصوصیات سے بخوبی واقف ہے اس لئے اس کا مرد کو عورت پر فضیلت دینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مردوں میں کچھ ایسی امتیازی

صلاحیتیں ضرور ہوتی ہیں جو اسے گھر کی سربراہی کا مستحق اور اہل ثابت کرتی ہیں (۲) مرد کے سربراہ مقرر کئے جانے کا دوسرا سبب قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ مرد اخراجات کا بار سنبھالتے ہیں، ان پر گھر کے اخراجات کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اس لئے بھی سربراہی کے لئے وہی موزوں ہیں، انجینئر صاحب کے پاس چونکہ پہلی دلیل کی کاٹ نہیں تھی اس لئے اسے ہضم کر گئے اور مرد کی سربراہی کا سارا دارومدار دوسری دلیل پر رکھ دیا، حالانکہ قرآن نے مرد کی سربراہی کے دو مستقل اسباب بتائے ہیں ایک کو دوسرے کا تابع نہیں بنایا ہے لہذا اگر عورت خود کفیل ہوجائے، مرد سے نان ونفقہ نہ لے تو بھی گھر کا سربراہ مرد ہی رہے گا پھر دوسرے سبب کے بارے میں یہ سمجھنا کہ قرآن نے اس میں محض عرب سماج کے حالات کی عکاسی کی ہے بالکل غلط بات ہے ار ﴿وبما أنفقوا من أموالهم﴾ سے قرآن نے اسلام کے عائلی نظام اور اسلامی سماج کے ایک بنیادی عنصر کو بیان کرنا چاہا ہے کہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی گھرانا خواہ کسی دور اور کسی ملک میں ہو اس میں عورت پر کمانے کی ذمہ نہیں ڈالی جائے گی بلکہ بیوی بچوں کی کفالت شوہر کو کرنی پڑے گی۔

انجینئر صاحب کی مشقِ اجتہاد

انجینئر صاحب کی اصطلاح میں **مدللہ** آیتیں ہی ان کے اجتہاد کا تختۂ مشق نہیں ہیں بلکہ موصوف غیر **مدللہ** آیات کی دلیل تراش کر کے پھر اس پر تیشہ چلاتے ہیں، غرضیکہ وہ غیر **مدللہ** آیتوں کو بھی **مدللہ** بنا کر وہی مشق ستم کرتے ہیں جس کا نمونہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، سورہ نور آیت ۳۱ میں مسلمان عورتوں کو حکم ہے ﴿ولا يبدين زينتهن إلا لبعولتهن أو أباء هن الآية﴾ (اور نہ کھولیں اپنا سنگار مگر اپنے خاوند کے آگے یا اپنے باپ کے یا اپنے خاوند کے باپ کے، یا اپنے بیٹے کے یا اپنے خاوند کے بیٹے کے یا اپنے بھائی کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنی عورتوں کے آگے الخ) اس آیت میں مذکور افراد کے علاوہ کسی کے سامنے مسلمان عورت کو زینت اور اعضاء زینت کے اظہار سے منع کیا گیا ہے

اور اس حکم کا کوئی سبب یا دلیل قرآن نے ذکر نہیں کیا۔ انجینئر صاحب کی اصطلاح میں یہ غیر **مدللہ** آیت ہے لیکن انجینئر صاحب اپنی طرف سے دلیل فراہم کر کے آیت میں ذکر کئے ہوئے واضح اور قطعی حکم پر ہاتھ صاف کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''قرآن مجید حسن کاری اور تزئین کے اظہار سے مطلقاً منع نہیں کرتا۔ اس کے بیجا اظہار سے جس کی بنیاد ہوسنا کی ہے منع کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے تزئین کے اظہار کی شوہر، ماں، باپ، بھائی، ملازمین، عورتوں، بچوں اور دیگر افراد جو محرم کے زمرہ میں آتے ہیں اجازت دی ہے اور اگر اسی اسپرٹ کو مدنظر رکھا جائے تو باوقار طریقہ سے اس کا اظہار دیگر افراد کے سامنے بھی کیا جاسکتا ہے۔'' [بلٹز ۵/اکتوبر ۱۹۸۵ء صفحہ ۵ کالم ۴]

اوپر کے صفحات میں انجینئر صاحب کی ''تحقیق واجتہاد'' کے جو نمونے پیش کئے گئے ان سے موصوف کے مضمون کی قدر و قیمت اچھی طرح واضح ہوچکی ہوگی لیکن ان کے مضمون کی بڑی ناقدری ہوگی اگر ان کے شانِ اجتہاد کے مزید نمونے نہ پیش کریں، انجینئر صاحب کو آیاتِ قرآنی کی تشریح میں وہ وہ نکتے سوجھے ہیں جہاں تک کسی بھی مفسر، محدث، مجتہد کے ذہن کی رسائی نہیں ہوئی۔

فقہ اسلامی کے خلاف تبرا بازی

انجینئر صاحب نے پورے مضمون میں فقہ اسلامی کے بارے میں جو تأثر دینا چاہا ہے وہ انتہائی بھیانک ہے ان کے مطابق فقہ اسلامی کا پورا ذخیرہ قابل استفادہ تو کیا ہوتا دریا برد کئے جانے کے لائق ہے موصوف نے بے مہار آزادی اور اجتہاد کی بار بار دعوت دی ہے، لکھتے ہیں:

''ہم اگر چاہیں کہ اپنے اسلاف کی تقلید کرتے رہیں اور عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرلیں تو یہ ناممکن ہے، اسلاف کے نظریات جنسی نابرابری پر مبنی ہیں، اس لئے تقلید جنسی مساوات کے نظریہ کے ساتھ ناانصافی ہوگی اس لئے آزادی اجتہاد کی ضرورت ہے۔''
[بلٹز ۱۲/اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۵ کالم ۵]

"خاص طور پر ہمارے فقہاء نے عورتوں سے متعلق جو اپنے تعصّبات کو شرعی قوانین میں جگہ دی ہے اور ہم انہیں آج تک بے چون چرا تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں اب وقت آچکا ہے کہ ہم ان فقہاء کے موقف کا تنقیدی جائزہ لیں اور قرآنی اقدار واحکام کو ان کے سماجی تعصّبات سے الگ کریں، یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل ہے، قرآن مجید نے سماجی تعصّبات اور توہمات سے نجات حاصل کرنے کی جو ہدایت ہمیں کی ہے اس ہدایت پر ہم عمل کریں اور ان بیڑیوں کو اتار پھینکیں، ظاہر ہے اس کے لئے بڑے بیدار ذہن کی ضرورت ہے۔" [بلٹز ۲۸ رستمبر ۱۹۸۵ء ص ۵ کالم ۱]

اس مضمون میں اصغر علی انجینئر کے پورے مضمون کا جائزہ لینے کا ارادہ نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے، بلکہ چند اصولی تنقیدیں کرنی تھیں خاص طور پر انجینئر صاحب نے قرآنی آیات کی دو تقسیمیں (ماورائی اور ہنگامی، مدلله اور غیر مدلله) کر کے قرآن کے ساتھ جو کھلواڑ کیا ہے اس کا نوٹس لینا تھا، ہمارے خیال میں یہ دو تقسیمیں اتنی زبردست گمراہی ہیں کہ ان پر اصرار کرنے کی صورت میں انجینئر صاحب کو مسلمان تسلیم کرنے کا کوئی جواز نہیں رہتا، دانشور صاحب نے نفقہ مطلقہ کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کی تائید کی اور اس کی آڑ میں قرآن وسنت اور فقہ اسلامی پر رکیک حملے کرنے کے لئے یہ مضمون لکھا ہے، مضمون کا اصل محرک حالیہ فیصلہ کی تائید ہی ہے، سپریم کورٹ کے فیصلہ کی تائید میں انہوں نے جو اوراق سیاہ کئے ہیں ان میں لفاظی کے سوا کچھ نہیں اس سلسلے میں سپریم کورٹ نے اور عارف محمد خاں نے دلیل نما قسم کی جو چیزیں کہی ہیں انہیں کو انجینئر صاحب نے بھی بار بار دہرایا ہے اس لئے اس حصہ کا جائزہ لینے کی ضرورت نہیں ہے، سپریم کورٹ کے فیصلے اور عارف محمد خاں کے بیان کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

دانشوری کا ایک نمونہ

نفقہ مطلقہ سے متعلق دانشور صاحب کی عقل ودانش کا صرف ایک نمونہ پیش کر کے

ہم جائزہ ختم کرتے ہیں، اس بدیہی بات کا انکار کرنے کے بعد کہ قرآن وسنت نے مطلقہ کا نفقہ شوہر کے ذمہ صرف زمانہ عدت تک لازم کیا ہے انجینئر صاحب لکھتے ہیں: "اگر قرآن مجید میں مدت مقرر کر بھی دی گئی ہوتی تو اس سے کم دینا تو گناہ ہوتا اور اللہ کے حدود کی خلاف ورزی ہوتی لیکن اس سے زیادہ دینا کیسے حدود اللہ کی خلاف ورزی میں شمار ہوسکتا ہے یہ منطق تو علماء کرام کی اپنی ہی ہوسکتی ہے۔" [بلٹز ۵ ر اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۵ کالم ۱]

انجینئر صاحب یا تو علماء کی بات سمجھ نہیں سکے یا جان بوجھ کر سادہ لوح قارئین کو مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، علماء نے یہ کب کہا کہ اگر عدت گذرنے کے بعد سابق شوہر نے اپنی خوشی سے مطلقہ عورت کو نان ونفقہ یا ہدیہ دیا تو گناہ گار ہوگا اور حدود اللہ کی خلاف ورزی ہوگی، اپنی خوشی سے طلاق دینے والا مرد مطلقہ عورت ہی کو نہیں بلکہ کسی بھی مرد یا عورت کو جو کچھ بھی دے اور جب تک چاہے دیتا رہے ادنی گناہ بھی نہیں ہوگا بلکہ اسے ثواب ملے گا، علماء کا کہنا صرف یہ ہے کہ طلاق دینے والے مرد کی ذمہ داری محض زمانہ عدت کا نان ونفقہ دینے کی ہے۔ عدت گذرنے کے بعد اس کی شرعی ذمہ داری ختم ہوگئی لہذا عدت کے بعد نکاح ثانی تک اس مرد پر قانونی طور پر نان ونفقہ لازم کر دینا دینی احکام میں صریح مداخلت ہے اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے۔

اگر انجینئر صاحب سرمایہ دار ہوں اور اپنی خوشی سے پورے ہندوستان کی بیواؤں اور نادار مطلقہ عورتوں کا پورا خرچ برداشت کریں تو یہ کام ناجائز نہیں بلکہ شریعت کی نظر میں قابل ستائش ہوگا، لیکن انجینئر صاحب کی مرضی کے خلاف عدالت ان کے ذمہ ایک بیوہ کے اخراجات لازم کر دے تو عدالت کا یہ فیصلہ شریعت اور قانون کی نگاہ میں صریح ظلم قرار پائے گا، جس طرح دینی احکام میں اپنی جانب سے کمی کرنا دین میں تحریف اور بیجا مداخلت ہے اسی طرح اپنی طرف سے دینی مسائل واحکام میں اضافہ کرنا دین میں کھلی ہوئی تحریف ہے، قرآن وسنت سے مسلمانوں پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اپنی خوشی سے کوئی مسلمان پنجوقتہ نمازوں کے علاوہ روزانہ سیکڑوں رکعت نفل پڑھ لیا کرے تو مستحق ثواب ہی ہوگا اور اس

کے ذخیرۂ آخرت میں اضافہ ہوگا لیکن اگر ہماری حکومت پنجوقتہ نمازوں کے علاوہ دو رکعت نماز بھی مسلمان پر لازم کرنا چاہے تو اس کا یہ اقدام دین میں مداخلت قرار پائے گا اور مسلمان اسے کسی طرح تسلیم نہیں کریں گے۔

☆☆☆☆

طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے فیصلے: ایک جائزہ

۱۹۳۷ء میں شریعہ اپلیکیشن ایکٹ منظور ہوا، اس ایکٹ میں دس امور کا ذکر ہے، ان دس امور سے متعلق مسلمانوں کے مقدمات میں ہندوستانی عدالتوں کا فیصلہ اسلامی قانون کے مطابق ہوا کرتا تھا، اور ہندوستانی عدالتیں اس کی بھی پابند تھیں کہ مسلمانوں کے یہاں اس معاملہ کی بابت جو قانون ہے اسی کے مطابق فیصلہ کیا کریں، ہندوستان میں چونکہ حنفی فقہ ماننے والوں کی غالب اکثریت ہے اس لئے ان معاملات میں فقہ حنفی کے مطابق فیصلے ہوا کرتے تھے، ہاں اثنا عشری شیعہ حضرات کے مقدمات میں فقہ اثنا عشری کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا، اس مقصد کے لئے ہدایہ اور فتاوی عالمگیری کے وہ حصے جن کا تعلق مسلم پرسنل سے تھا ان کا انگریزی ترجمہ بھی کیا گیا تا کہ ججوں کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو، ججز اس کے پابند تھے کہ از خود کتاب وسنت میں غور وفکر کر کے اسلامی قانون کی تشریح نہ کریں بلکہ مسلمانوں کے یہاں معتبر فقہاء نے جو قانون بتایا ہے اور جو تصریحات کی ہیں ان ہی کی پابندی کرتے ہوئے اپنے فیصلے تحریر کریں، پریوی کونسل اور سپریم کورٹ کے بعض فیصلوں میں اس کی ہدایت بھی ہے کہ کسی مذہبی قانون کی تشریح ججز از خود نہ کریں بلکہ اس قانون کے معتبر شارحین نے جو تشریح کی ہے اس کو قبول کریں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں۔

ملک کی آزادی کے کافی دنوں بعد ہندوستان کی عدالتوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ

وہ معتبر مسلم فقہاء کی تشریحات سے ہٹ کر اپنے طور پر اسلامی قانون کی تشریح کریں اور قرآن سے اسلامی قانون اخذ کریں۔

اس رجحان کا نمایاں مظاہرہ گوہاٹی ہائی کورٹ کے جج جسٹس بحر الاسلام نے اپنے فیصلہ میں کیا جس میں انہوں نے طلاق واقع ہونے کے لئے کچھ خود ساختہ شرطیں عائد کیں، اور اس کے لئے انہوں نے سورۂ نساء: آیت نمبر ۳۴، ۳۵ سے استدلال کرتے ہوئے وقوع طلاق کے لئے ایسی متعدد شرطوں کا ذکر کیا جو ان کے ذہن کی پیدا کردہ تھیں، اور پوری اسلامی تاریخ میں کسی مفسر، فقیہ، محدث اور عالم دین نے ان کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان کے خلاف تصریحات سب کے یہاں موجود ہیں، اسی طرح کا ایک دوسرا فیصلہ ۲۰۰۲ء میں بمبئی ہائی کورٹ کی اورنگ آباد بنچ کی طرف سے آیا اس میں بھی وہی باتیں دُہرائی گئیں جو گوہاٹی ہائی کورٹ کے فیصلے میں تھیں، اس کے بعد ہندوستان کی عدالت عالیہ سپریم کورٹ نے ۲۰۰۲ء میں شمیم آرا کیس کے فیصلہ میں انہی باتوں کا اعادہ کیا اور جسٹس بحر الاسلام کے فیصلے کی ستائش کرتے ہوئے اسے اپنے فیصلہ کا حصہ بنایا، اس طرح سپریم کورٹ کے ذریعہ سے پورے ملک میں اس کا نفاذ ہو گیا۔

اسی سلسلہ کا ایک قدم ۱۹۸۵ء میں نفقۂ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ تھا کہ مطلقہ عورت عدت گذرنے کے بعد بھی طلاق دینے والے شوہر سے نفقہ پانے کی مستحق رہے گی جب تک کہ اس کا انتقال نہ ہو جائے یا اس کا کہیں اور نکاح نہ ہو جائے۔

اس فیصلہ کے مضر اثرات کو دور کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ملک گیر سطح پر اس کے خلاف تحریک چلائی اور بالآخر حکومت اس کے لئے تیار ہوئی کہ فیصلہ کے برے اثرات کو دور کرنے کے لئے پارلیامنٹ میں قانون پاس کرایا جائے، چنانچہ ۱۹۸۶ء میں ''تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل'' پارلیمنٹ سے پاس ہو گیا، اس بل میں کچھ خامیاں رہ گئی تھی جس کا ازالہ نہیں کیا جا سکا اور دوسری طرف اس بل کے خلاف سپریم کورٹ میں کئی مقدمات دائر کئے گئے اور ان مقدمات کا فیصلہ دانیال لطیفی کیس میں ۱۹۸۶ء میں جاری ہوا

جس میں تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل کو نہ صرف بے اثر کر دیا بلکہ اسلام کے عائلی قوانین میں مداخلت کی مزید راہیں کھول دی گئیں، سپریم کورٹ آف انڈیا نے ایک غیر مسلم خاتون کے مقدمہ کی سماعت کرتے ہوئے مسلم خواتین کے حوالہ سے تین طلاق کے مسئلہ کو چھیڑتے ہوئے سپریم کورٹ ہی کی طرف سے ایک کیس دائر کیا اور تین طلاق کا مسئلہ عدالت کے علاوہ قومی میڈیا میں گرم کر دیا گیا، چند ایسی مسلم خواتین عدالت میں کھڑی کر دی گئیں جو اپنے کو تین طلاق کا شکار بتا رہی تھیں، تین طلاق کا مقدمہ سپریم کورٹ میں چلا، اس کی بھرپور پیروی کی گئی لیکن ۲۰۱۷ء میں چیف جسٹس کی سربراہی میں پانچ رکنی ٹیم نے جو فیصلہ دیا وہ اپنی جگہ حیرت انگیز فیصلہ تھا، یہ فیصلہ تین فیصلوں کا مجموعہ تھا لیکن چونکہ تین ججز اس بات پر متفق تھے کہ تین طلاق کو سرے سے واقع نہ مانا جائے، ایک طلاق بھی شمار نہ کی جائے، اس لئے یہی فیصلہ ٹھہرا، ظاہر ہے کہ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ اسلامی قانون میں صریح مداخلت ہے، لیکن بھاجپا گورنمنٹ اس پر مطمئن نہیں ہوئی اور اس نے ضروری سمجھا کہ ایک قانون بنا کر اسلام کے قانون طلاق کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے، اس لئے ۲۰۱۷ء میں اس طرح کا بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا اور پھر پاس ہو گیا، ایوان بالا نے بھی اسے منظور کر لیا اور صدر جمہوریہ کے دستخط سے امتناع طلاق کا یہ قانون ملک میں نافذ ہو گیا، حالانکہ مسلمانان ہند خصوصاً مسلم خواتین نہ اس فیصلہ پر راضی تھیں اور نہ ہی اس بل سے متفق ہیں بلکہ طلاق کے موجودہ بل میں عورتوں کے لئے بہت سے مسائل پیدا کر دئے ہیں، ہندوستان کی تاریخ کا یہ عجیب وغریب بل ہے جس کو پارلیمنٹ نے اس طبقہ کی بھرپور مخالفت کے باوجود پاس ونافذ کیا تھا جس کی ہمدردی اور خیر خواہی کے نام پر یہ بل منظور کیا تھا۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کا جائزہ

تین طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ (جس میں تین طلاق کو کالعدم قرار دیا گیا ہے) کے تفصیلی جائزہ کی ضرورت ہے، ابھی شرعی نقطۂ نظر سے اور قانونی اعتبار

سے اس فیصلہ کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا جا سکا، بہت سے حضرات نے تو فیصلہ کو پڑھے بغیر سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا، مسلم سماج پر خصوصاً عورتوں پر (جن کی ہمدردی کے نام پر یہ پورا ہنگامہ برپا کیا گیا) اس فیصلہ کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ ان کی مشکلات حل ہونگی؟ یا ان کے لئے نئی نئی مشکلات وپیچیدگیاں جنم لیں گی اس کا تفصیل سے اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنا ضروری ہے، اس فیصلہ کے جائزہ میں اسلامی قانون کے ماہرین، قوانین ہند کے ماہرین نیز ماہرین سماجیات کی بھرپور شرکت ضروری ہے۔

ہندوستان کی سپریم کورٹ کی تاریخ میں یہ فیصلہ اپنی عجیب وغریب خصوصیات کے اعتبار سے یاد رکھا جائے گا، پانچ رکنی بینچ کا یہ فیصلہ دراصل تین فیصلوں پر مشتمل ہے، ایک فیصلہ چیف جسٹس انڈیا جگدیش سنگھ کیہر اور جسٹس ایس عبدالنظیر کا ہے، دوسرا فیصلہ جسٹس روہنٹن فالی نریمن اور جسٹس ادے امیش للت کا ہے، اور تیسرا فیصلہ جسٹس کورین جوزف کا ہے۔

فیصلہ تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے، فیصلہ میں تمام فریقوں کے دلائل کا احاطہ کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، چیف جسٹس جگدیش سنگھ کیہر اور جسٹس عبد النظیر کے علاوہ باقی تین ججوں نے ایک ساتھ دی گئی تین طلاق کو کالعدم قرار دیا ہے، یعنی اس صورت میں ایک طلاق بھی نہیں پڑے گی، یہی اکثریتی فیصلہ کا لب لباب ہے، چیف جسٹس کیہر اور جسٹس عبد النظیر نے ایک طرف تو ایک ساتھ دی گئی طلاق کو اسلامی قانون کا حصہ تسلیم کیا، اور پوری صفائی سے اس بات کا اقرار کیا کہ تین طلاق کا زیر بحث مسئلہ دستور کی دفعہ ۲۵ کے تحت آتا ہے، اور اس کے بارے میں عدالت کو کسی مداخلت کا اختیار نہیں، لیکن پھر مداخلت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چھ مہینے کے لئے مسلمان مردوں پر پابندی عائد کی جاتی ہے کہ وہ ایک ساتھ تین طلاق نہ دیں، اس دوران حکومت تین طلاق کے مسئلہ میں قانون سازی کرے، درحقیقت فیصلہ وہی ہے جو تین ججوں نے کیا ہے کہ ایک ساتھ دی گئی تین طلاق قانوناً کالعدم ہے، اس سے ایک طلاق بھی نہیں پڑے گی، اس فیصلہ کے بعد چیف جسٹس کیہر اور جسٹس عبد النظیر کا یہ مشورہ یا ہدایت کالعدم قرار پاتی ہے کہ حکومت اس مسئلہ پر قانون سازی کرے۔

جن تین ججوں نے ایک ساتھ دی گئی طلاق کو کالعدم قرار دیا ہے، انہوں نے سپریم کورٹ کے شمیم آرا کیس کے فیصلے کا حوالہ دیا ہے، اور اس فیصلہ کی مکمل طور پر تائید وحمایت کی ہے، جسٹس روہنٹن فالی نارئین اور جسٹس ادے امیش للت نے اپنے مشترکہ فیصلے کے پیراگراف نمبر ۵۶ اور ۵۷ میں لکھا ہے:

''۵۶- زیر سماعت معاملہ میں صریحاً یکطرفہ کارروائی کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بالکل واضح ہے کہ طلاق ثلاثہ طلاق کی ایک ایسی شکل ہے جو کہ بدعت ہے، بالفاظ دیگر یہ سنت سے ثابت نہیں ہے، بلکہ یہ بے قاعدہ اور دین سے انحراف پر مبنی طلاق ہے، فیضی کی کتاب میں یہ مذکور ہے کہ طلاق کی یہ شکل جو کہ حنفی مسلک میں معروف ہے جائز ہونے کے باوصف گناہ ہے، اور غضب الٰہی کی مورد ہے، درحقیقت شمیم آرا مقدمے میں بنام ریاست یوپی (۲۰۰۷)، 7 SSC 518 میں اس عدالت نے متعدد سندوں بشمول حالیہ ہائی کورٹ فیصلوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ رائے دی:

۱۳۔ قرآن میں مذکورہ صحیح طلاق قانون یہ ہے کہ طلاق کی کوئی معقول وجہ ہونا چاہئے، اور طلاق سے قبل شوہر اور بیوی میں دو ثالثوں کے ذریعہ مصالحت کی کوشش ہونی چاہئے، ایک ثالث شوہر کے خاندان سے اور دوسرا بیوی کے خاندان سے ہونا چاہئے، اگر مصالحت کی کوشش ناکام ہوجاتی ہے، پھر طلاق پر عمل پیرا ہونا چاہئے، (جزء ۱۳ رقیہ خاتون مقدمہ (۱۹۸۱) 1 GAU LR 375 ڈویزن بینچ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ قرآن کی رو سے طلاق کا صحیح طریقہ یہ ہے:

(۱) طلاق کی معقول وجہ ہونا چاہئے، (۲) اس سے قبل مصالحت کی کوشش لازم ہے، شوہر اور بیوی کے درمیان دو ثالثوں کی مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے، ان میں سے ایک شوہر کی خاندان سے دوسرا بیوی کے خاندان سے ہونا چاہئے، ان کی کوشش کی ناکامی کی صورت میں طلاق دینا چاہئے، ڈویزن بینچ نے واضح طور پر بمبئی اور کلکتہ کی رائے سے اختلاف کیا کہ انہوں نے صحیح قانون پیش نہیں کیا۔

۱۴۔ ہائی کورٹ کے فاضل ججوں کی مذکورہ بالا رائے سے ہم ادب واحترام کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں (ص: 526)۔

۵۷۔ چونکہ طلاق ثلاثہ فوری اور ناقابل فسخ ہوتی ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس صورت میں شوہر اور بیوی کے مابین ان کے خاندانوں کے دو ثالثوں کی مصالحت کی کوشش جس سے نکاح کا رشتہ برقرار رہے، اس کا کوئی امکان نہیں رہتا، رشید احمد مقدمے میں پریوی کونسل نے یہ رائے دی تھی کہ معقول وجہ کے بغیر بھی طلاق جائز ہے، البتہ شمیم آرا مقدمے کے بعد یہ رائے بے وقعت ہے، موجودہ صورتحال یہ ہے کہ طلاق ثلاثہ صریحاً یکطرفہ ہے، کیونکہ مسلمان مرد مصالحت کی کسی کوشش کے بغیر محض اپنی مرضی سے جب چاہے رشتۂ ازدواج توڑ دے، لہذا طلاق کی اس شکل کو دستور ہند کی دفعہ ۱۴ میں مذکور بنیادی حقوق کے منافی سمجھنا چاہئے، اسی لئے ہماری رائے میں ۱۹۳۷ ایکٹ اس معنی میں فسخ ہونا چاہئے، جس کے مطابق طلاق ثلاثہ کو تسلیم اور قابل عمل سمجھا گیا ہے، چونکہ صریحا یکطرفہ ہونے کے باعث ہم نے ۱۹۳۷ ایکٹ کے سیکشن ۲ کو کالعدم قرار دیا ہے، مذکورہ معاملات میں نااتفاقی کی ان تفصیلات کی چنداں ضرورت نہیں، جس کے لئے فاضل اٹارنی جنرل نے دلیل دی، اور جس کی حمایت دیگر افراد نے کی۔

جسٹس کورین جوزف جو تین طلاق کے بارے میں فیصلہ دینے والی سپریم کورٹ کی بینچ کے رکن تھے، وہ مذہبا عیسائی ہیں انہوں نے اپنے فیصلہ کے پیراگراف ۲۴، ۲۵، ۲۶ میں درج ذیل باتیں لکھی ہیں، جنہیں ہم ان کے فیصلے کا خلاصہ اور لبِ لباب کہہ سکتے ہیں:

۱۔ دستور ہند کی رُو سے اپنی مرضی کے مطابق کسی مذہب پر عمل اور اس کی ترویج ایک بنیادی حق ہے، جس کی دستور ہند نے ضمانت دی ہے، یہ حق البتہ ان امور کے تابع ہے۔ (۱) امن عامہ (۲) صحت عامہ (۳) اخلاقیات (۴) بنیادی حقوق سے متعلق جزء سوم کی دیگر شقیں۔

(۱) دفعہ ۲۵ کے تحت جس آزادی کی ضمانت دی گئی ہے اس سے قطع نظر (۲) دفعہ ۲۵ کے تحت ریاست کو یہ اختیار ہے کہ وہ دوصورتوں میں قانون سازی کرے، (۳) دفعہ ۲۵ میں درج ہے کہ اس دفعہ کی رُو سے کسی موجودہ قانون کے جاری رہنے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور ریاست کو قانون سازی سے باز نہیں رکھا جائے گا، اگر (۱) ایسے قانون کی ضرورت پڑے جو کسی مذہبی فعل سے متعلق کسی معاشی، سیاسی، سیکولر سرگرمی پر نظر رکھے یا اسے محدود کرے اور (۲) عوامی سطح کے ہندو مذہبی اداروں کے دروازے معاشرتی اصلاح و بہبود کے لئے ہندوؤں کے تمام طبقوں کے لئے کھول دیئے جائیں۔

مذکورہ بالا حدود کے اندر دستور ہند کے تحت مذہبی آزادی مطلق ہے اور اس باب میں فاضل چیف جسٹس سے متفق ہوں۔

البتہ میں احترام کے ساتھ اس بیان سے اختلاف کرتا ہوں کہ طلاق ثلاثہ مذہبی فعل کا لازمی جز ہے، محض اس بنیاد پر کہ کوئی فعل عرصہ سے جاری ہے اسے جواز عطا نہیں کرتا بالخصوص جب کہ وہ فعل جائز نہ ہو۔

۱۹۳۷ء ایکٹ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ شریعت کو فیصلہ کی بنیاد بنایا جائے اور جز دو ۲ میں مذکور موضوعات جن میں طلاق شامل ہے ان کے حوالے سے غیر شرعی افعال کو ختم کیا جائے۔

غرضیکہ ۱۹۳۷ء ایکٹ کے نفاذ کے بعد کسی ایسے فعل کی مطلق اجازت نہیں جو احکام قرآنی کے خلاف ہو، لہذا اس فعل کے لئے دستوری تحفظ نہیں اور میں فاضل چیف جسٹس سے اس بات میں اختلاف کرتا ہوں کہ طلاق ثلاثہ کو دستوری تحفظ حاصل ہے، مجھے اس بارے میں بھی شدید شک وشبہ ہے کہ دفعہ ۱۴۲ کی رُو سے کسی بنیادی حق پر عمل درآمد کے بارے میں حکم امتناعی دیا جاسکتا ہے۔

۲۵۔ جب ایسی صورت حال رُونما ہوتی ہے تو مباحثے میں مذہب اور دیگر دستوری حقوق کے مابین تصادم کا رنگ غالب آجاتا ہے۔

میری دانست میں دونوں کے مابین ہم آہنگی ممکن ہے، لیکن ان مختلف مفادات کے درمیان مصالحت کرانا مقنّنہ کے دائرہ اختیار میں ہے۔

لیکن اس اختیار کو دستوری حدود میں ہی استعمال کرنا چاہئے اور اس کے نتیجے میں دستور ہند کی دی ہوئی آزادی کی ضمانت کو کوئی گزند نہیں پہونچنا چاہئے، البتہ یہ عدالت کا فرض منصبی ہے کہ وہ کسی قانون سازی کی ہدایت دے۔

۲۶۔ خوش قسمتی سے اس عدالت نے اپنا فرض شمیم آرا مقدمہ میں انجام دے دیا ہے، میں غیر مبہم الفاظ میں اس قانون کی تائید وتوثیق کرتا ہوں جو کہ شمیم آرا مقدمہ میں موجود ہے۔ جو فعل قرآن کی نظر میں غلط ہے وہ شریعت کی نگاہ میں صحیح نہیں ہوسکتا ہے، اور جو فعل دینی لحاظ سے غلط ہے وہ قانون کی رُو سے بھی غلط ہی ہے۔

جسٹس کورین جوزف

نئی دہلی

۲۲/اگست ۲۰۱۷ء

طلاق سے متعلق مختلف غلط فیصلوں کا تجزیہ

شمیم آرا کیس کا فیصلہ کوئی تفصیلی فیصلہ نہیں ہے، اس فیصلہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ کے فاضل جج نے بعض ہائی کورٹوں کے فیصلوں پر اعتماد کرکے اور انہیں بنیاد بنا کر اپنا یہ فیصلہ صادر کیا، ذیل میں شمیم آرا کیس کے فیصلہ کے مندرجات اور یہ فیصلہ ہائی کورٹوں کے جن فیصلوں پر مبنی ہے ان کے مشتملات کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے تاکہ علم وتحقیق کی کسوٹی پر اس فیصلہ کو جانچا جاسکے۔

جسٹس بحر الاسلام (گوہاٹی ہائی کورٹ) اور ان کے ہم خیال ججوں نے وقوع طلاق کے لئے جو نئی شرطیں عائد کیں ان کا کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں دور دور تک پتہ نہیں ہے، طلاق واقع ہونے کے لئے یہ شرط عائد کرنا کہ طلاق کی کوئی معقول

وجہ موجود ہو اور طلاق سے پہلے افہام وتفہیم کی کوشش کر لی گئی ہو، دونوں خاندان سے ایک ایک حکم مقرر کر کے معاملہ کو حل کرنے کی کوشش بھی ناکام ہو چکی ہو، گواہوں کے سامنے طلاق دی گئی ہو اور بیوی اور ان کے گھر والوں کو طلاق دینے کی اطلاع دے دی گئی ہو۔

یہ سب شرطیں خود ساختہ اور ایجاد بندہ ہیں، کتاب وسنت اور اسلامی قانون سے ان کا دور کا کوئی تعلق نہیں ہے، ہمارے فاضل ججوں کو سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳۴-۳۵ سے مغالطہ میں ڈالا گیا ہے، اور جن آیات کے آگے پیچھے کہیں طلاق کا ذکر نہیں اُنہیں طلاق کا پروسیجر (طریقہ کار) بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہ دونوں آیات اور ان کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ، فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ، وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ، فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا، إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا (۳۴)، وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا، إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا﴾ (۳۵)

ترجمہ: مرد عورتوں پر نگراں ہیں، اس لئے کہ اللہ ہی نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے، اور اس لئے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پس نیک عورتیں وہ ہیں جو فرمانبردار ہیں اور اللہ کی حفاظت سے مرد کی عدم موجودگی میں (اپنی عزت وآبرو مال واولاد کی) حفاظت کرتی ہیں، اور تم کو جن عورتوں سے نافرمانی کا اندیشہ ہو، ان کو سمجھاؤ، خوابگاہ میں ان سے بے تعلقی برتو، اور ان کو (ہلکے طریقہ پر) مارو، اگر وہ تمہاری فرماں برداری کرنے لگیں تو پھر ان پر زیادتی کے لئے بہانے تلاش مت کرو، بے شک اللہ بڑی بلندی اور عظمت والے ہیں، اور اگر تم کو آپس میں نزاع کا اندیشہ ہو، تو مرد کے لوگوں میں سے ایک پنچ اور عورت کے لوگوں میں سے ایک پنچ مقرر کردو، اگر دونوں صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کردیں گے، بیشک اللہ خوب جاننے والے اور باخبر ہیں۔''

مندرجہ بالا آیات میاں بیوی کے تعلقات اور ازدواجی جھگڑوں کو ختم کرنے کے بارے میں بہت ہی بنیادی رہنمائی دیتی ہیں، بلاشبہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ازدواجی رشتہ قائم کرنے کا فیصلہ وقتی تأثر اور جلد بازی میں نہ کیا جائے، بلکہ پورے غور وخوض کے بعد فریقین کے ایک دوسرے کے بارے میں صحیح معلومات کر لینے اور مطمئن ہو جانے کے بعد ہی نکاح کا رشتہ قائم کیا جائے، اس سلسلہ میں اسلام نے بہت سی ہدایات دی ہیں، یہاں تک کہ مرد جس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اسے دیکھنے تک کی اجازت وہدایت دی ہے، حالانکہ عام حالات میں اجنبیہ عورت کو دیکھنا ممنوع ہے، لیکن جب رشتہ ازدواج قائم ہو گیا تو اس کے بعد ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے اور رشتہ ازدواج کو باقی وقائم رکھنے کی پوری کوشش ہونی چاہئے، اس سلسلہ میں اسلامی شریعت نے میاں بیوی دونوں کو بڑی حکیمانہ ہدایات دی ہیں، اگر ان پر عمل کیا جائے تو رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کی نوبت شاذ ونادر ہی آئے، ان ہدایات اور تعلیمات کو پیش کرنے کے لئے کافی وقت اور فرصت درکار ہے، اور احقر نے اپنی کتاب ''طلاق کب، کیوں اور کیسے'' میں ان ہدایات کو اختصار کے ساتھ لکھ دیا ہے، طلاق کے موضوع پر اس کتابچہ کا ترجمہ انگریزی اور گجراتی میں ہو چکا ہے۔

سورۂ نساء کی جن دو آیات سے ہمارے ججوں نے طلاق کے لئے خود ساختہ شرطیں عائد کرنے کی کوشش کی ہیں، انہیں غور سے پڑھے جانے اور آیات کے سیاق وسباق سے ملا کر دیکھنے کی ضرورت ہے، ان آیات کے سیاق وسباق میں کہیں طلاق کا ذکر نہیں ہے، بعض فیصلوں میں آیت نمبر ۳۴ کے اس ٹکڑے کو ''فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا'' کو طلاق سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ آیت کا یہ ٹکڑا بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر نافرمان بیوی آیت میں ذکر کردہ طریقوں کے استعمال سے راہ راست پر آجائے، اور نافرمانی کی روش ترک کردے، اب اس کے ساتھ شوہر کا رویہ منصفانہ اور شریفانہ ہونا چاہئے، ماضی کی غلطیوں کی وجہ سے نہ اسے طعن وتشنیع کرے، نہ ایذا رسانی کرے۔

قرآن کریم کا ایک معجزہ یہ ہے کہ اس کی بعض آیات سے اگر کہیں غلط مفہوم اخذ

کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور تلبیس یا تشکیک کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے تو خود قرآن کریم کی دوسری آیات ان کوششوں کو ناکام بنادیتی ہیں، اور حقائق سے پردہ اٹھادیتی ہیں، طلاق کے زیر بحث مسئلہ میں بھی قرآن کا یہ اعجاز واضح طور پر سامنے آتا ہے، قرآن کریم میں مختلف سورتوں اور آیتوں میں طلاق کے احکام ومسائل ذکر کئے گئے ہیں، طلاق اور اس سے متعلق دوسری چیزیں مثلاً عدت، نفقہ، مطلقہ اور نفقۂ اولاد وغیرہ کا ذکر بڑی وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

سورۂ بقرہ، سورۂ احزاب نیز سورۂ طلاق میں مختلف آیات طلاق سے متعلق ہیں، لیکن کہیں بھی ان شرائط کا صراحتاً یا اشارۃً تذکرہ نہیں ہے، جن پر ہمارے جج صاحبان کا اصرار ہے، اور جنہیں یہ حضرات سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳۴ اور ۳۵ کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں، بلکہ قرآن کریم میں ایسی متعدد آیات ہیں جو ان خود ساختہ شرائط کی نفی کرتی ہیں، اور اس بات پر وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں کہ طلاق واقع ہونے کے لئے وہ اقدامات ناگزیر نہیں ہیں جن کا سورۂ نساء کی آیات ۳۴ اور ۳۵ میں ذکر ہے۔

قرآن کریم میں طلاق کی جن صورتوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ نکاح ہونے کے بعد ابھی رخصتی بھی نہیں ہوئی ہو، اور ازدواجی تعلقات قائم نہ ہوئے ہوں اور شوہر بیوی کو طلاق دیدے، یہ طلاق قرآن کی صراحت کے مطابق واقع ہوجاتی ہے، ایسی عورت پر عدت لازم نہیں، اور وہ طلاق ہونے کے فوراً بعد دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے، پھر اس عورت کے بارے میں دو شکلوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک یہ کہ نکاح کرتے وقت مہر مقرر کیا گیا تھا، اس صورت میں مقررہ مہر کا نصف عورت کو ملے گا، اور دوسری شکل یہ ہے کہ نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ کیا گیا ہو، ایسی صورت میں اس عورت کو کچھ ہدیہ تحفہ دے کر رخصت کردیا جائے گا، مہر کے نام سے وہ کسی چیز کی حقدار نہ ہوگی، اس مسئلہ سے متعلق جو قرآنی آیات ہیں انہیں چند سطروں کے بعد درج کیا جاتا ہے، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب صرف نکاح ہوا ہے رخصتی نہیں ہوئی ہے، ایسی صورت میں ان چیزوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جس کا ذکر سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳۴ اور ۳۵ میں ہے، عورت کی طرف سے نافرمانی، سرکشی کا تصور اسی وقت ہوسکتا ہے

جب کہ رخصتی ہوگئی ہو اور ازدواجی زندگی شروع ہوچکی ہو، اسی طرح شوہر کے لئے عورت کو سمجھانا، فہمائش کرنا، خواب گاہ میں بے رخی اختیار کرنا، ہلکی زدوکوب کرنا اسی اس وقت ممکن ہے جب کہ دونوں ساتھ رہتے ہوں، اور عملاً ازدواجی زندگی کا آغاز ہوچکا ہو، میاں بیوی کی ایک دوسرے سے آخری درجہ کی ناچاقی اور منافرت جس کو دور کرنے کے لئے دونوں طرف سے ثالثوں کی تقرری ہو اسی وقت متصور ہے جب کہ دونوں کچھ مدت ایک ساتھ رہ چکے ہوں، اور باہمی تعلقات میں زیادہ تلخیاں پیدا ہوچکی ہوں، اب آپ ان آیات کا مطالعہ کیجئے جن میں نکاح کے بعد ازدواجی تعلق قائم ہونے سے پہلے طلاق دئے جانے اور ان کے واقع ہونے کا ذکر ہے:

﴿لاَ جُنَاحَ عَلَيكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَالَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرَضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ﴾ [سورۂ بقرہ، آیت:۲۳۶]

ترجمہ: تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان بیویوں کو جنہیں تم نے ہاتھ نہیں لگایا، اور نہ ان کے لئے مہر مقرر کیا طلاق دیدو، اور انہیں خرچ دیدو، وسعت والے کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق ہے، اور تنگی والے کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق، (یہ) خرچ شرافت کے موافق ہو، (اور یہ) واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر۔

﴿وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَن يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَاْ الَّذِى بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَ أَن تَعْفُوَاْ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرا﴾ [سورۂ بقرہ، آیت:۲۳۷]

ترجمہ: اور اگر تم نے انہیں طلاق دیدی ہے، قبل اس کے کہ انہیں ہاتھ لگایا ہو، لیکن ان کے لئے کچھ مہر مقرر کرچکے ہو، تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے اس کا آدھا واجب ہے، بجز اس صورت کے کہ (یا تو) وہ عورتیں خود معاف کردیں، یا وہ (اپنا حق) معاف کردے جس کے ہاتھ

میں نکاح کی گرہ ہے، اور اگر تم (اپنا حق) معاف کردو تو یہ بہت ہی قرین تقویٰ ہے، اور آپس میں لطف واحسان کو نظر انداز نہ کرو، تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ یقیناً اس کو خوب دیکھنے والا ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُومِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ فَمَالَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا﴾ [سورۂ احزاب، آیت: ۴۹]

ترجمہ: اے ایمان والو! تم جب مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر تم طلاق دیدو قبل اس کے کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو تو تمہارے لئے ان کے بارے میں کوئی عدت نہیں جسے تم شمار کرنے لگو، تو انہیں کچھ مال دے دو، اور انہیں خوبی کے ساتھ رخصت کردو۔

ہمارے ججز اور قانون داں اس بات سے تو واقف ہی ہیں کہ کسی مجموعۂ قانون میں کسی معاملہ میں اگر صریح دفعہ موجود ہے تو اسے چھوڑ کر کسی ایسی دفعہ سے جو اس معاملہ سے براہ راست متعلق نہیں ہے استنباط واستدلال کرنا اور صریح دفعہ کے خلاف کوئی بات نکالنا فنی لحاظ سے غلط اور غیر قانونی عمل ہے، قرآن میں طلاق کی جو شکلیں مذکور ہیں ان میں متعدد شکلیں ہیں جن میں ان شرطوں کے پائے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے جن شرطوں کو ہمارے فاضل ججز نے طلاق واقع کرنے کے لئے عائد کرنا چاہا ہے، اور جن کے لئے انہوں نے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳۴، ۳۵ کو بہانہ بنایا ہے۔

اسلام کوئی تخیلاتی مذہب نہیں ہے، اللہ جل شانہ کائنات کے خالق اور ذرہ ذرہ سے واقف ہیں، انسان کو اور اس کائنات کو انہوں نے پیدا کیا، اور افزائش وترقی کے منازل سے گذار، انسانوں کی نفسیات، ضروریات، خوبیوں اور کمزوریوں سے وہ بخوبی آگاہ ہیں، انسان کے لئے کون سا نظام زندگی اور کون سا قانون مناسب اور قابل عمل ہے ان سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا، اسلامی شریعت اللہ جل شانہ کی اتاری ہوئی شریعت ہے، وہ انسانوں کے لئے سب سے موزوں شریعت اور قانون ہے، اس میں انسانوں کے مختلف حالات اور طبقات کا احاطہ کیا گیا ہے، اور تمام حالات کے لئے احکام مقرر کئے گئے ہیں، نکاح کے بعد رخصتی

ہونے سے پہلے اور ازدواجی زندگی گذارنے سے پہلے طلاق عام حالات میں ایک عجیب سی بات لگتی ہے، اور جو لوگ واقعات کی دنیا سے الگ ہو کر محض نظریات کی دنیا میں رہتے ہیں ان کے لئے یہ ایک ناقابل فہم چیز ہے، لیکن واقعات کی دنیا میں ایسا متعدد بار پیش آتا ہے کہ نکاح ہوجانے کے بعد رخصتی ہونے سے پہلے اور ازدواجی زندگی گذارنے سے پہلے ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں جن میں یہ بات یقینی بن جاتی ہے کہ دونوں کا ازدواجی رشتہ چل نہیں سکتا، اور نباہ نہیں ہوسکتا، مثلاً شادی کی تقریب کے دوران لڑکی والوں کو یہ تجربہ اور اندازہ ہوگیا کہ لڑکا اور اس کے گھر والے بہت لالچی اور گھٹیا مزاج والے ہیں، لڑکی اگر رخصت ہوکر چلی گئی تو مستقل گھٹن اور پریشانی میں رہے گی، اسے سسرال میں سکون واطمینان نہیں مل سکتا، اسی طرح لڑکا اور اس کے گھر والوں کی شادی ہوجانے کے بعد لڑکی کے بارے میں رخصتی سے پہلے ایسی سنگین معلومات حاصل ہوتی ہیں جو اگر پہلے معلوم ہوتیں تو لڑکا اور اس کے گھر والے رشتۂ نکاح سے معذرت کردیتے، اس طرح کے حالات میں اگر طلاق کی گنجائش نہ رکھی جاتی، بلکہ موجودہ ہندوستانی قانون کے مطابق ایک مدت گذرنے کے بعد ہی طلاق کا راستہ کھلتا تو شوہر اور بیوی دونوں کے لئے بدترین سزا ہوتی، اور دونوں جوانی کے بہترین چند سال گھٹ گھٹ کر گذارتے، اس لئے اسلامی شریعت میں اس کی بھی گنجائش رکھی گی ہے کہ نکاح کے بعد رخصتی سے قبل طلاق دی جاسکے، اور قانوناً اس کی گنجائش ہو۔

اسلام کے قانون طلاق کو ابھی چند سال پہلے مسلمان علماء اور ماہرین قانون نے مرتب نہیں کیا ہے، بلکہ یہ قانون طلاق چودہ سو سال سے پہلے اللہ جل شانہ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمایا، آپ ﷺ نے اس کی تعبیر وتشریح فرمائی، اور مسلم سماج پر اسے نافذ فرمایا، آپ ﷺ نے جزئیات اور تفصیلات کی وضاحت فرمائی طلاق کے ارکان، شرائط، اقسام اور الفاظ پر فقہ اسلامی میں بہت تفصیلی بحثیں ملتی ہیں، طلاق کے موضوع پر دنیا کے کسی قانون میں اس قدر تفصیلات وجزئیات نہیں مل سکتیں جتنی اسلامی قانون میں موجود ہیں۔

قرآن کریم خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا، قرآن کے الفاظ اور معانی آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو سکھلائے، آپ ﷺ نے قرآن کے احکام وتعلیمات پر عمل کیا، امت کو ان کی تعلیم دی، اور مسلمانوں کے سربراہ کی حیثیت سے ان احکام کو مسلم سماج پر نافذ کیا، اگر سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳۴، ۳۵ میں مذکور اقدامات طلاق کا پروسیجر ہوتے، اور انہیں طلاق واقع ہونے کی شرط کی حیثیت حاصل ہوتی تو آپ ﷺ صحابہ کے سامنے اس کی وضاحت فرمادیتے، اور طلاق کے ان واقعات میں طلاق کو واقع ہی نہ مانتے، جن میں شوہر کی طرف سے وہ اقدامات نہ کرلئے گئے ہوں جن کا سورۂ نساء کی آیت ۳۴ اور ۳۵ میں ذکر ہے۔

کتب حدیث کے مطابق یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی میں طلاق کے جو واقعات پیش آئے، اور جن کا آپ ﷺ کو علم ہوا، ان میں کہیں بھی آپ ﷺ نے یہ سوال نہیں کیا کہ طلاق دینے سے پہلے شوہر نے وہ اقدامات کئے یا نہیں، جن کا سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیتوں میں تذکرہ ہے، بلکہ جن واقعات میں یہ بات واضح تھی کہ وہ اقدامات نہیں کئے گئے ہیں ان میں بھی آپ نے طلاق کو واقع مانا، اگر عہد نبوی کے طلاق کے ان واقعات کا تذکرہ کیا جائے تو ایک مفصل کتاب تیار ہوسکتی ہے، کوئی ذی عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرسکتا کہ ہماری عدالتوں کے فاضل ججز کا قرآنی فہم نعوذ باللہ خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ سے بڑھا ہوا ہے، آیات قرآنی کی کوئی بھی ایسی تعبیر وتشریح جو رسول اکرم ﷺ، صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین کی تعبیر وتشریح سے مختلف بلکہ اس کے مخالف ہو، کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی، خواہ وہ کتنی اونچی عدالت کی طرف سے کی جارہی ہو۔

عہد نبوی سے اگر اس طرح کی مثالیں اور واقعات پیش کئے جائیں تو کافی طوالت ہوگی، اس لئے میں ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروقؓ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنی بیوی کو زمانۂ حیض میں طلاق دیدی، یہ بات حضرت عمر کے علم میں آئی تو انہوں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا، آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ وہ طلاق سے رجوع

کرلیں، اور طہر کا زمانہ ہونے پر طلاق دیں، واقعہ کی تفصیل تو چند سطروں کے بعد درج احادیث میں آئے گی، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بیٹا جو خود صحابیٔ رسول ہے، اور احادیث نبویہ کی روایت کرنے والے چند بڑے صحابہ میں سے ہے، وہ اپنی بیوی کو باپ کی لاعلمی میں طلاق دیتا ہے اگر تحکیم کے بعد طلاق دی گئی ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ باپ کے علم میں نہ ہوتا، پھر باپ کو صرف اس بات کی فکر ہوئی کہ بیٹے نے زمانۂ حیض میں طلاق دی ہے، جبکہ زمانۂ حیض میں طلاق دینا ممنوع ہے، پتہ نہیں کہ طلاق ہوئی کہ نہیں اور اب اس صورت میں کیا ہونا چاہئے، ان کے ذہن میں یہ سوالات نہیں آئے کہ بیٹے نے طلاق دینے سے پہلے وہ اقدامات کئے ہیں یا نہیں، جن کا سورۂ نساء کی آیات ۳۴، ۳۵ میں ذکر ہے، ابن عمرؓ کے طلاق دینے کا واقعہ جس کا ذکر حدیث کی تمام مستند کتابوں میں موجود ہے، اور جس کے بارے میں بہت سی روایات ہیں، ان پر غور کرنے سے طلاق کے لئے ہندوستانی عدالتہائے عالیہ کی طرف سے عائد کردہ خود ساختہ شرطوں کی قلعی کھل جاتی ہے، اور ان کا شرعاً غیر لازم ہونا ثابت ہوجاتا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کے زمانۂ حیض میں طلاق دینے کے واقعہ سے ایک اور گتھی بھی سلجھتی ہے کہ زمانۂ حیض میں طلاق دینا اگرچہ شرعاً ممنوع ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس طلاق کو واقع مانا، اسی لئے ابن عمرؓ کو رجوع کا حکم فرمایا، اگر طلاق واقع نہ ہوتی تو رجوع کا حکم کیوں فرماتے، اسی طرح ایک وقت تین طلاق دینا اگرچہ ممنوع ہے، اس طرح طلاق دینے سے آدمی گناہگار ہوتا ہے، لیکن طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس طرح طلاق دینے کے واقعات پیش آئے، آپ ﷺ اس پر سخت ناراض ہوئے، لیکن ایک ساتھ دی گئی تین طلاقوں کو آپ نے واقع مانا، اور بیوی کو شوہر کے لئے حرام ہوجانے کا فتوی دیا۔

اس مختصر تمہید کے بعد کتب حدیث سے حضرت ابن عمرؓ کے طلاق دینے کے واقعہ کو درج کیا جاتا ہے۔

''حدثنا حجاج: حدثنا يزيد بن ابراهيم: حدثنا محمد بن سيرين: حدثني يونس بن جبير: سألت ابن عمر فقال: طلق ابن عمر امرأته وهي حائض، فسأل عمر النبي ﷺ، فأمره أن يراجعها ثم يطلق من قبل عدتها، قلت: أفتعتد بتلك التطليقة؟ قال: أرأيت إن عجز واستحمق ؟'' [صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب مراجعۃ الحائض، حدیث: ۵۳۳۳، ص ۴۶۰، صحاح ستہ]

ترجمہ: یونس ابن جبیر نے بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا (کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے تو کیسا؟) تو فرمایا کہ ابن عمر نے (یعنی میں نے) اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی تھی، تو حضرت عمرؓ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا تو آنحضور ﷺ نے حکم دیا کہ ابن عمر اپنی بیوی سے رجعت کرلے پھر طلاق دے اس کی عدت سے پہلے (یعنی طہر کی حالت میں طلاق دے) میں نے پوچھا اس طلاق کا شمار ہوگا؟ انہوں نے فرمایا: بتلاؤ اگر طلاق دینے والا احکام شرع کے بجالانے سے عاجز ہو یا احمق بیوقوف ہو تو کیا علاج ہے، یعنی طلاق کا شمار ہوگا۔ (نصر الباری، اردو ترجمہ صحیح البخاری)

''حدثنا يحيىٰ ابن يحيىٰ التميمي: قال: قرأت على مالك بن أنس عن نافع عن ابن عمر أنه طلق امرأته وهي حائض في عهد رسول الله، فسأل عمر بن الخطاب رسول الله ﷺ عن ذلك، فقال له رسول الله ﷺ مره فليراجعها، ثم ليتركها حتى تطهر، ثم تحيض ثم تطهر، ثم إن شاء أمسك بعد، وإن شاء طلق قبل أن يطلق قبل أن يمس، فتلك العدة التي أمر الله عزوجل أن يطلق لها النساء ۔'' [صحیح مسلم، باب تحریم الطلاق الحائض بغیر رضاہا وأنہ خالف وقع الطلاق ویؤمر برجعتہا، حدیث نمبر: ۱۴۷۱]

ترجمہ: نافع ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دیا تھا، چنانچہ عمر بن الخطاب نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم انہیں رجعت کرنے کا حکم دو، پھر اپنی بیوی کو چھوڑ دے

یہاں تک وہ پاک ہوجائے، پھر ناپاکی کی مدت آئے، پھر پاک ہو، پھر اس کے بعد اگر وہ چاہے تو رکھے اور اگر چاہے تو تعلق قائم کرنے سے پہلے طلاق دے دے، یہی وہ وقت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کا حکم دیا۔

''حدثنا القعنبي عن مالك عن نافع، عن عبد الله بن عمر أنه طلق امرأته وهي حائض على عهد رسول الله ﷺ، فسأل عمر بن الخطاب رسول الله ﷺ عن ذلك؟ فقال رسول الله ﷺ: مره فليراجعها ثم ليمسكها حتى تطهر ثم تحيض ثم تطهر، ثم إن شاء أمسك بعد ذلك وإن شاء طلق قبل أن يمس، فتلك العدة التي أمر الله سبحانه أن تطلق لها النساء ۔'' [سنن ابی داؤد، باب فی طلاق السنۃ، حدیث: ۲۱۷۹]

ترجمہ: عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دیا تھا، چنانچہ حضرت عمر نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہیں حکم دو کہ وہ رجعت کریں، پھر اس کو اپنے پاس رکھیں یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائے، پھر ناپاکی کا زمانہ آئے پھر پاک ہوجائے، اس کے بعد اگر چاہیں تو رکھیں اور چاہیں تو تعلق قائم کرنے سے قبل طلاق دیدیں، یہی وہ طریقہ ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔''

''حدثنا قتيبة بن سعيد، حدثنا حماد بن زيد عن أيوب عن محمد بن سيرين عن يونس بن جبير، قال: سألت ابن عمر عن رجل طلق امرأته وهي حائض، فقال: هل تعرف عبد الله بن عمر؟ فانه طلق امرأته وهي حائض ، فسأل عمر النبي ﷺ ، فأمره أن يراجعها، قال: قلت: فيعتد بتلك التطليقة؟ فقال: فمه، أرأيت إن عجز واستحمق ۔'' [جامع ترمذی، باب ماجاء فی طلاق السنۃ، حدیث: ۱۱۷۵]

ترجمہ: یونس بن جبیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے حیض کے زمانے میں اپنی بیوی کو طلاق دے دیا ہو، انہوں نے کہا کیا تم عبداللہ

بن عمر کو جانتے ہو؟ انہوں نے بھی اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دیا تھا، چنانچہ حضرت عمر نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا، رسول اللہ ﷺ نے انہیں رجعت کرنے کا حکم دیا، راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کیا اس طلاق کا اعتبار ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کہ اگر طلاق دینے والا احکام شرع کو بجالانے سے عاجز ہو یا بیوقوف ہو تو کیا علاج ہے؟

ہمارے فاضل جج صاحبان نے سورۂ نساء کی آیات ۳۴، ۳۵ میں اجتہاد کر کے وقوع طلاق کے لئے جو شرطیں عائد کی ہیں اس نہج پر اگر قرآن سے مسائل کا استنباط کیا جانے لگا، اور اجتہاد کی گرم بازاری ہوئی تو پورا دین ہی ملیامیٹ ہو جائے گا، اور اسلامی قانون کا نقشہ مکمل طور پر تبدیل ہو جائے گا، غنیمت ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ عورت کو طلاق دینے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اسے مار پیٹ کر سیدھا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہو، کیونکہ سورۂ نساء کی آیت ۳۴ میں جہاں نصیحت کرنے اور بستر الگ کرنے کا ذکر ہے وہیں ہلکے انداز سے مارنے کا بھی ذکر ہے (واضربوھن)۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم صرف قانون کی کتاب نہیں ہے، اس میں بہت ساری اخلاقی تعلیمات وہدایات بھی ہیں، وعظ وتذکیر کے مضامین بھی ہیں، اگر ہر سورت اور آیت کو قانون قرار دے کر اس سے احکام نکالے جائیں گے تو بہت دشواری پیش آئے گی، اور قرآن کے معانی اس سے بہت مختلف ہو جائیں گے جس طرح رسول اللہ ﷺ، صحابہ، تابعین، فقہاء امت نے سمجھا ہے۔

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور ججز ہمارے لئے قابل احترام ہیں لیکن ان کے سارے ادب واحترام کے ساتھ ہمیں یہ لکھنے میں کوئی جھجھک اور تکلف نہیں ہے کہ وہ حضرات عربی زبان وادب سے بالکل ناواقف ہیں، اور جن وکلاء کی معلومات کو بنیاد بنا کر ججز نے سورۂ نساء کی آیت ۳۴ اور ۳۵ کو طلاق واقع ہونے کے لئے شرط قرار دیا ہے، وہ حضرات بھی اپنی تمام تر قانونی قابلیت کے باوجود عربی زبان وادب اور اسلامی علوم سے بالکل ناآشنا ہیں، اس بارے میں ان کا سرمایہ علم قرآن کے بعض انگریزی تراجم ہیں، گوہاٹی ہائی کورٹ کے

جسٹس بحرالاسلام سے پہلے ہمیں کوئی شخص نہیں ملتا جس نے سورۂ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ میں مذکور امور کو وقوع طلاق کے لئے شرط قرار دیا ہو۔

قرآن کریم کی تفسیر میں ہزاروں کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں، لائبریریوں میں تفسیر کی کتابوں کا سیکشن دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کو سمجھنے اور اس کے معانی واحکام کی دریافت میں کتنا عظیم علمی سرمایہ فراہم ہے، قرآن کریم کی تفسیر میں لاکھوں ذہین ترین انسانوں کی دماغی اور علمی صلاحیتیں صرف ہوئیں، لیکن اس وسیع تر علمی لٹریچر میں کہیں کوئی بات ایسی نہیں ملے گی جو اس نقطۂ نظر کی تائید کرے کہ سورۂ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ میں مذکور امور طلاق واقع ہونے کے لئے شرط ہیں۔

اسلامی قانون دنیا کا مکمل ترین قانون ہے، فقہ اسلامی کا عظیم الشان لٹریچر اسلامی قانون کی وسعت اور عظمت کی گواہی دیتا ہے، اگر ہم صرف قانون طلاق پر لکھی ہوئی تحریروں کو جمع کریں تو بلا مبالغہ ایک لاکھ صفحات سے کم میں انہیں اکٹھا نہیں کر سکتے ہیں، طلاق کی حقیقت، قسمیں، احکام اور شرطوں پر بہت تفصیل اور دلائل کے ساتھ فقہاء نے گفتگو کی ہے، وقوع طلاق کی شرطیں، طلاق کا ایک اہم ترین موضوع ہے لیکن فقہ اسلامی کے پورے لٹریچر میں کوئی ایک حوالہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا کہ کسی نے طلاق واقع ہونے کے لئے ان چیزوں کو شرط قرار دیا ہو جنہیں جسٹس بحرالاسلام اور شمیم آرا کیس کا فیصلہ کرنے والے ججز صاحبان سورۂ نساء کی آیت ۳۴، ۳۵ کے حوالہ سے شرط قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں، اس طرح کے بے سروپیر کے فیصلے نہ صرف قرآن کریم اور اسلامی قانون کی توہین کے مرادف ہیں بلکہ ایسے بے بنیاد فیصلوں سے ہماری عدالتوں اور ججوں کا قد بہت چھوٹا ہو جاتا ہے، اور قانون کی دنیا میں ان کی حیثیت بری طرح گر جاتی ہے، اس لئے ہمارے فاضل ججز کی ذمہ داری ہے کہ مک کے وقار اور اپنی عزت کو بچانے کے لئے ایسے بودے اور بے بنیاد فیصلوں سے گریز کریں، اور قرآن کریم، احادیث نبویہ نیز اسلامی قانون کو سمجھنے کے لئے مستند کتابوں اور معتبر اہل علم کی طرف رجوع کریں۔ ☆☆☆

خاندانی اور گھریلو نزاعات کے حل میں دارالقضاء کا کردار

نظامِ قضاء اور مسلمان

تاریخ کے ہر دور میں مسلمان جہاں بھی رہے خواہ وہ حاکم بن کر رہے یا محکوم بن کر، انہوں نے نظام قضاء برپا کرنا اپنا اولین دینی فریضہ تصور کیا، اس لیے کہ قضاء شرعی کے بغیر مسلم معاشرے کے لیے اسلامی زندگی کا تصور ممکن نہیں، تاریخ اسلام کے ہر دور میں دارالقضاء اور مسلم قاضیوں کے بے لاگ فیصلوں نے عدل وانصاف، مساوات انسانی اور قانون شریعت کی بالادستی کی ایسی روشن مثالیں دنیا کے سامنے پیش کی ہیں جن کا تصور بھی دنیاوی عدالتیں نہیں کرسکتیں، ہمارے مسلم قاضیوں نے قانون کی بالادستی قائم رکھتے ہوئے ایک معمولی رعیت کی درخواست پر خلیفۃ المسلمین، سلطانِ وقت اور بڑے بڑے جابر امراء کو فریق مقدمہ کی حیثیت سے دارالقضاء میں طلب کیا ہے اور ان کے خلاف فیصلوں کو نافذ کیا ہے، قاضیوں کے ان بے لاگ فیصلوں نے دعوتِ اسلام کے لیے راہیں ہموار کیں اور غیر مسلموں کے قلوب قبول اسلام کے لیے کھول دیئے۔

ہندوستان میں قضاء شرعی کا نظام

ہندوستان میں سب سے پہلے جنوبی ہند اور گجرات کے ساحلوں پر مسلمانوں کے

قدم پہنچے،قرون اولیٰ کے یہ مسلمان اکثر وبیشتر تجارت کے سلسلے میں ہندوستان وارد ہوئے، ان تاجروں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں اپنی نو آبادیاں قائم کیں، دعوت اسلام کا فریضہ بھی انجام دیا، یہ ابتدائی دور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت واقتدار، سطوت و شوکت کا دور نہیں بلکہ ان کی محکومیت کا دور تھا، پھر بھی انہوں نے اپنی آبادیوں میں قضاء شرعی کا نظام قائم کیا اور اس وقت کے ہندو راجاؤں اور حکمرانوں نے مذہبی رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمان قاضیوں کی قانونی حیثیت تسلیم کی، ان کے فیصلوں کو واجب التسلیم قرار دیا، اولوالعزم مسلمان سلاطین وفاتحین نے سرزمین ہند کو فتح کرنے کے بعد پورے ہندوستان میں اسلام کا نظام عدل نافذ کیا اور تقریبا مسلمانوں کے پورے دور اقتدار میں ہندوستان پر اسلامی قانون کی بالادستی رہی، لیکن مسلم سلاطین نے غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں ادنیٰ مداخلت نہیں کی، غیر مسلموں کو ان کے مذہب اور رسم ورواج پر عمل کرنے کی پوری آزادی دی، ان کے مذہبی امور وعبادات کا انتظام وانصرام بالکلیہ انہیں کے مذہبی پیشواؤں، پنڈتوں اور پروہتوں کے ہاتھوں میں دے دیا، ہندوؤں کو ان کے پرسنل لاء پر عمل کرنے اور اپنے تنازعات ہندو پرسنل لاء کے مطابق فیصل کرانے کی پوری آزادی دی۔

انگریزی دور میں نظامِ قضاء

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد انگریزوں نے ہندوستان پر حکمرانی شروع کی تو انہوں نے اسلامی تہذیب وثقافت کا ہر نقش ہندوستان سے مٹا دینا چاہا، تمام شعبہ ہائے زندگی کی طرح انہوں نے محکمۂ عدلیہ سے بھی اسلام کے اثرات محو کرنے کا منصوبہ بند پروگرام بنایا، تدریجاً انہوں نے اسلامی قوانین منسوخ کرکے اپنے وضع کردہ قوانین ہندوستان کی عدالتوں میں نافذ کئے، ۱۸۵۷ء کی جنگ میں چونکہ مسلمانوں نے قائدانہ رول ادا کیا اور ہندوستان میں برطانوی قصرِ استعمار کی بنیادیں متزلزل کردیں، اس لیے انگریزوں نے حالات پر قابو پانے کے بعد مسلمانان ہند کو ظلم وستم کا خصوصی نشانہ بنایا، مسلمانوں کو من حیث

القوم فنا کے گھاٹ اتارنے اور انہیں مذہب کے عزیز ترین سرمایہ سے محروم کرنے کا جو طویل المیعاد منصوبہ انگریزوں نے تیار کیا اسی کا ایک جزء یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کا اسلامی تشخص ختم کردیا جائے اور مسلمانان ہند کو اسلامی قانون سے ہمیشہ کے لیے محروم کردیا جائے، اس منصوبہ کے تحت ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے بڑی برق رفتاری کے ساتھ عدلیہ کا پورا ڈھانچہ تبدیل کرکے رکھ دیا، ۱۸۶۲ء میں اسلامی تعزیرات کو منسوخ کرکے تعزیرات ہند کا نفاذ عمل میں آیا، ۱۸۶۴ء میں زبردست قدم اٹھاتے ہوئے برطانوی حکومت ہند نے مسلمان قاضیوں کی تقرری موقوف کردی، ۱۸۶۴ء سے قبل ہر علاقہ میں حکومت کی طرف سے مسلمان قاضی مقرر کئے جاتے تھے، جو مسلمانوں کے خانگی اور عائلی تنازعات میں شریعت اسلامی کے مطابق فیصلے دیا کرتے تھے، ۱۸۶۴ء میں نظام قضاء کے خاتمہ کے بعد مسلمان مجبور ہوگئے کہ اپنے خالص خانگی اور عائلی جھگڑے، نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق قضیے بھی غیر مسلم ججوں کی عدالت میں لے جائیں، ۱۸۷۲ء میں اسلامی قانون شہادت کی حکمرانی عدالتوں سے ختم کردی گئی، اس کی جگہ انسانی ذہنوں کا تراشا ہوا قانون شہادت نافذ کیا گیا، غرضیکہ ایک ایک کرکے اسلامی قصرِ عدالت کی ساری اینٹیں جدا کرکے پورے عدالتی نظام کو غیر اسلامی خطوط پر استوار کیا گیا، اور یہ سب کچھ سنگینوں کی نوک پر جبر وتشدد کے سہارے کیا گیا، مسلمانوں کی آہ وفریاد، نالہ واحتجاج نے کوئی اثر نہیں کیا۔

امتداد زمانہ کے ساتھ انگریزوں کے جوشِ غضب میں اور جذبۂ انتقام میں قدرے کمی ہوئی، مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ پیدا ہوا، جس نے برسر اقتدار قوم سے مستقل رسہ کشی قوم مسلم کے لیے مضر سمجھ کر انگریزوں سے رسم وراہ پیدا کی، مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان نفرت وعداوت کا جو گہری خلیج پیدا ہوگئی تھی، اسے پاٹنے کی کوشش کی، دوسری طرف انگریز حکام نے محسوس کیا کہ ظلم وانتقام کی پالیسی خود حکومت کے حق میں مضر ہے، ہندوستانی مسلمانوں کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرنے کے بعد انگریز مبصرین اس نتیجہ تک پہنچے کہ مسلمان مذہب کے سلسلے میں سب سے زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں اور برطانوی حکومت ہند سے

مسلمانوں کی نفرت وعداوت کا سب سے اہم سبب ان کے دینی معاملات میں صریح مداخلت ہے، بالآخر مرکزی مجلس قانون ساز کے مسلم اراکین کی تحریک اور کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں شریعت ایکٹ منظور ہوا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''وراثت، نکاح، فسخ نکاح بشمول طلاق، ایلا، ظہار، لعان، خلع، مبارات، نفقہ، مہر، ثبوت نسب، امانت، جائیداد، حق شفعہ، ہبہ اور اوقاف کے معاملات میں مسلمان لازمی طور پر مسلم پرسنل لاء کے تابع ہوں گے، وصیت اور تبنیت کے معاملات میں مسلم پرسنل لاء کا اطلاق اختیاری ہوگا۔''

شریعت ایکٹ کے بعد

شریعت ایکٹ منظور ہونے سے اسلامی قانون کے ایک جزء کو جسے ہم عائلی قوانین سے تعبیر کرتے ہیں، قانونی تحفظ حاصل ہوا لیکن عائلی قوانین کے تعلق سے دو پہلو شریعت ایکٹ منظور ہونے کے بعد بھی نظر ثانی اور ترمیم کے محتاج تھے: (۱) مسلمانوں کے عائلی اور معاشرتی نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لیے مسلم قاضیوں کا تقرر شرعاً ضروری تھا، کیونکہ غیر مسلم جج کا فیصلہ ان معاملات میں خواہ اسلامی قانون کے مطابق ہی کیوں نہ ہو شرعاً نافذ العمل نہیں ہوتا، لہٰذا اگر ایک غیر مسلم جج خالص شریعت اسلامی کے مطابق ایک مسلمان عورت کا نکاح فسخ کرتا ہے تو شرعاً نکاح فسخ نہیں ہوتا اور وہ عورت دوسرا نکاح کرنے کی مجاز نہیں ہوتی، شریعت ایکٹ مسلمانوں کے لیے اسی وقت کارآمد ومفید ہوسکتا تھا جب کہ مسلمانوں کے عائلی مقدمات کے فیصلے اور شریعت ایکٹ کے نفاذ کے لیے ہر علاقہ میں مسلمان قاضی مقرر کئے جاتے۔ (۲) دوسرا قابل توجہ پہلو یہ تھا کہ مسلمانان ہند کی غالب اکثریت چونکہ حنفی المسلک ہے، اس لیے عدالتیں عملاً اس کی پابند تھیں کہ شریعت ایکٹ کے دائرے میں آنے والے تنازعات میں فقہ حنفی کے مطابق فیصلہ کریں، فقہ حنفی کی رو سے فسخ نکاح کے سلسلے میں قاضی کا دائرہ اختیار محدود سے محدود تر ہے، عورتوں پر شوہروں کے مظالم دن بدن بڑھ رہے تھے، اسلامی شریعت سے دوری کی وجہ سے بہت سے شوہر بیویوں کے حقوق ادا کرنے میں بڑی

کوتاہی برت رہے تھے، شوہر کی مفقود الخبری، عدم ادائے نان ونفقہ، بلاوجہ ضرب وکوب اور مظالم وغیرہ کی وجہ سے بہت سی عورتیں زندگی سے عاجز تھیں، اس طرح کے حالات میں بھی فقہ حنفی کی رو سے نکاح فسخ کرنے کا اختیار قاضی کو حاصل نہیں، اس پوری صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوہروں کے مظالم سے رہائی کے لیے بعض مسلمان عورتیں ارتداد کا راستہ اختیار کرنے لگیں، مسلمان عورتوں کے ارتداد کے بعض ایمان سوز، روح فرسا حوادث پیش آئے۔

علماء کا کارنامہ

دوسرے مسئلہ کی طرف اس دور کے اکابر علماء اور فقہاء نے پوری توجہ کی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نگرانی وسرپرستی میں ''الحیلۃ الناجزۃ'' کی تالیف کا انقلاب انگیز کارنامہ انجام پایا، عورتوں پر ہونے والے مظالم کا سدباب کرنے کے لیے ضرورت شدیدہ کی بناء پر چند اسباب فسخ کو فقہ مالکی سے اختیار کیا گیا اور فسخ نکاح کے سلسلے میں قاضی کے دائرہ اختیار کو وسعت دی گئی تاکہ ستم رسیدہ عورتوں کی دادرسی قاضی کے ذریعہ کی جاسکے اور مسلمان عورتیں ارتداد جیسے ایمان سوز اقدام کا خیال دل میں نہ لائیں، حضرت تھانویؒ نے ان مسائل پر محض اپنا فتویٰ صادر نہیں فرمایا بلکہ تمام قابل ذکر علماء ہند کا ان مسائل پر اتفاق حاصل کیا۔

الحیلۃ الناجزۃ کی تالیف کے بعد حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور دوسرے اکابر علماء نے مجلس قانون ساز کے بعض اراکین کو اس پر آمادہ کیا کہ ''الحیلۃ الناجزۃ'' کی روشنی میں فسخ نکاحِ مسلمین کے سلسلے میں ایک بل مجلس قانون ساز میں منظور کرائیں، اس بل کا مسودہ بھی حضرات علماء نے تیار کرکے دیا، قاضی بل کا مسودہ بھی اسی کے ساتھ منسلک تھا، سید محمد احمد کاظمی نے یہ مسودۂ قانون مرکزی مجلس قانون ساز میں پیش کیا اور تین سال کے بحث ومباحثہ کے بعد ۱۹۳۹ء میں قانون ''فسخ نکاح مسلمین'' پاس ہوا مگر بعض نام نہاد مسلم اراکین مجلس قانون ساز کی پرزور مخالفت کی وجہ سے فسخ نکاح کے لیے مسلم قاضی کی شرط ختم کردی گئی اور

مسلمانوں کا ایک بڑا مذہبی مسئلہ حل ہوتے ہوتے رہ گیا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں پورا ہندوستان تحریک آزادی کے نعروں سے گونج رہا تھا، ہندوستان کی تمام قومیں ہندوستان کی آزادی کے لیے جان و مال کی بازی لگا رہی تھیں، آزادی کی جدوجہد میں مسلمان کسی قوم سے پیچھے نہیں تھے، تحریک آزادی میں مسلمان علماء، قائدین اور عوام، اپنی تناسبِ آبادی سے کہیں زیادہ حصہ لے رہے تھے، تحریک خلافت نے آزادی کی جنگ میں ایک نئی روح پھونک دی تھی، کانگریس آزادی کی جدوجہد کرنے والی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی، کانگریس کے صف اول کے قائدین میں بہت سے مسلم رہنما اور علماء شامل تھے، جمعیۃ علماء ہند کانگریس کے شانہ بشانہ جدوجہد آزادی میں شریک تھی، اس لیے آزادی سے پہلے کانگریس نے اپنی متعدد سالانہ کانفرنسوں کی قرار دادوں میں مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے مسئلہ کو شامل کیا، اور مسلمانوں سے صریح وعدہ کیا اور یقین دہائی کرائی کہ آزادی کے بعد مسلم پرسنل لاء کا پورا تحفظ کیا جائے گا اور اس میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

آزادی کے بعد

آزادی کی صبح بڑی قربانیوں اور تمناؤں کے بعد طلوع ہوئی، لیکن یہ صبح جس کا مدتوں سے انتظار تھا، مسلمانوں کے لیے بڑی بھیانک ثابت ہوئی، تقسیم ملک کے نتیجہ میں نفرت وعداوت کا بادل پورے ملک پر چھا گیا، بے گناہوں کے خون سے ہندوستان کی زمین لالہ زار ہوگئی، ہندوستانی مسلمان بے پناہ خوف وہراس میں مبتلا ہوگئے، مسلمانوں نے آزادی کا جو سہانا خواب دیکھا تھا وہ بکھر کر رہ گیا، انہیں حالات میں آئینِ ہند مرتب اور منظور ہوا، دستور ہند کے واضعین نے مذہب، زبان، تہذیب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں شامل ضرور کیا لیکن مذہب کی آزادی کا دائرہ کہاں تک ہے؟ اس کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی اور اس کا دائرہ کے تعین عملاً عدلیہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا، حیرت ہے کہ جس دستور

ہند میں پسماندہ اقوام اور بعض اقلیتوں کے تعلق سے معمولی جزئیات کی تفصیل موجود ہے، اسی دستور میں اقلیتوں کے پرسنل لا کے تحفظ سے متعلق ایک جملہ بھی موجود نہیں، ستم بالائے ستم یہ کہ دستور ہند کے واضعین نے مسلم اراکین کی مخالفت کے باوجود دستور ہند کے ''مملکت کے رہنما اصول'' کے حصہ میں دفعہ ۴۴ کے عنوان سے یکساں سول کوڈ کا شوشہ چھوڑا ہے اور اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے سروں پر ننگی تلوار لٹکا دی ہے تا کہ جب بھی حالات سازگار ہوں اقلیتوں کے پرسنل لا کا سر قلم کیا جا سکے۔

نظامِ قضاء کی ضرورت

ہندوستان ہی نہیں دنیا کے جس خطے میں بھی مسلمان آباد ہیں، نظامِ قضاء قائم کرنا ان کا ایک اہم دینی فریضہ ہے، تمام مسلمانوں سے خواہ وہ کسی ملک یا خطہ کے رہنے والے ہوں، قرآن وسنت کا مطالبہ ہے کہ اگر باہم اختلاف ونزاع کی صورت پیدا ہوجائے تو اسلامی شریعت کے مطابق اپنے تنازعات کا فیصلہ کرائیں، اس مقصد کے لئے ہر شہر اور خطہ میں قاضی کا ہونا ضروری ہے، جو اسلامی شریعت پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ فہم وفراست، تقویٰ ودیانت کے اوصاف سے بھی متصف ہو، قرآن مجید میں ان لوگوں پر سخت نکیر کی گئی ہے جو ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود اپنے تنازعات اسلامی شریعت کے مطابق حل نہیں کراتے۔

اَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ أَنَّهُمْ آمَنُوْا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، يُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَحَاكَمُوْ إِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ أُمِرُوْا أَنْ يَّكْفُرُوْا بِهِ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلَالاً بَعِيْداً۔ (سورہ نساء آیت: ۶۰)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ جو (کتاب) تم پر نازل ہوئی اور جو (کتابیں) تم سے پہلے نازل ہوئیں ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس کا انکار کریں اور شیطان (تو یہ) چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر رستے سے دور ڈال دے۔

اللہ جل شانہ نے اس حقیقت کو بڑے زور و تاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والے اپنے مقدمات دارالقضاء میں لے جائیں اور وہاں سے صادر ہونے والے فیصلے کو دل و جان سے تسلیم کر کے اس پر عمل پیرا ہوں۔

فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لاَ یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِھِمْ حَرَجاً مِمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. (سورہ نساء، آیت: ۶۵)

تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں، تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں نبی اکرم ﷺ کو قانون الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جو لوگ قانون شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے انہیں فاسق، کافر اور ظالم کہا گیا ہے۔

نصب قاضی کا شرعی حکم

فقہائے اسلام نے متفقہ طور پر نصب قاضی کو فرض قرار دیا ہے، امام علاء الدین ابوبکر کاسانی متوفی ۵۸۷ھ نے لکھا ہے:

"نصب القاضی فرض لأنه ینصب لإقامة أمر مفروض و هو القضاء، قال اللّٰه تعالی: ﴿یا داؤد إنا جعلناک خلیفة فی الأرض، فاحکم بین الناس بالحق .....﴾ وقال تبارک وتعالی لنبینا المکرم علیه أفضل الصلاة والسلام: ﴿فاحکم بینهم بما أنزل الله﴾ فکان نصب القاضی لإقامة الفرض، فکان فرضا ضرورة۔" (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع)

قاضی مقرر کرنا فرض ہے کیونکہ قاضی کا تقرر ایک فرض کام کی انجام دہی کے لئے

ہوتا ہے، وہ فرض کام قضاء ہے، اللہ تعالی نے فرمایا: اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرو، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا: ان لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ کیجئے..... چونکہ قاضی کا تقرر ایک فرض کی انجام دہی کے لئے ہوتا ہے، لہٰذا لازماً تقرر قاضی فرض ہوا۔

شمس الائمہ امام سرخسیؒ متوفی ۴۹۰ھ لکھتے ہیں :

"إعلم أن القضاء بالحق من أقوی الفرائض بعد الإیمان باللّٰه وهو أشرف العبادات۔" (کتاب المبسوط لشمس الدین السرخسی، ج۱۶، ص۵۹)

جان لو کہ حق کے مطابق فیصلہ کرنا ایمان باللہ کے بعد اہم ترین فرائض میں سے ہے اور ساری عبادتوں سے اشرف عبادت ہے۔

ہندوستان میں قضاء شرعی کی ضرورت

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اکابر علماء کو ہر دور میں نظام امارت اور نظام قضاء کے قیام کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ متوفی ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۳ء وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے انگریزی تسلط کے بعد ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ جاری کیا، شاہ صاحبؒ نے اس بات پر بھی اپنے فتاویٰ میں زور دیا کہ ہر علاقہ کے مسلمان اپنا امیر مقرر کر لیں اور اسی کے ماتحتی میں وہ تمام اجتماعی کام انجام دیں جو امیر و قاضی کے بغیر انجام نہیں پا سکتے ہیں:

"امامت جمعہ در دارالحرب اگر از طرف کفار والی مسلمان در مکانے منصوب باشد، باذن او درست و إلاّ مسلمانان را باید کہ یک کس را کہ امین و متدین باشد رئیس قرار دہند کہ باجازت وحضور او اقامت جمعہ واعیاد وانکاح من لا ولی من الصغار وحفظ مال غائب وایتام وقسمات ترکات متنازع فیها علی حسب السهام می نموده باشد" (مجموعہ فتاویٰ عزیزی

ص۳۴)۔

اگر کفار کی طرف سے مسلمان والی دارالحرب کے کسی مقام پر مقرر ہوتو اس کی اجازت سے جمعہ قائم کرنا درست ہے، ورنہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ایک امین اور متدین شخص کو خود ہی سردار (والی) مقرر کرلیں جس کی اجازت سے جمعہ اور عیدین قائم کی جائیں، اور اس کے حکم سے ان نابالغوں کا نکاح پڑھایا جائے جن کا کوئی والی نہیں ہے، غائب اور یتیموں کے مالوں کی حفاظت کی جائے اور نزاع والے ترکات کو حصص شرعیہ کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

علامہ انور شاہ کشمیری متوفیٰ ۱۳۵۲ھ-۱۹۳۳ء نے جمعیۃ العلماء کے اجلاس ہشتم منعقدہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں تحریر فرمایا تھا :

'' آج اگر اعداد وشمار سے کام لیا جائے اور نظر تدقیق وتفتیش سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں ایسی عورتوں کی تعداد جو اپنے خاوندوں کے جور وستم کی تختۂ مشق بنی ہوئی ہیں یا خاوندوں کے مفقود اور لاپتہ ہوجانے کی وجہ سے نان شبینہ کی محتاج ہیں، یا ظالم شوہروں نے ان کو معلقہ بنا کر چھوڑ رکھا ہے، لاکھوں تک پہنچتی ہے، ایسی مظلوم عورتیں جب کہ کسی طرح اپنے خاوندوں کے جور وستم سے خلاصی حاصل نہیں کرسکتیں تو وہ بے بسی اور بے کسی کے عالم میں بدحواس ہوکر ارتداد کی طرف متوجہ ہوتی ہیں، ہندوستان میں اس قسم کے دلخراش اور ناگفتہ بہ کتنے ہی کیس ہوچکے ہیں جو مسلمانوں کی بدقسمتی میں ایسا اضافہ کرتے ہیں، جس کا جبر ناممکن ہے، ایک مسلمان کا مرتد ہوجانا بھی مسلمانوں کے لئے مصیبت کبری ہے، پھر بالخصوص عورتوں کا ارتداد معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نہایت سخت مہلکہ ہے، خدا نہ کرے عورتوں میں اس قسم کی تحریک سرایت کرے۔.....، دردمند مسلمانوں کا اس وقت سب سے بڑا فریضہ ہے کہ وہ ان بے کس اور بے بس مظلوم عورتوں کی گلوخلاصی کا پہلی فرصت میں سامان کریں اور اس کی ایک ہی سبیل ہے کہ محکمۂ قضاء قائم کرانے کی کوشش کریں اور محکمۂ قضاء ان بے چاریوں کے مصائب کا علاج کرے''۔ (خطبۂ صدارت جمیعۃ العلماء اجلاس پشاور مطبوعہ ''سچ''، لکھنؤ ۲۷ جنوری ۱۹۲۸ء، ص۴)۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے مذکورہ بالا سطروں میں جس بھیانک صورت حال کی تصویر کشی کی ہے، میرے خیال میں اس کی سنگینی میں دن بہ دن اضافہ ہوتا گیا، ''قانون انفساخ نکاح مسلمین'' کے ساتھ اگر ''قاضی بل'' بھی پاس ہوگیا ہوتا تو غالباً ستم رسیدہ عورتوں کی بدحالی کا علاج ہوجاتا لیکن اولاً موجودہ پیچیدہ تر عدالتی نظام میں انصاف حاصل کرنا ہمالیہ کی بلندترین چوٹی سر کرنے سے کم نہیں ہے، ہماری سرکاری عدالتوں میں سب سے گراں اور کمیاب چیز انصاف ہے۔ ثانیاً اگر ایک مظلوم عورت ''قانون انفساخ نکاح مسلمین'' کے تحت موجودہ غیر اسلامی عدالتوں سے نکاح فسخ کرانے میں کامیاب ہوگئی تو یہ فسخ نکاح شریعت اسلامی کی نگاہ میں معتبر نہیں ہے، لہٰذا نظام قضاء کی ضرورت جوں کی توں قائم رہی۔

دارالقضاء قائم کرنے کی کوششیں

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے بعد اور دارالقضاء کے نظام ختم کئے جانے کے بعد علماء نے خاص طور سے اس بات کو محسوس کیا کہ مسلمانوں کے وہ مسائل جو اجتماعی نظام قائم کئے بغیر حل نہیں ہوسکتے، ان کے لئے پورے ملک میں قضا کا نظام قائم کیا جائے اور مسلمانوں کا یہ مزاج بنایا جائے کہ وہ اپنے آپسی اختلافات خصوصاً گھریلو تنازعات (فیملی میٹرس) کو اسلامی شریعت کی روشنی میں حل کرنے کے لئے دارالقضاء کا نظام برپا کریں، تاکہ سہولت کے ساتھ شریعت کے مطابق ان کے مسائل حل ہوسکیں۔

اس سلسلہ کی سب سے پہلی کوشش قدیم صوبۂ بہار (موجودہ وقت کے صوبۂ بہار، صوبۂ اڑیسہ اور صوبۂ جھارکھنڈ) میں ہوئی، وہاں کے علماء، مشائخ اور قائدین نے امارت کا نظام قائم کیا، اور اس کے تحت مختلف اضلاع میں دارالقضاء کا نظام قائم کیا، اور عوامی سطح پر ذہن سازی کے لئے پوری محنت کی، صوبۂ بہار میں دارالقضاء کا آغاز.....میں ہوا، الحمدللہ اکثر اضلاع میں اور بعض علاقوں میں تحصیلوں تک میں دارالقضاء قائم ہیں، اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کے اختلافات خصوصاً فیملی میٹرس سے متعلق تنازعات کا حل اسلامی شریعت کے

مطابق ہوتا ہے، اور لوگ انہیں بخوشی قبول کرتے ہیں، اور ان پر عمل کرتے ہیں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دفعہ فیملی کورٹس کے ججز اور مختلف عدالتوں کے جج اپنے ہاں دائر معاملات میں جبکہ فریقین مسلمان ہوں انہیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اپنا یہ جھگڑا جس کا مذہب سے تعلق ہے اسے دارالقضاء میں لے جا کر حل کرو، ہمارا وقت برباد نہ کرو۔

صوبۂ بہار کو دیکھ کر بعض اور صوبوں میں بھی امارت کا نظام قائم ہوا، اور ضلع اور تحصیل کی سطح پر دارالقضاء قائم کرنے کی کوشش کی گئی، چنانچہ صوبۂ آسام اور اس سے متصل چند چھوٹے چھوٹے صوبوں میں امارت کا نظام قائم کر کے دارالقضاء قائم کرنے کی بڑے پیمانہ پر کوششیں ہوئیں، چنانچہ صوبۂ آسام میں بھی بڑی تعداد میں دارالقضاء قائم ہیں، جن کے ذریعہ مسلمانوں کے فیملی تنازعات کا حل خاص طور سے کیا جارہا ہے، اور لوگ اسے قبول کررہے ہیں، صوبۂ کرناٹک اور صوبۂ آندھراپردیش میں بھی امارت اور دارالقضاء کی کوششیں ہوئیں، وہاں بھی کچھ مقامات پر دارالقضاء قائم ہیں، اور وہ اپنا کام کررہے ہیں، لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے انہیں زیادہ وسعت نہیں مل سکی۔

بورڈ کی طرف سے دارالقضاء کے قیام کی کوششیں

۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا، وحدت کلمہ کی بنیاد پر اس پلیٹ فارم پر تمام مسلک ومشرب کے مسلمانوں کو مجتمع کیا گیا، مسلم پرسنل لا بورڈ کا بنیادی مقصد ہندوستان میں اسلامی شریعت کا تحفظ ہے، اور اسلامی شریعت میں مداخلت کی تمام کوششوں کو روکنا ہے، خواہ وہ قانون ساز اداروں کے ذریعہ ہو، یا عدالتوں کے ذریعہ، یا انتظامیہ کے ذریعہ، اور مسلمانوں میں یہ شعور بیدار کرنا کہ اسلامی شریعت کا تحفظ خود ان کے ہاتھوں میں ہے، اگر مسلمان اپنی زندگی میں شریعت کے احکام پر عمل کریں، اور اپنے جھگڑے شریعت کے مطابق حل کریں تو انشاء اللہ شریعت محفوظ رہے گی، اور ہر قسم کی سازش اور دخل اندازی ناکام ہوگی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ابتدائے قیام ہی سے مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ وہ کم از کم ضلع کی سطح پر دارالقضاء قائم کریں، اور اپنے گھریلو اختلافات کو شریعت کی روشنی میں دارالقضاء سے حل کرائیں، چنانچہ بورڈ کی تحریک پر کئی مقامات پر دارالقضاء قائم ہوئے، لیکن بورڈ کے ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ اس کام میں تیز رفتاری نہیں آرہی ہے، لہٰذا بورڈ نے فیصلہ کیا کہ جن صوبوں میں امارت کا نظام نہیں ہے (اور اکثر صوبے ایسے ہی ہیں) وہاں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ خود دارالقضاء قائم کرنے کی کوشش کرے، اور دارالقضاء بورڈ کی نگرانی میں رہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا فورم ہے، اس میں تمام مسالک، اداروں اور بڑی تنظیموں کی شرکت ہے، لہٰذا بورڈ کو بجا طور پر مسلمانان ہند کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے، شرعاً اس کا پورا جواز ہے کہ بورڈ کے متفقہ فیصلے کے بعد صدر بورڈ دامت برکاتہم کی طرف سے مختلف اضلاع اور علاقوں میں قاضی نامزد کئے جائیں، اور بورڈ کی طرف سے ان کے کاموں کی نگرانی ہو، اس کام کے لئے بورڈ نے دارالقضاء کمیٹی قائم کی، اور اس کا کنوینر مقرر کیا، یہ کمیٹی الحمدللہ بورڈ کے ذمہ داروں کی رہنمائی، اور مشورہ سے دارالقضاء قائم کرنے ان کے کاموں کا جائزہ لینے اور ان سے متعلق مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے مختلف صوبوں میں دارالقضاء قائم ہیں، جو بحسن وخوبی اپنے کاموں کو انجام دے رہے ہیں، سب سے زیادہ تعداد صوبۂ مہاراشٹر میں ہے، وہاں بورڈ کے ۴۰/دارالقضاء ہیں، جن میں سے آٹھ ممبئی میں ہیں، یوپی میں بورڈ کے ۱۹/دارالقضاء ہیں، صوبۂ گجرات میں ۳، مدھیہ پردیش میں ۳، راجستھان میں ۵، ہریانہ میں ۳، دہلی میں ایک، چھتیس گڈھ میں ایک، کرناٹک میں دو، پنجاب میں ایک اور گوا میں ایک دارالقضاء ہے۔

الحمدللہ پورے ہندوستان میں دارالقضاء قائم کرنے اور اپنے معاملات کو دارالقضاء کے ذریعہ حل کرانے کا رجحان بڑھا ہے، کووڈ ۱۹/اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے دارالقضاء کی سرگرمیاں متأثر رہیں، لیکن جوں جوں حالات بہتر ہورہے ہیں سرگرمیاں بحال ہورہی ہیں،

اور نئے دارالقضاؤں کے قیام کے مطالبے بڑھ رہے ہیں۔

بڑی خوش آئند بات ہے کہ دارالقضاء میں آنے والے معاملات میں سے عموماً پنچانوے (۹۵) فیصد معاملات فریقین کی باہمی رضامندی سے حل ہوجاتے ہیں، فریقین جب قاضی کے سامنے ایک ساتھ بیٹھتے ہیں اور قاضی ان کی باتوں کو سننے کے بعد انہیں آپس میں صلح کرنے کی ترغیب دیتا ہے، اور نفسانیت اور ضد پر اڑنے کے نقصانات بتاتا ہے، اور پوری غیر جانبداری اور ہمدردی کے ساتھ ان کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو فریقین کسی نہ کسی بات پر متفق ہوجاتے ہیں، اور جھگڑا خوش اسلوبی کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے، بہت کم معاملات میں ایسا ہوتا ہے کہ فریقین کسی بات پر راضی نہ ہوسکیں، اور قاضی کو دونوں کی خواہش پر اپنا فیصلہ سنانا پڑے۔

یہ پہلو بھی بڑا اہم ہے کہ دارالقضاء سے رجوع ہونے والی ۹۵ر فیصد خواتین ہوتی ہیں، رجوع ہونے والوں میں مردوں کا صرف پانچ فیصد ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دارالقضاء کے نظام سے خواتین کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے، اور زیادہ تر انہیں کی دادرسی ہوتی ہے، دارالقضاء کا نظام سارے مسلمانوں کے لئے خاص طور سے خواتین کے لئے اللہ کی بڑی رحمت ہے۔

☆☆☆☆

ہندوستان میں شریعت اسلامی کا تحفظ کیسے ہو؟

مسلمانان ہند کے لئے راہ عمل

۲۲؍اگست ۲۰۱۷ء کے سپریم کورٹ کی آئینی بینچ (چیف جسٹس کیہر کی سربراہی میں) کے فیصلہ اور ۲۸؍دسمبر ۲۰۱۷ء کو طلاق کے بارے میں پارلیمنٹ میں پیش اور پاس ہونے والے بل نے مسلمانوں کو بجا طور پر اضطراب اور بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے، اور مسلمان عمومی طور پر یہ محسوس کرنے لگے کہ مقنّنہ اور عدلیہ دونوں ان کے مذہب میں مداخلت کر رہے ہیں، نکاح وطلاق جو ہر طرح سے مذہبی معاملہ ہے اور جس کے مسلم پرسنل لاء میں شامل ہو کر دستور کی دفعہ ۲۵؍(جو مذہبی آزادی سے متعلق ہے) میں داخل ہو کر قابل تحفظ ہونا خود اس بینچ کے تین فاضل ججوں کے نزدیک مسلم ہے، ان کے بارے میں مذکورہ بالا فیصلہ اور بل شریعت میں کھلی ہوئی مداخلت ہے۔

ایک ساتھ تین طلاق دینا اسلام میں سخت ناپسندیدہ عمل ہے، شریعت نے طلاق کا انتہائی معقول اور مہذب طریقہ سکھایا ہے، لیکن کوئی شخص اگر غصہ یا جہالت کی وجہ سے بیک وقت یا ایک مجلس میں تین طلاق دے ڈالے تو اسلامی شریعت اس طلاق کو واقع مانتی ہے، اسلامی شریعت میں نیز موجودہ قوانین میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو اگرچہ ناپسندیدہ اور ممنوع ہیں لیکن اگر انسان کر ڈالتا ہے تو شریعت اور قانون اس کو واقع مانتے ہیں، ایک ساتھ دی جانے والی تین طلاق کے بارے میں احادیث وآثار کی بنیاد پر جمہور امت کا موقف یہی ہے کہ تین طلاق پڑتی ہے، یہ صرف حنفیہ کا مسلک نہیں ہے، بلکہ چاروں ائمہ فقہ (امام

ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل) جن کے فقہی مسالک عام طور سے مسلمانوں میں مروج ہیں ان سب کے نزدیک ایک ساتھ یا ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں تین ہی مانی جاتی ہیں، سلفی مسلک کے مسلمان تین طلاق کو ایک مانتے ہیں، سپریم کورٹ کی آئینی بینچ نے بالکل الگ فیصلہ کیا ہے اور تین طلاقوں کو بالکل غیر معتبر مانا ہے کہ ایک طلاق بھی نہیں پڑے گی، اور شوہر بیوی کے رشتۂ نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اس فیصلہ نے مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے بڑی مشکلات پیدا کر دی ہیں، کیونکہ تین طلاق کے بعد دونوں ایک دوسرے کے لئے حرام ہو چکے ہیں، اس مسئلہ میں ایک مسلمان کے لئے قانون شریعت اور عدالت عالیہ کے فیصلہ دونوں پر چلنا ممکن نہیں، اگر دونوں دیندار ہوں اور حلال و حرام کا خیال رکھتے ہوں تب تو یہ ممکن ہے کہ وہ عدالت کا رخ نہ کریں اور شریعت کا حکم جان کر اس کے مطابق عمل کریں، دونوں اپنا نکاح ختم سمجھیں، اور عورت عدت گزارنے کے بعد کہیں اور نکاح کر لے، لیکن مطلقہ عورت کے لئے نئے نکاح کے راستے کو اس فیصلہ نے اور مشکل بنا دیا، کیوں کہ اس عورت کے گھر والے اس کے رشتہ کے لئے جہاں سے رابطہ قائم کریں گے انہیں اگر معلوم ہو گیا یہ عورت طلاق شدہ ہے تو رشتہ پسند ہونے کے باوجود بھی لوگ اس عورت سے نکاح کرنے میں گریز کریں گے، کیوں کہ دل میں یہ اندیشہ ہوگا کہ اگر تین طلاق دی گئی ہو تو کہیں اس کا پہلا شوہر کسی مرحلہ میں عدالت سے رجوع ہو کر اس دوسرے نکاح کو ختم نہ کر دے، کیوں کہ ایک ساتھ دی گئی تین طلاق تو عدالت عالیہ کے نزدیک پڑتی ہی نہیں ہے اور دونوں کا رشتہ نکاح قانون کی نظر میں باقی ہے، جس سے رشتہ کی بات چلے گی وہ سوچیں گے کہ ایک تو مطلقہ عورت سے نکاح کرو، دوسرے مقدمہ بازی کا خطرہ مول لو، اس الجھن اور پریشانی میں کیوں پڑا جائے، عدالت عالیہ کے اس فیصلہ سے ایک ساتھ تین طلاق دی گئی عورتوں کی مشکلات دور ہونے کے بجائے مزید سنگین ہو جاتی ہے، اور ان کے لئے زندگی کا سفر انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

اگر ایک ساتھ تین طلاق دی گئی عورت دینی احساس سے عاری ہے اور اسے حلال و

حرام کی تمیز نہیں ہے، اور وہ عدالت عالیہ کے فیصلے کا سہارا لے کر طلاق دینے والے شوہر کے ساتھ رہنے پر مصر ہے لیکن اس کا شوہر حلال وحرام کا خیال رکھنے والا ہے یہ جاننے کے بعد کہ بیوی میرے لئے قطعی حرام ہو چکی ہے وہ اسے رکھنے پر آمادہ نہیں ہے تو دونوں کی زندگی عجیب پریشانی اور مشکل میں گزرے گی، ممکن ہے کہ شوہر عدالت کے ڈر سے اور تین طلاق کے قانون کی سزا کے ڈر سے عورت کو اپنے گھر میں رکھے رہے، کھانا خرچہ بھی دے، لیکن جب وہ اس عورت کو اپنے اوپر حرام سمجھتا ہے تو اس کے لئے عورت کی جنسی خواہش پوری کرنا، اس کے ساتھ بیوی کی طرح رہنا ممکن نہ ہوگا، اور دونوں کی زندگی جہنم کا نمونہ بنی رہے گی، اگر عورت دیندار ہے اور حرام سے بچنے والی ہے لیکن اس کا شوہر دیندار نہیں اور تین طلاق دینے کے باوجود چاہتا ہے کہ بیوی کو بیوی بنا کر رکھے، اور عورت دینداری کی وجہ سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ شوہر میرے لئے بالکل حرام ہو چکا ہے اس مرد کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو ایسی صورت میں عورت کی پریشانی ناقابل بیان ہے، شریعت کی نظر میں وہ اس کی بیوی نہیں ہے، اس پر حرام ہو چکی ہے اور قانون کی نظر میں وہ اس مرد کی بیوی ہے اسے اس مرد کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہنا چاہئے۔

ہاں اگر دونوں ہی بے دین ہیں انہیں حلال وحرام کا خیال نہیں، اور تین طلاق دیے جانے کے باوجود دونوں خوشی خوشی ساتھ رہ رہے ہیں تو بظاہر ان دونوں کے لئے دنیا میں الجھن اور پریشانی کی بات نہیں ہے، لیکن مسلم سماج ان دونوں کو بدکاری کرنے والے مرد عورت کی صورت میں دیکھے گا اور مسلمان گھرانوں کے ان سے کسی طرح کے خوش گوار تعلقات نہ ہوں گے، جیسے فیملیوں میں باہم ہوا کرتے ہیں، مسلم سماج کے لئے یہ سوالیہ نشان ہوگا کہ ان کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جائے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس ہنگامہ خیز فیصلہ سے بہت پہلے ۲۰۰۲ء میں سپریم کورٹ کی دو رکنی بینچ نے شمیم آرا کیس میں جو فیصلہ سنایا وہ حالیہ فیصلہ سے کہیں زیادہ خطرناک اور اسلام کے قانون طلاق کو پامال کرنے والا تھا، اس میں نہ صرف ایک ساتھ دی گئی تین طلاق کو کالعدم

کیا گیا ہے بلکہ ہر وہ طلاق جس میں طلاق دینے سے پہلے افہام وتفہیم کی کوشش نہ کی گئی ہو، فریقین کی طرف سے ثالث مقرر کر کے اختلاف کو حل کرنے کی کاروائی نہ کی گئی ہو یا طلاق دینے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو یا عورت کو طلاق دینے کی اطلاع نہ دی گئی ہو تو ان تمام صورتوں میں مذکورہ بالا فیصلۂ طلاق کو واقع نہیں مانتا ہے اور حسب سابق رشتۂ نکاح کو باقی مانتا ہے۔

تین طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ سے جو دشواریاں اور پیچیدگیاں مسلم سماج خصوصاً مسلم خواتین کو لاحق ہونے والی ہیں ان کا تذکرہ اجمال کے ساتھ اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے، تین طلاق کے بارے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ سے مسلم سماج کے لئے جو دشواریاں پیدا ہوئیں ان سے کہیں بڑھ کر پارلیمنٹ سے پاس ہونے والے طلاق بل کے نقصانات ہیں، مذکورہ بالا فیصلہ کے بعد پارلیمنٹ میں طلاق سے متعلق کوئی بل لانے اور پاس کرنے کی قطعا ضرورت نہیں تھی لیکن موجودہ حکومت جو مسلمانوں کے عائلی قوانین کو پامال کرنے اور مسلمانوں کو ان کے دین وشریعت سے محروم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے اس نے پوری عجلت کے ساتھ طلاق کا قانون پارلیمنٹ میں پیش کیا اور دونوں ایوانوں سے اسے منظور کرا کر صدر جمہوریہ کی دستخط کے بعد اسے نافذ کر دیا، طلاق کا یہ قانون نہ صرف تین طلاق پر پابندی لگاتا ہے اور اسے غیر معتبر قرار دیتا ہے بلکہ ہر ایسی طلاق جس سے رشتۂ نکاح فوری طور پر ختم ہو جائے (خواہ وہ ایک ہی طلاق ہو) اس پر پابندی عائد کرتا ہے اور اسے غیر معتبر قرار دیتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ قانون طلاق دینے کو ایک سنگین جرم قرار دیتا ہے جس پر شوہر کو تین سال تک کی سزا دی جاسکتی ہے، درحقیقت یہ امتناع طلاق (طلاق پر پابندی عائد کرنے کا) کا قانون ہے، اس کے ذریعہ اسلام کے قانون طلاق کو پامال کیا گیا ہے، اور مسلم سماج خصوصاً مسلم خواتین کے لئے یہ بے شمار مسائل پیدا کر دئے گئے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں مسلمان کیا کریں، اور اس فیصلہ اور بل سے پیدا ہونے والی مشکلات سے کس طرح نبرد آزما ہوں۔

رات کی تاریکی سے صبح کی روشنی چمکتی ہے اور تنظیم وتدبیر رکھنے والی قومیں مشکل

ترین حالات میں اپنے لئے راہ عمل نکال لیتی ہیں، ہندوستان میں حالات کا جو رخ ہے اس کے لحاظ سے مزید خلاف شریعت فیصلے آسکتے ہیں اور قانون شریعت کو پامال کرنے والے قوانین مقننہ سے پاس ہوسکتے ہیں، انہیں روکنے کی کوششیں ضرور کی جانی چاہئیں، اور سیاسی حالات کو اپنے لئے ہم آہنگ بنانے کی اجتماعی جدوجہد ہر پیمانہ پر کی جانی چاہئے، لیکن ہمیں اگر اس میں کامیابی نہیں ملتی تو بھی ہمارے لئے راستے بند نہیں ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ان کے مذہب اور قانون کے تحفظ کی امید نہ انہیں عدالتوں سے رکھنی چاہئے نہ قانون ساز اداروں سے، بلکہ شریعت اسلامی کے تحفظ اور اس پر عمل آوری کی ذمہ داری سب سے اول اور آخر انہیں پر ہے، اگر وہ انفرادی واجتماعی طور پر طے کرلیں کہ ہمیں اسلامی شریعت پر چلنا ہے اور اپنے اختلافات اور نزاعات قانون شریعت کی روشنی میں حل کرنا ہے، اپنے گھر اور معاشرہ میں خوشی خوشی شریعت کے احکام جاری کرنا ہے تو کوئی حکومت عدالت اور قانون ساز ادارہ انہیں ایسا کرنے سے نہیں روک سکتا، عدالت، حکومت اور پارلیمنٹ کو شریعت میں مداخلت کا اس وقت موقع فراہم ہوتا ہے جب خود مسلمان خواتین اور مرد اپنے حقیر مفادات اور دنیاوی فوائد کے لئے عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور حکومت کے ایوانوں کے چکر لگاتے ہیں، شاہ بانو سے لے کر سائرہ بانو تک ایک شرمناک داستان ہے جو ہم نے خود اپنے قلم سے لکھی ہے، اور اسلام دشمن طاقتوں کو اسلامی شریعت اور اسلامی قانون پر اعتراضات کی بارش کرنے کا موقع فراہم کیا ہے، اگر ہم یہ طے کرلیں کہ اپنے ازدواجی اور عائلی مسائل کو کہیں اور نہیں لے جائیں گے بلکہ شریعت کے مطابق ان کا حل فراہم کرنے والے مسلم اداروں (دارالقضاء، محکمہ شرعیہ، مسلم کونسلنگ سینٹر وغیرہ) میں جاکر انہیں حل کرائیں گے اور شریعت کا جو فیصلہ ہوگا اس پر خوش دلی کے ساتھ عمل کریں گے تو ملک کا کوئی قانون ہمیں اس پر مجبور نہیں کرسکتا کہ ہم اپنے ان خانگی اختلافات کو لازماً سرکاری عدالتوں میں لے کر جائیں اور وہیں جاکر فیصلہ حاصل کرائیں۔

ہر ضلع اور تحصیل میں دارالقضاء ہونا چاہئے جہاں انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اسلامی شریعت کے مطابق مسائل کا حل کیا جائے اور ہر آبادی میں ایسے کونسلنگ سینٹر قائم کیے جائیں جس میں کم از کم ایک صاحب نظر عالم، ایک ماہر قانون اور کچھ سماج کے بااثر افراد شامل ہوں جو لوگوں کو صحیح مشورہ دیں اور نزاعی معاملات خصوصاً گھریلو تنازعات کو صلح وصفائی کے ذریعہ حل کرنے کی سنجیدہ کوشش کریں، اگر سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے اور طلاق کے بارے میں پارلیمنٹ کے نئے قانون سے بیدار ہوکر مسلمان اپنی شریعت کے تحفظ کا اور اس پر مکمل عمل آوری کا فیصلہ کرلیں تو یہ چیز ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کو روشن بنادے گی اور ایک بڑے شر کی کوکھ سے عظیم ترین خیر جنم لے گا، اور ایسا ہونا بہت مشکل نہیں ہے بشرطیکہ مسلمان اس کا تہیہ کرلیں اور اپنے دین وشریعت کی طرف مکمل واپس آجائیں۔

آج ہم جن حالات سے دوچار ہیں ان حالات تک پہونچانے میں ہماری جہالت، ناواقفیت اور شریعت سے عدم دلچسپی کا بہت دخل ہے، اسلام کے احکام اور قوانین سے ناواقفیت مسلمانوں میں ایک عام بات ہے، ہمیں اپنی قوم کو اسلام کے عقائد، عبادات، معاملات، حقوق وفرائض سے واقف کرانا ہوگا، اپنے نظام تعلیم وتربیت میں بنیادی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔

صورت حال یہ ہے کہ ہمارے لڑکے اور لڑکیاں جوان ہوتے ہیں ہم ان کی شادی کرتے ہیں اور انہیں پتا نہیں ہوتا کہ اسلام میں نکاح کے مقاصد کیا ہیں، اور نکاح کی وجہ سے شوہر اور بیوی پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور خوش گوار زندگی گزارنے کے کیا طریقے اور آداب ہیں، رشتوں میں تلخی پیدا ہونے کی صورت میں کتاب وسنت میں کیا ہدایات دی گئی ہیں، اسلام میں طلاق کا تصور کیا ہے، طلاق کب دی جاسکتی ہے، اور اس کا شرعی طریقہ کیا ہے۔

ہمیں ان تمام چیزوں سے اپنے نوجوانوں اور بڑوں کو واقف کرانا ہوگا، انہیں دینی تربیت فراہم کرنی ہوگی، ایسے مختصر کورسیز تیار کرنے ہوں گے جن کی مدد سے ہم نئی نسل کو

اسلام کے بنیادی عقائد واحکام خانگی اور معاشرتی تعلیمات سے پورے طور پر واقف کراسکیں، جونوجوان لڑکے اورلڑکیاں شادی کے مرحلہ کو پہونچ گئے یاان کی شادیاں ہوچکیں ان کے لئے ہر علاقہ میں خصوصی کیمپ لگا کران مسائل پر مرتب اور مؤثر پروگرام پیش کرنے ہوں گے، تاکہ ان میں بیداری پیدا ہو، اور وہ صحیح اسلامی تعلیمات سے واقف ہوسکیں، یہ کام مسلسل کرنا ہوگا اور تمام علاقوں میں اسے روبہ عمل لانا ہوگا۔

موجودہ حالات میں مردوں میں یہ احساس پیدا ہوچلا ہے کہ بیوی کوطلاق دینا اب اتنا آسان کام نہیں رہ گیا، طلاق دے کر ہم مسائل ومشکلات کا شکار ہوسکتے ہیں اور قانون کے شکنجے میں آسکتے ہیں، اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ نہ صرف جیل کی ہوا کھانی پڑے بلکہ وہاں طویل قیام بھی کرنا پڑسکتا ہے، اس لئے عجلت پسند اور جذباتی مرد بھی اب ازدواجی زندگی میں تلخیاں آنے کے باوجود طلاق دینے میں جلد بازی نہیں کرے گا بلکہ سوچ سمجھ کر اور مشورہ کرنے کے بعد ہی اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھائے گا، ہمیں اپنی ہر بڑی آبادی میں کونسلنگ سینٹر اور مشاورتی مراکز قائم کرنے چاہئیں، مسائل سے کوئی واقف عالم، فیملی لاء سے واقف کوئی قانون داں، سماج کے کچھ بااثر افراد اپنی خدمات پیش کریں، اور مسلمان خاندانوں کے فیملی تنازعات کوحل کرنے اوران میں صلح کرانے کی پوری کوشش کریں، اور جولوگ اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں کوئی شرعی یا قانونی مشورہ طلب کرنے آئیں توانہیں صحیح مشورہ دیں۔

اگر پورے ملک میں مسلمانوں کی آبادیوں میں ایسے کونسلنگ سینٹر یا مشاورتی مراکز قائم کردیے جائیں اور وہ دلچسپی اور فکرمندی کے ساتھ اپنے کام انجام دیں، اور جو مسائل وہاں نہ حل ہوسکیں انہیں دارالقضاء میں بھیج دیا کریں تو ہماری بہنوں اور بھائیوں کو اپنے عائلی تنازعات کوحل کرنے کے لئے سرکاری عدالتوں کا رخ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، اور خوش گوار ماحول میں شریعت کے طے کردہ حدود میں ہمارے مسائل حل ہوجایا کریں گے، لیکن یہ سارے کام تسلسل، لگن اور منصوبہ بندی چاہتے ہیں، اوران کاموں کو انجام دینے کی صلاحیت رکھنے والے مرد وخواتین سے وقت اور قربانی چاہتے ہیں،

ہندوستان کے مسلمانوں کو اگر ذلت وادبار کی کھائی سے نکلنا ہے اور شریعت کے احکام کے مطابق اس ملک میں باعزت زندگی گزارنا ہے تو ہمیں مذکورہ بالا کاموں کو ذمہ داری اور دلچسپی سے انجام دینا ہوگا، گھروں اور محلوں کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنا ہوگا، اور غفلت وجہالت کی اس زندگی سے اپنے کو نکالنا ہوگا، جس کی وجہ سے اسلام دشمن طاقتوں کو شریعت میں مداخلت کرنے اور مسلمانوں کو ذلیل وبےعزت کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

☆☆☆☆

بابری مسجد کی قانونی شہادت

بابری مسجد کی عمارت کو ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء میں ہندو انتہا پسندوں نے شہید کردیا، پوری دنیا نے کھلی آنکھوں یہ نظارہ دیکھا کہ بابری مسجد کی پختہ اور مضبوط عمارت جو بابر بادشاہ کے حکم سے اس کے ایک گورنر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں تعمیر کی تھی، اسے ہندو دہشت گردوں نے صوبائی اور مرکزی حکومت کی شہ پر شہید کردیا، اور اس مضبوط مسجد کو ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا، جب کہ صوبائی حکومت جو بھارتیہ جنتا پارٹی کی تھی، اس کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے سپریم کورٹ میں حلف نامہ داخل کیا تھا، اور سپریم کورٹ کو یقین دلایا تھا کہ اس خاص تاریخ میں جمع ہونے والا مجمع بابری مسجد کی عمارت سے کوئی چھیڑ خانی نہیں کرے گا، اور اپنی مذہبی تقریب انجام دے کر اجودھیا سے چلا جائے گا، لیکن پوری دنیا ٹی وی چینلز کے ذریعہ یہ منظر دیکھتی رہی کہ ہندوستان جیسی عظیم جمہوریت میں قانون کی دھجیاں بکھیر کر دن کی روشنی میں ہندو دہشت گرد بابری مسجد کو منہدم کر رہے ہیں، بلکہ خوشی میں مست ہو کر رقص کر رہے ہیں، اور ایک دوسرے کو مٹھائیاں کھلا رہے ہیں، اور صوبائی اور مرکزی فورسیز اس گھناؤنے تماشہ کو دیکھ رہی ہیں، اور اسے روکنے کے لئے کوئی کاروائی نہیں کر رہی ہیں۔

اس لاقانونیت اور بربریت پر پوری دنیا افسوس کر رہی تھی، اور ہندوستان میں قانون اور انصاف کی دھجیاں بکھیرے جانے پر حیران تھی، پوری دنیا میں اس واقعہ کی مذمت کی گئی، اور دن دہاڑے بابری مسجد کے انہدام کو جمہوریت اور انصاف کا قتل قرار دیا گیا، ہندوستان پوری دنیا میں شرمسار ہوا، اور اس کی اخلاقی ساکھ گرتی چلی گئی۔

۶ ؍دسمبر ۱۹۹۲ء کا انہدام بابری مسجد کا سانحہ مسلمانان ہند کے لئے بڑا روح فرسا اور جانگسل تھا، ہندو دہشت گردوں نے شاید یہ سوچا تھا کہ ہندوستانی مسلمان اس حادثہ کی تاب نہ لاکر مایوسی اور بزدلی کا شکار ہوجائیں گے، اور مسجد کے قانونی دفاع کی ہمت چھوڑ دیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہندوستانی مسلمانوں کو صبر اور حوصلہ دیا، انہوں نے ہمت نہیں ہاری، بلکہ بابری مسجد کے دستوری اور قانونی دفاع کا فیصلہ کیا، اور اپنے قائدین کی رہنمائی میں اس کاز کے لئے سرگرم عمل ہوگئے۔

الٰہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں بابری مسجد کا یہ کیس چلتا رہا، سالہا سال تک عدالتی کارروائیوں کے بعد ۲۰۱۰ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے اس مقدمہ میں اپنا فیصلہ سنایا، بابری مسجد کی ملکیت کا فیصلہ کرنے کے بجائے عدالت نے زمین کے متنازعہ علاقے کو برابر کے تین حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ سنی وقف بورڈ کو، ایک حصہ نرموہی اکھاڑہ کو، اور ایک حصہ رام للا براجمان کو دینے کا فیصلہ کیا، بابری مسجد کی جگہ رام للا براجمان کو دی گئی، اس فیصلہ سے کوئی بھی فریق مطمئن نہیں ہوا، اور سب نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کردی، اور یہ اپیلیں سپریم کورٹ نے قبول کیں، اور اپیلوں پر کئی سال گذرنے کے بعد اگست ۲۰۱۹ء میں سپریم کورٹ نے ان کی سماعت شروع کی، چھٹی کے ایام کے علاوہ کورٹ مسلسل اس کیس کی سماعت کرتی رہی، پانچ رکنی آئینی بنچ نے چیف جسٹس رنجن گگوئی کی صدارت میں چالیس دن تک اس کیس کی بھرپور سماعت کی، ہندو مسلمان دونوں فریقوں کو اپنے دلائل پیش کرنے اور ایک دوسرے کے دلائل پر جرح کرنے کا پورا موقع دیا۔

مقدمہ کی باقاعدہ سماعت سے پہلے سپریم کورٹ کی آئینی بنچ نے سہ نفری میڈیشن کمیٹی کی تشکیل دی، اور اس کمیٹی کے ذمہ یہ کام سپرد کیا کہ مقدمہ کے تمام فریقوں سے بات کرکے مصالحت کا کوئی متفقہ فارمولہ تیار کرے، اور اسے تمام فریقوں کی منظوری کے ساتھ سپریم کورٹ میں پیش کرے، اس کمیٹی نے پوری محنت سے اپنا کام کیا، لیکن اسے کامیابی

حاصل نہیں ہوسکی، اور کوئی متفقہ مصالحتی فارمولہ طے نہیں ہوسکا، اس کے بعد کورٹ نے اس تاریخی مقدمہ کی سماعت شروع کی، اور چالیس دنوں میں سماعت مکمل ہوئی۔

۱۷ ؍نومبر کو چیف جسٹس گگوئی ریٹائر ہونے والے تھے، اور ۱۷ ؍اکتوبر کو اس کیس کی سماعت مکمل ہوئی تھی، انہیں ریٹائرمنٹ سے پہلے اس پیچیدہ اور طویل ترین مقدمہ کا فیصلہ سنانا تھا، توقع کی جارہی تھی کہ شاید وہ اپنے ریٹائرمنٹ سے ایک دو روز پہلے اس کا فیصلہ سناسکیں، لیکن اچانک معلوم ہوا کہ ۹ ؍نومبر کو ساڑھے دس بجے دن سے بابری مسجد کیس کا فیصلہ سنایا جائے گا، چنانچہ ۹ ؍نومبر کو یہ فیصلہ سنادیا گیا، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ سپریم کورٹ کی آئینی بنچ کو سماعت مکمل ہونے کے بعد کل بیس، اکیس دن کا وقت فیصلہ لکھنے کے لئے مل سکا، یہ فیصلہ ایک ہزار پینتالیس ۱۰۴۵ صفحات پر مشتمل ہے، اس مقدمہ کی دستاویزات بیس ہزار صفحات سے متجاوز ہوں گی، اتنی طویل دستاویزات، گواہیوں اور جرحوں کو پڑھ کر بیس دن کی مدت میں ایک ہزار سے زائد صفحات کا فیصلہ ایک عدالتی کرشمہ (چمتکار) ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کا مکمل جائزہ تو پورا فیصلہ پڑھنے کے بعد ماہرین قانون، مؤرخین اور قانونی تجزیہ نگار ہی پیش کرسکتے ہیں، لیکن فیصلہ کی جو جھلکیاں اور اہم پوائنٹس سامنے آچکے ہیں، وہ بڑے حیران کن ہیں، اور افسوسناک ہیں، جو ہماری عدالت عالیہ کے معیار عدل پر سوالیہ نشان کھڑے کرتے ہیں۔

اس فیصلہ کا سب سے حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ عدالت عالیہ اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ ۱۹۴۹ء میں مسجد کے اندر رام للا کی جو مورتی رکھی گئی، یہ مجرمانہ عمل تھا، اسی طرح ۶ ؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو مسجد کی عمارت کو منہدم کرنے کا جو حادثہ پیش آیا وہ بھی انتہائی سنگین جرم ہے، عدالت عالیہ اس بات کو بھی مانتی ہے کہ ہندو فریق اس بات کا کوئی ثبوت نہیں پیش کرسکا کہ بابری مسجد کی تعمیر کسی مندر کو منہدم کرکے کی گئی ہے، ان سب باتوں کو ماننے کے باوجود عدالت عالیہ کا یہ کہنا کہ مسلمان مسجد کی جگہ پر اپنا حق ملکیت ثابت نہیں کرسکے، حقائق اور

سچائیوں کو منہ چڑھانا ہے، یہ ایسے ہی ہے کہ سورج اپنی پوری حرارت اور روشنی کے ساتھ چمک رہا ہو اور اس کے وجود کا انکار کر دیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مقدمہ میں سارے ثبوت وشواہد مسلمانوں کے پاس ہیں، اس کیس میں ایسی متعدد گواہیاں گذر چکی ہیں کہ جن لوگوں نے اس مسجد میں نمازیں ادا کیں، انھوں نے عدالت میں گواہیاں دیں، آثار قدیمہ اور تاریخی کتابوں کے بے شمار حوالے مسلمانوں کی طرف سے پیش ہو چکے ہیں، ان سب ثبوتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے رام للا کی ملکیت اس پوری زمین پر تسلیم کر لینا، جب کہ ہندوؤں کے ایک طبقہ کی آستھا کے علاوہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کھلی ہوئی بے انصافی ہے۔

عدالت عالیہ بار بار اس بات کو دہراتی رہی کہ فیصلہ آستھا (مذہبی عقیدہ ونظریہ) کی بنیاد پر نہیں ہوگا، بلکہ ٹائٹل سوٹ کی بنیاد پر ہوگا، اس فیصلہ میں بھی سپریم کورٹ کی آئینی بنچ نے اس پوائنٹ کا اعادہ کیا ہے، لیکن اگر ایمانداری کے ساتھ دیکھا جائے تو رام للا کے حق میں اس فیصلہ کی بنیاد آستھا کے سوا کچھ اور نہیں ہے، اس مقام پر جو کھدائی ہوئی اور زیر زمین جو باقیات نکلے وہ بھی اس بات کو ثابت نہیں کرتے کہ وہاں رام مندر تھا، اور رام جی کی وہاں پیدائش ہوئی، وہ باقیات بھی بارہویں صدی عیسوی کے بتائے جارہے ہیں، جب کہ وہاں مسجد کی تعمیر سولہویں صدی میں ہوئی ہے، اس لئے ان باقیات کے سہارے ہندو فریق کی ملکیت کو ثابت قرار دینا ہرگز منصفانہ فیصلہ نہیں ہے، اس سے بڑی ناانصافی کیا ہوگی کہ جس فریق کے پاس پختہ شواہد وثبوت اور گواہیاں ہیں اسے محروم کر کے اس فریق کے حق میں فیصلہ کیا جائے جس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ آستھا ہی آستھا ہے، اور پھر یہ بھی کہا جائے ہ ہم آستھا کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ۹/نومبر ۲۰۱۹ء کو بابری مسجد سپریم کورٹ کے ذریعہ انصاف کے نام پر قانونی طور پر شہید کر دی گئی، ہندوستان کی امت مسلمہ ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں سرخرو ہوگی کہ اس نے مسجد کے تحفظ ودفاع کی بھرپور کوشش کی، ملک کی دستور کے دائرہ

میں رہ کر بابری مسجد کے دفاع کے لئے جو قانونی لڑائی لڑی جاسکتی تھی اس میں مسلمانوں نے خاص طور سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، جمعیت علماء ہند وغیرہ نے کوئی کوتاہی نہیں کی، ماہر ترین وکلاء کی خدمات حاصل کر کے پوری استقامت اور حوصلہ کے ساتھ بابری مسجد کا کیس لڑا گیا، مسلمانان ہند نے مسجد کے معاملہ میں ہر طرح کے دباؤ کا مقابلہ کیا، اور کوئی سودا بازی نہیں کی، موجودہ حالات میں ان کے لئے جو کچھ کرنا ممکن تھا انھوں نے کیا، عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کا فیصلہ آنے کے بعد بھی بابری مسجد کی جگہ شریعت کی نظر میں قیامت تک مسجد ہے، اس جگہ کی مسجدیت نہ تو وہاں نماز بند ہونے سے ختم ہوئی، نہ مسجد کی عمارت منہدم ہونے سے ختم ہوئی، نہ عدالت عالیہ کے حالیہ فیصلہ سے ختم ہوئی، اور نہ ہی اس جگہ رام مندر تعمیر ہونے سے اس کی مسجدیت ختم ہوگی، مسلمانوں کے موجودہ اور آئندہ نسلیں یاد رکھیں گی کہ اجودھیا میں ''بابری مسجد'' کے نام سے ایک مسجد تھی، جو سینکڑوں سال تک بطور مسجد استعمال ہوتی رہی، وہاں نمازِ جمعہ اور پنجگانہ نمازیں پابندی سے ادا کی جاتی رہیں، اس زمیں کا چپہ چپہ سجدوں سے معمور رہا، ذکر وتلاوت کی آوازیں وہاں گونجتی رہیں۔

ملک کی آزادی کے بعد ہندو شر پسندوں نے رات کی تاریکی میں اس میں مورتیاں رکھ کر نماز کی ادائیگی میں خلل ڈالا، ہندو مسلم جھگڑے کے نام پر مسجد پر تالا ڈال دیا گیا، چند سال بعد مقامی عدالت کے فیصلہ سے مورتی پوجا کے لئے مسجد کھول دی گئی، ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کو ہندو غنڈوں اور دہشت گردوں نے مسجد کی عمارت شہید کر دی، اور ۹/نومبر ۲۰۱۹ء کو سپریم کورٹ نے انصاف کے تمام تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے فیصلہ کے ذریعہ مسجد کو قانونی طور پر شہید کر دیا۔

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ سے مسلمانوں کا رنجیدہ اور غمزدہ ہونا ایک فطری بات ہے، لیکن مسلمان اس شکست سے مایوسی اور بددلی کا شکار نہ ہوں، ہمت نہ ہاریں، اپنی مسجدوں کو اچھی طرح آباد کریں، نئی مسجدیں قائم کریں، اور اللہ تعالیٰ سے اپنا رشتہ مضبوط کریں، گناہوں کو ترک کر دیں، اسلامی زندگی اختیار کریں، برادران وطن تک توحید کے

پیغام پہونچائیں، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں، اور جو نفرت پھیلائی جارہی ہے اسے ختم کرنے کی کوشش کریں، قرآن کریم جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہدایت ہے اس سے اپنا تعلق مضبوط کریں، قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام کریں، قرآن کو سمجھنے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کریں، ان شاء اللہ تاریکیاں چھٹیں گی، حالات بہتر ہوں گے، اور توحید کے نور سے پورا عالم منور ہوگا۔

☆☆☆☆

قاضی ایکٹ۔ضرورت ومقاصد

از: مولوی محمد احمد کاظمی مرحوم

[مولوی محمد احمد کاظمی مرحوم کا نام اسلامیان ہند کی تاریخ میں برابر یاد رکھا جائے گا، وہ برطانوی حکومت ہند میں قانون ساز اسمبلی کے بااثر ممبر تھے، مسلم پرسنل لا کا تحفظ اور قانون ساز اسمبلی کے ذریعہ اس کے نفاذ کی کوشش ان کا خاص موضوع تھا، اکابر علماء سے ان کا گہرا ربط تھا، ۱۹۳۹ء میں منظور ہونے والا ''قانون انفساخ نکاح مسلمین'' کا مسودہ انہوں ہی نے قانون ساز اسمبلی میں پیش کیا تھا، اس مسودہ قانون کی دفعہ ۶ مسلم قاضی سے متعلق تھی جو منظور نہ ہوسکی۔

اس کے بعد انہوں نے قانون ساز اسمبلی میں قاضی ایکٹ کے نام سے ایک مستقل قانون پیش کیا تھا، ''قاضی ایکٹ۔ضرورت ومقاصد'' کے عنوان سے ان کی تحریر ''نقیب'' پھلواری شریف پٹنہ اور ''مدینہ'' اخبار بجنور میں شائع ہوئی تھی، اس مضمون میں چونکہ ہندوستان میں نظام قضاء کے قیام کی جدوجہد کے سلسلہ میں بعض اہم تاریخی معلومات آ گئی ہیں، اس لئے اسے شامل اشاعت کیا جاتا ہے]

(عتیق احمد بستوی)

قاضی ایکٹ۔ضرورت ومقاصد

از: محمد احمد کاظمی مرحوم

مسوّدہ انفساخِ نکاحِ مسلم میں ابتداءً راقم الحروف نے دفعہ ۶ اس مضمون کی رکھی تھی کہ مقدماتِ انفساخ نکاح کی سماعت مسلم حاکم کرے گا، اور اس کے فیصلہ کی سماعت ایک مسلم جج ہائی کورٹ کرے گا، دفعہ مذکورہ کی گورنمنٹ نے نہایت سختی سے مخالفت کی تھی، اس کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ موجودہ عدالتوں میں مذہبی بنا پر تفریق کرنے کے لئے وہ اس لئے تیار نہیں ہیں کہ اس اصول کو تسلیم کرنے سے ان کا تمام عدالتی نظام درہم برہم ہوجائے گا۔

اس سلسلہ میں راقم الحروف نے اپنی تقریر میں اس امر کی وضاحت کردی تھی کہ دراصل مسلم حاکم رکھنے سے بھی مسلمانوں کی اصل شرعی ضرورت پوری نہیں ہوتی، اس مسودہ میں مسلم حاکم کی شرط محض اس غرض سے رکھی گئی تھی کہ مسلمانوں کی شرعی ضرورت کم از کم برائے نام پوری ہوجائے اور گورنمنٹ پر کسی مزید خرچہ کا بار نہ پڑے، لیکن مسلمانوں کی اصل ضرورت تو محض قاضیوں کے تقرر سے ہی پوری ہوسکتی ہے، اور اس کے لئے میں جداگانہ بل بعد میں پیش کروں گا، اور واقعہ یہ ہے کہ شرعاً جو شرائط قاضی کے تقرر کے لئے ضروری ہیں، وہ موجودہ زمانہ کے حکام کے تقرر پر منطبق نہیں ہوتیں، مثلاً قاضی کے لئے ضروری ہے کہ وہ علاوہ علوم دینی کے ماہر ہونے کے نیک چلن بھی ہو، اور نجی معاملات میں بھی اگر وہ خیانت یا بدچلنی کا مرتکب ہو تو وہ اس عہدے کے قابل نہیں رہتا، لیکن نیک چلنی کی شرط موجودہ حکام

کے لئے ضروری نہیں ہے، محض پبلک فرائض کی انجام دہی اس کے لئے کافی ہے، مثلاً اگر کوئی حاکم شراب پیتا ہو تو اس کا یہ فعل اس کی علیحدگی کے لئے کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، برعکس اس کے اگر قاضی ایسے فعل کا مرتکب ہو تو وہ عہدۂ قضاء کے فرائض کی انجام دہی کے لئے مقرر نہیں کیا جاسکتا، یہ اسلامی شرع ہی ہے کہ جس نے عدل کرنے کی قابلیت کو تبحر علمی کے ساتھ نیک چلنی پر مشروط کیا ہے، اس اصول کی خوبی ایسی واضح ہے کہ اس کے متعلق کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں، غرضیکہ مسلمانوں کی اصل ضرورت نہ موجودہ حکام سے پوری ہوسکتی ہے اور نہ گورنمنٹ ہی اس کے لئے تیار ہے، اس وجہ سے اس کے لئے جداگانہ بل مرتب کیا گیا ہے۔

موجودہ حکومت سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ جداگانہ محکمۂ قضاء قائم کرکے اس کے مصارف کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو، یا اس سلسلے میں مسلمانوں سے کوئی جداگانہ ٹیکس وصول کرکے ایسا محکمہ قائم کرے، اس لئے کہ کسی ایسے ٹیکس کی نوعیت اور اس کے طریقِ وصول کا تعین کرنا مشکل ہے، اور اس مسودہ کے ''وجوہ ومقاصد'' پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا کہ پہلے زمانہ میں بھی قاضیوں کے اخراجات کی کفالت زیادہ تر نکاح پڑھانے کی فیس سے ہوتی تھی، اس لئے موجودہ مسودہ میں بھی محض فیس پر اکتفا کیا گیا ہے، اس مسودہ کی رو سے قاضیوں کے سپرد دو کام کئے گئے ہیں، ایک نکاح پڑھانا اور اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنا اور دوسرے طلاق وخلع وغیرہ کے مقدمات فیصل کرنا، یہ ظاہر ہے کہ نکاح پڑھانے کے لئے قاضیوں کی ضرورت نہیں، اسی طرح مقدمات فیصل کرنے والے قاضیوں کے لئے جس علمیت وقابلیت کی ضرورت ہے اس کی نکاح پڑھانے والے قاضیوں کے لئے ضرورت نہیں، اس وجہ سے مقدمات طے کرنے والے قاضیوں کے لئے مستند عربی مدارس کی سند علمی کا حصول ضروری رکھا گیا ہے، اور اس قانون کے آخر میں ان مدارس کی تفصیل ہوگی جن کی سندات اس کے لئے ضروری قرار دی جائیں گی۔

علاوہ ازیں قاضی کے ساتھ ایک عالم دین اور ایک وکیل کو بھی فیصلۂ مقدمات کرنے کے لئے قاضی کا شریک رکھا گیا ہے، تاکہ فیصلہ کی صحت پر پبلک کا پورا اعتماد ہوجائے۔

مسودہ بل جو ہم رشتہ درج کیا جاتا ہے وہ لفظاً لفظاً اس مسودہ کا ترجمہ نہیں ہے، جس کا نوٹس دیا گیا ہے، بلکہ اس کو عام فہم بنانے کے لئے تمام اصول بل کی دفعات کی شکل میں رکھ دئے گئے ہیں، اگرچہ بل میں دفعات کے نمبر قریب قریب یہی ہیں، اظہار رائے عامہ کے بعد اصل بل میں ضروری ترمیم کی جاسکتی ہے، بل کا نوٹس ۱۳؍جون ۳۹ء کو دے دیا گیا ہے، اور امید ہے کہ ستمبر کے اسمبلی کے اجلاس میں اس کے پیش کرنے کی نوبت آجائے گی۔

شرعِ اسلامی کی رو سے بعض مذہبی ونیم مذہبی معاملات کے تصفیہ کے لئے بادشاہِ وقت کے باضابطہ مقرر کردہ قاضی کے حکم کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً انفساخِ نکاح کی ڈگری قاضی ہی دے سکتا ہے، اس کے علاوہ بعض مذہبی ارکان کی ادائیگی کے لئے بھی قاضی کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی امامت اور نکاحوں کے پڑھانے کے لئے قاضیوں کی ضرورت ہوتی ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے آباد ہوجانے کے بعد سے بادشاہِ وقت کی جانب سے قاضی شہروں، قصبوں اور مختلف پرگنوں میں شرعِ اسلامی کے مطابق فرائض کی انجام دہی کے لئے مقرر کئے جاتے تھے، سلطنت انگریزی نے بھی ابتدائی دور میں قاضیوں کے تقررات کو تسلیم کیا، اس سلسلہ میں ریگولیشن نمبر ۳۹-۹۳-۱۷ء میں سب سے پہلا قانون بنایا گیا، اس قانون کا مقصد عہدۂ قاضی اور قاضی القضاۃ کو تسلیم کرنا اور ان کے تقررات کا انتظام کرنا تھا، اس قانون کی دفعہ ابتدائی حسن ذیل ہے:

''پٹنہ، ڈھاکہ، مرشد آباد اور بڑے بڑے قصبوں اور پرگنوں میں قاضی اس غرض سے مقرر کیے جاتے ہیں کہ دستاویزات انتقال اور دوسرے قانونی دستاویز کو مرتب کریں، اور تصدیق کریں، نکاح پڑھائیں، اور دوسرے مذہبی رسوم کی ادائیگی مطابق شرع اسلامی کریں، جیسا کہ وہ اب تک برٹش گورنمنٹ کے تحت کرتے رہے ہیں، نیز حسب ریگولیشن نمبر ۱۷ و ۲۲، ۹۳-۱۷ء کے ان کے سپرد یہ کام بھی ہے کہ وہ جائداد مقروضہ کے نیلام کی..... نگرانی کریں، اور خیراتی اور دوسری قسم کی پنشنیں اور الاؤنس لوگوں میں تقسیم کریں، فرائض مذکورہ بالا کی نوعیت کے اعتبار سے ضروری ہے کہ ان عہدوں پر ایسے لوگ مقرر کیے جائیں جو اچھے

چال چلن کے ہوں اور قانون کی مناسب واقفیت رکھتے ہوں، اور ان فرائض کو محنت و ایمان داری سے کرنے کے لئے ان کی ہمت افزائی کے واسطے ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے عہدوں سے اس وقت تک نہ ہٹائے جائیں جب تک گورنر جنرل کو یہ اطمینان نہ ہوجائے کہ وہ ناقابل ہیں، یا کسی بدچلنی کے مرتکب ہوئے ہیں، اس لئے حسب ذیل قوانین نافذ کئے جاتے ہیں۔''

ایسٹ انڈیا کمپنی کی سلطنت کا رقبہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ اسی نوعیت کے ریگولیشن اور قوانین دوسرے صوبوں میں بھی نافذ کئے گئے ہیں لیکن اس زمانہ میں قاضیوں کے علاوہ ہندو اور مسلمان افسران قانونی عدالتوں میں اس غرض سے مقرر کیے جاتے تھے کہ وہ دھرم شاستر اور شرعِ اسلامی کے مقدمات کے تصفیہ میں ججوں کی امداد کریں، اس زمانہ میں جو جج مقرر کئے جاتے تھے ان کو شرعِ اسلامی اور دھرم شاستر سے کوئی واقفیت نہ ہوتی تھی، اس کا سبب یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقصد یہ تھا کہ وہ رفتہ رفتہ عدالتی کام ہندوستانیوں کے ہاتھ سے نکال کر انگریز ججوں کے سپرد کردے، اور ان ججوں کی امداد کے لئے یہ افسر مقرر کیے جاتے تھے، اس وجہ سے اس محکمہ کی حیثیت دوامی نہ تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ نے یہ سمجھا کہ ہندو اور مسلم قانونی افسران کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی، اس لئے کہ وہ رفتہ رفتہ انگریز ججوں کو دھرم شاستر اور شرعِ اسلامی کافی طور پر سکھلا چکے تھے، اور انگریزی میں ان قوانین کے متعلق کتابیں لکھی جاچکی تھیں، اور ان شعبہ جات کے متعلق قانونی نظائر کی بھی اتنی تعداد ہوچکی تھی کہ وہ آئندہ کے لئے عدالتوں کی رہنمائی کے واسطے کافی تھیں، چنانچہ اب ان کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی تھی، اور اس لئے ان کو ایکٹ نمبر ۱۱ کی رو سے علیحدہ کردیا گیا، لیکن ہندو اور مسلم افسران کی علیحدگی کے ساتھ ساتھ وہ ریگولیشن اور قوانین بھی منسوخ کردئے گئے جو قاضیوں کے متعلق تھے، حالانکہ محکمہ قضاء کی وجہ سے سلطنت پر کوئی زیادہ بار نہ تھا، اور نہ قاضیوں کی حیثیت و ضرورت ہندو مسلم قانونی افسران کی طرح پر عارضی تھی، آنریری مسٹر اے اے رابرٹ نے مسودۂ قانون ایکٹ نمبر ۱۱-۱۹۶۴ء کے پیش کرنے کی اجازت کے سلسلہ میں جو

تقریر کی اس میں اولاً ہندو مسلم قانونی افسران کی علیحدگی کے وجوہات بیان کیے اور اس کے بعد قاضی القضاۃ اور قاضی کے متعلق حسب ذیل الفاظ کہے۔

قاضی القضاۃ

''اس مسودۂ قانون کا یہ بھی مقصد ہے کہ گورنمنٹ اپنا تعلق قاضی القضاۃ یعنی صوبہ کے بڑے قاضی اور شہر و قصبہ اور پرگنہ کے قاضیوں کے عہدوں سے قطع کرلے، ان عہدوں کا نہ ہم پر مدار تھا نہ وہ برطانوی سلطنت کے کسی قانون کے پیداوار تھے، یہ سلطنت اسلامی اور مسلمانوں کی سوسائٹی کے قائم کردہ تھے، جب ہماری سلطنت شروع ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ ہر شہر اور قصبہ و پرگنہ میں قاضی موجود ہے، اور ہمارے شروع زمانہ کے قانون بنانے والوں نے صرف یہ کیا کہ ان قاضیوں کے فرائض کی تفصیل بیان کردی اور اس بات کا انتظام کردیا کہ ان عہدوں پر اچھے چال چلن کے اور تعلیم کے لحاظ سے قابل لوگ مقرر کیے جائیں۔''

اس کے بعد مسٹر رابرٹس نے یہ بتلایا کہ رفتہ رفتہ کس طرح پر دستاویزات انتقال اور دیگر قانونی دستاویزات کی تیاری اور ان کی تصدیق کا کام اور نوٹری پبلک (Notary Public) کا کام باضابطہ محکمہ جات قائم ہوجانے کی وجہ سے قاضیوں کے ہاتھ سے نکل گیا، اگرچہ اس زمانہ میں بھی قاضی دستاویزات کی تصدیق کرتے تھے، اور عدالت ان کو مانتی بھی تھی، لیکن یہ کام ان کے ہاتھ سے بڑی حد تک نکل چکا تھا، مسٹر رابرٹس نے یہ بھی دکھلایا ہے کہ جائدادوں کے مال کی کچی قرقی اور نیلام کرنے کا کام بھی رفتہ رفتہ قاضیوں کے ہاتھ سے نکل گیا، خیراتی اور دوسری قسم کی پنشنوں کا کام بھی ان سے لیا جاچکا تھا۔

قاضیوں کی تنخواہ کی وجہ سے سلطنت پر جو بار تھا اس کے متعلق مسٹر رابرٹس نے حسب ذیل الفاظ کہے: ''ممکن ہے کہ قاضیوں کو کچھ چھوٹی چھوٹی تنخواہیں سلطنت سے ملتی ہوں، اور مدراس اور بمبئی میں کچھ اوقاف بھی ایسے تھے جس سے ان کو گذارہ ملتا تھا، لیکن زیادہ تر قاضیوں کی ان خدمات کا معاوضہ جو وہ سلطنت کی کرتے تھے عید کے تہوار کے موقع پر

خلعت ونذرانہ یعنی روپیہ وشان کی شکل میں دیا جاتا تھا، پبلک کی خدمات اور نکاحوں وغیرہ کے پڑھانے کا معاوضہ وہی لوگ ادا کرتے تھے جوان سے کام لیتے تھے۔''

آخر میں مسٹر رابرٹس نے مجوزہ قانون کے پاس ہونے کا اثر حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا:

''خواہ وہ قاضی جن کو گورنمنٹ اب تک مقرر کرتی رہی ہے یا وہ قاضی جنہوں نے اپنی قوم میں اپنی قوت سے اپنے آپ کو قاضی تسلیم کرالیا ہے، وہ اپنے تمام ایسے فرائض کی انجام دہی میں جو شرعِ اسلامی کے مطابق تھے، اور جن کو وہ اب تک انجام دیتے رہے تھے، آئندہ انجام دینے کے لئے وہ بالکل آزاد ہوں گے، اس مسودۂ قانون کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان قوانین کو منسوخ کردیا جائے جو قاضیوں کے تقرر کے متعلق تھے، اور اس بات کا اعلان کردیا جائے کہ آئندہ سے گورنمنٹ ان عہدوں پر کسی کا تقرر نہ کرے گی۔''

جس وقت کہ یہ بل کونسل میں پیش کیا گیا تو کونسل کے واحد مسلمان ممبر نواب یوسف علی خاں والی رامپور جو شاید اسی غرض کے لئے کونسل کے ممبر کئے گئے تھے اس لئے کہ انہوں نے اسی دن حلف لیا تھا، انہوں نے قاضیوں کی علیحدگی کے بارے میں جو دفعات تھیں اس کی مخالفت کی، لیکن بل پاس ہوگیا، اس بل کے پاس ہونے سے جو نتائج پیدا ہوئے وہ ان توقعات کے بالکل خلاف تھے جن کی طرف محرک نے بل پیش کرتے وقت اشارہ کیا تھا، محرک کو یہ توقع تھی کہ گورنمنٹ کے قاضیوں کے تقرر سے دست کشی کرلینے کے باوجود قاضی مسلمانوں میں بدستور کام کرتے رہیں گے، لیکن ایسا نہ ہوا، اس کی وجہ دو تھیں: اولاً یہ کہ شرعِ اسلامی کی رو سے اس امر کی ضرورت ہے کہ قاضی بادشاہِ وقت کا مقرر کردہ ہو، دوسرے یہ کہ ۱۸۶۴ء کے قانون کے پاس ہونے کے بعد بمبئی اور مدراس کے ہائی کورٹوں نے بھی یہ فیصلے کئے کہ قاضی وہی ہوسکتا ہے جو سلطنت کا مقرر کردہ ہو۔

غرض کہ باضابطہ مقرر کردہ قاضی کے نہ رہنے کی وجہ سے مسلم قوم کو سخت مشکلات پیش آئیں، جس کی بابت گورنمنٹ کو بار بار توجہ دلائی گئی، بالآخر سرسید احمد خاں مرحوم نے

۱۸۸۰ء میں لیجسلیٹیو کونسل میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس کا نام ''قاضی ایکٹ تھا'' جو ایکٹ نمبر ۱۲-۱۸۸۰ء کی حیثیت سے پاس ہوا، اس قانون کی وجہ سے لوکل گورنمنٹ کو یہ اختیار دیا گیا کہ کسی مقام کے مسلمانوں کی خواہش پر اس مقام یا رقبہ کے لئے قاضی کا تقرر کردیں، لیکن اس قاضی کو کسی قسم کے اختیارات نہیں دئے گئے، اور گورنمنٹ کے تقرر سے اگر قاضی کی کوئی حیثیت بھی قائم ہوئی تھی تو اس کو قانون کی دفعہ ۴ نے بالکل ہی ختم کردیا، دفعہ ۴ کا مضمون یہ ہے:

''اس قانون کے کسی لفظ سے یا اس قانون کی رو سے کسی قاضی کے تقرر ہوجانے کی وجہ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ:

(الف) کسی قسم کے عدالتی یا انتظامی اختیارات کسی قاضی کو ہوں جو بروئے قانون ہذا مقرر کیا گیا ہے۔

(ب) قاضی یا نائب قاضی کی موجودگی کسی نکاح کے پڑھانے یا کسی دوسری رسم کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے۔

(ج) کوئی شخص قاضی کے فرائض کی انجام دہی کرنے سے ممنوع نہیں کیا گیا۔

بالفاظ دیگر قاضی کو باوجود مقرر کیے جانے کے کسی دوسرے شخص پر ترجیح نہ تھی، اور نہ اس کو کوئی اختیارات تھے، ایسے قاضی کے تقرر سے کوئی فائدہ نہ تھا، کسی ایسے قاضی سے جس کے مقابلہ میں ہر وہ شخص جس کا جی چاہے کھڑا ہوکر یہ کام کرسکتا ہو اس سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ شہر یا اپنے پرگنہ کے کل نکاحوں کا مکمل ریکارڈ رکھ سکے گا، ایسا قاضی نکاحوں کی منسوخی کے لئے بھی کچھ کارآمد نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ اس کو عدالتی اختیارات حاصل نہ تھے، اس قانون کا یہ نقص اس قدر صریح تھا کہ جب یہ بل کونسل میں منظوری کے لئے پیش ہوا تو اس زمانہ کے وائسرائے لارڈ پین کو اس عجیب بل کی عجیب خصوصیت کو دیکھ کر تعجب ہوا، اور اس دن کی روئیداد میں لارڈ پین نے جو گفتگو کی اس کے متعلق حسب ذیل اندراج ہیں:

''بل کی دفعہ ۴ کے ضمن الف کا مقصد یہ ہے کہ اس قانون کی رو سے کسی قسم کا عدالتی

یا کوئی دوسرا اختیار قاضی یا نائب قاضی مقرر کردہ کو نہ دیا جائے گا، ان کی رائے میں یہ ایک عجیب بات تھی کہ ایسا قانون بنایا جائے کہ ایسے شخص کو جس کو قانونی طور پر مقرر کیا جاتا ہے، کسی قسم کا اختیار نہ ہوگا۔''

وائسرائے صاحب کا ریمارک نہایت با موقع تھا، اور مستقبل نے ثابت کر دیا کہ میدانِ قانون سازی کا یہ نیا تجربہ بالکل ناکامیاب رہا، اس بل کی تائید میں جس کے متعلق اس وقت یہ خیال تھا کہ مسلم قوم کی مشکلات رفع کرنے میں ایک حد تک مدد دے گا، بمبئی کے آنریبل مسٹر گپسن نے حسب ذیل الفاظ کہے:

''اس بل کے متعلق وہ کہہ سکتے ہیں کہ قاضیوں کے نہ ہونے کی تکلیف بمبئی کی طرف سے بہت ہے، پہلے زمانہ میں جب تک کہ ایکٹ نمبر۱۲-۱۸۶۴ء پاس نہیں ہوا تھا اس زمانہ میں تمام بڑے مقامات اور بمبئی میں گورنمنٹ کے مقرر کردہ قاضی ہوتے تھے، اور وہ چھوٹے تنازعات طے کرنے میں بہت مفید ثابت ہوتے تھے، اگر ایسے تنازعات وہ طے نہ کرتے تو مجسٹریٹیوں اور عدالتوں کے لئے باعث تکلیف ہوتے، انہوں نے یہ کہا کہ ان کی سمجھ میں یہ کبھی نہیں آیا کہ قانون ۱۸۶۴ء کی رو سے ملک کے تمام قاضیوں کو کیوں صاف کر دیا گیا، لیکن اس سے ایک نقصان پہونچا کہ مسلمان قوم ایک قسم کے سردار سے محروم ہوگئی جن سے وہ اپنے چھوٹے خانگی معاملات حل کرا سکتے تھے، انہیں اس کمی کا بہت احساس ہے، بعض دفعہ تو اس کمی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، اور قانون شکنی کرتے ہیں، اس لئے انہوں نے کہا کہ وہ خوش ہیں کہ قاضیوں کی تقرری کا بل پیش کر دیا گیا ہے۔''

لیکن اس قانون میں نقص ایسا تھا کہ اس سے مسلم قوم کو متوقع فائدہ نہ پہنچ سکا اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور آج وہ ایک محض بے اثر قانون ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ ضرورت

اس طرح پر مسلمانوں کی ایک پرانی اور مسلمہ ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ مسودہ قانون پیش کیا جاتا ہے، لیکن اس بل کے حدود بہت مختصر ہیں، اس لئے کہ اس کی رو سے جو اختیارات قاضی کو دئے گئے ہیں وہ ان اختیارات سے بہت ہی کم ہیں جو ان کو شرعِ اسلامی کی رو سے ملتے ہیں، اور یہی نہیں بلکہ یہ اختیارات ان اختیارات سے بھی کم ہیں جو اس زمانۂ ابتدائی میں خود برطانوی گورنمنٹ کے قانون سے ان کو دیئے جاتے تھے، اس قانون کی رو سے خالص طور پر دو ضرورتوں کو پورا کرنا مقصود ہے، ایک یہ کہ نکاحوں کا باقاعدہ اندراج کیا جائے، اور اس کا ریکارڈ قاضی رکھے، دوسرے یہ کہ طلاق، انفساخِ نکاح وغیرہ کے مقدمات کے فیصلہ کے لئے ایک پنچایت مقرر کی جائے، جس کے ممبر قاضی، عالم اور ایک وکیل ہو، چونکہ شرعِ اسلامی اس معاملہ میں بہت سخت ہے، اس وجہ سے جج ضلع اور ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کی صورت یہ رکھی گئی ہے کہ قاضی عدالتہائے مذکورہ سے حسبِ ضرورت استصواب کر کے معاملہ کو فیصل کرے، اس طریقہ سے برطانوی عدالتوں کے ضابطۂ کاروائی میں بڑی تبدیلی نہ ہوگی، شرعِ اسلامی کی ضروریات پوری ہوجائیں گی، اور توقع یہ ہے کہ مسلم قوم کی ایک بڑی ضرورت اس بل سے پوری ہوجائے گی۔

(مدینہ، نمبر۵۲، جلد۲۸، مؤرخہ ۲۱/جولائی ۱۹۳۹ء ص۴ ج۱۰)

☆☆☆☆

دستور ھند کی چند دفعات

(دستور ہند کی یہ دفعات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے شائع کردہ ''بھارت کا آئین''
کے تیسرے اڈیشن ۲۰۰۱ء سے لی گئی ہیں)

دستور ہند کی چند دفعات

اس کتاب کے مختلف مضامین میں دستور ہند کی مختلف دفعات کا حوالہ آیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ دستور ہند کی ایسی دفعات کو بعینہٖ نقل کر دیا جائے تا کہ انہیں سمجھنے میں سہولت ہو۔

بنیادی حقوق کی دفعات

حصہ سوم بنیادی حقوق

دفعہ ۱۳-(۱) وہ سب قوانین جو اس آئین کی تاریخ نفاذ سے عین قبل بھارت کے علاقہ میں نافذ ہوں جہاں تک وہ اس حصہ کے متناقض ہوں تناقض کی حد تک باطل ہوں گے۔

(۲) مملکت کوئی ایسا قانون نہ بنائے گی جو اس حصہ سے عطا کئے ہوئے حقوق کو چھین لے یا ان میں کمی کرے اور کوئی قانون جو اس فقرہ کی خلاف ورزی میں بنایا جائے خلاف ورزی کی حد تک باطل ہوگا۔

دفعہ ۱۴-مملکت کسی شخص کو بھارت کے علاقہ میں قانون کی نظر میں مساوات یا قوانین کے مساویانہ تحفظ سے محروم نہیں کرے گی۔

دفعہ ۱۵-(۱) مملک محض مذہب، نسل، ذات، جنس یا مقام پیدائش یا ان میں سے کسی کی بنا پر کسی شہری کے خلاف امتیاز نہیں برتے گی۔

دفعہ ۱۶-(۱) تمام شہریوں کے لئے مملکت کے تحت کسی عہدہ پر ملازمت یا تقرر سے متعلق مساوی موقع حاصل رہے گا۔

(۲) کوئی شہری محض مذہب، نسل، ذات، جنس، نسب مقام پیدائش، بود و باش یا ان میں سے کسی کی بنا پر مملکت کے تحت کسی ملازمت یا عہدے کے لئے نہ تو نا قابل ہوگا، اور نہ اس کے خلاف امتیاز برتا جائے گا۔

دفعہ ۱۹-(۱) تمام شہریوں کو حق حاصل ہوگا۔

(الف) تقریر اور اظہار کی آزادی کا۔

(ب) امن پسندانہ طریقہ سے اور بغیر ہتھیاروں کے جمع ہونے کا۔

(ج) انجمنیں یا یونین قائم کرنے کا۔

(د) بھارت کے سارے علاقہ میں آزادانہ نقل و حرکت کرنے کا۔

(ہ) بھارت کے علاقہ کے کسی حصہ میں بود و باش کرنے اور بس جانے کا۔

(د) +++++++++

(ز) کسی پیشہ کے اختیار کرنے یا کسی کام دھندے، تجارت یا کاروبار کے چلانے کا۔

دفعہ ۲۵-(۱) تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے بشرطیکہ امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ اور حصہ کی دیگر توضیعات متأثر نہ ہوں۔

(۲) اس دفعہ کا کوئی امر کسی ایسے موجودہ قانون کے نفاذ کو متأثر نہ کرے گا اور نہ وہ ایسے قانون کے بنانے میں مملکت کا مانع ہوگا جو

(الف) کسی معاشی، مالیاتی، سیاسی یا دیگر غیر مذہبی سرگرمی کو جس کا تعلق مذہبی عمل سے ہوسکتا ہو منضبط کرے یا اس پر پابندی لگائے۔

(ب) سماجی بہبودی اور سدھار کے لئے یا ہندوؤں کے عوامی نوعیت کے مذہبی اداروں کو ہندوؤں کے تمام طبقوں اور فرقوں کے لئے کھول دینے کے بارے میں توضیع کرے۔

تشریح-۱-کرپان باندھنا اور اس کو ساتھ رکھنا سکھ مذہب کے عقیدہ میں شامل ہونا

متصور ہوگا۔

تشریح-۲-فقرہ (۲) کے ذیلی فقرہ (ب) میں ہندوؤں کے حوالہ کی یہ تعبیر کی جائے کہ اس میں سکھ جین یا بدھ مذہب کے پیروؤں کا حوالہ شامل ہے، اور ہندو مذہبی اداروں کے حوالے کی حسبہ تعبیر کی جائے گی۔

دفعہ ۲۶-اس شرط کے ساتھ کہ امن عامہ، اخلاق عامہ اور صحت عامہ متأثر نہ ہوں ہر ایک مذہبی فرقے یا اس کے کسی طبقے کو حق ہوگا۔

(الف) مذہبی اور خیراتی اغراض کے لئے ادارے قائم کرنے اور چلانے کا۔

(ب) اپنے مذہبی امور کا انتظام خود کرنے کا۔

(ج) منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کے مالک ہونے اور اس کو حاصل کرنے کا اور

(د) ایسی جائداد کا قانون کے بموجب انتظام کرنے کا۔

دفعہ ۲۹-(۱) بھارت کے علاقہ میں یا اس کے کسی حصہ میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقہ کو جس کی اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت ہو اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا۔

(۲) کسی شہری کو ایسے تعلیمی ادارہ میں جس کو مملکت چلاتی ہو یا جس کو مملکتی فنڈ سے امداد ملتی ہو داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، ذات زبان یا ان میں سے کسی کی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ ۳۰-(۱) تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

(۱-الف) فقرہ (۱) میں محولہ کسی اقلیت کے قائم کردہ اور زیر انتظام قانون بناتے وقت مملکت اس امر کو یقینی بنائے گی کہ ایسی جائداد کے حصول کے لئے ایسے قانون کی رُو سے مقررہ یا اس کے تحت تعین شدہ رقم ایسی ہو جس سے اس ضمن کے تحت ایسا حق، جس کی ضمانت دی گئی ہے، محدود یا ساقط نہ ہو جائے۔

حصہ چہارم مملکت کی حکمت عملی کے ہدایتی اصول

دفعہ ۳۷- اس حصہ میں مندرجہ توضیعات کو کوئی عدالت نافذ نہ کر سکے گی لیکن اس کے باوجود وہ اصول جو اس میں قلمبند کئے گئے ہیں ملک کی حکمرانی کے لئے بنیادی ہیں اور مملکت کا فرض ہوگا کہ قوانین بنانے میں ان اصولوں کا اطلاق کرے۔

دفعہ ۳۸- (۱) مملکت ایسے سماجی نظام کو جس میں قومی زندگی کے سب ادارے سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف سے بہرہ ور ہوں جہاں تک اس سے ہو سکے مکمل طور پر قائم اور محفوظ کر کے لوگوں کی بہبودی کو فروغ دینے میں کوشاں رہے گی۔

(۲) مملکت خصوصی طور پر نہ صرف افراد کے مابین بلکہ مختلف علاقوں کے رہنے والے یا مختلف پیشوں میں کام کرنے والے اشخاص کے مابین آمدنی میں عدم توازن کم کرنے کی کوشش کرے گی نیز حیثیت، سہولتوں اور مواقع میں عدم توازن ختم کرنے کا اقدام کرے گی۔

دفعہ ۳۹- مملکت اپنی حکمت عملی کو خاص طور سے اس امر کے اطمینان کے لئے عمل میں لائے گی کہ.....

(الف) مرد اور عورت سب شہریوں کو مساوی طور پر معقول ذرائع معاش کا حق حاصل ہو۔

(ب) قوم کے مادی وسائل کی ملکیت اور ان پر نگرانی کی اس طرح تقسیم ہو جس سے حتی المقدور عام بھلائی مقصود ہو۔

(ج) معاشی نظام اس طرح نہ چلایا جائے جس سے دولت اور پیداوار کے ذرائع ایک جگہ جمع ہو کر عوام کے لئے مضرت رساں ہوں۔

دفعہ ۴۴- مملکت یہ کوشش کرے گی کی بھارت کے پورے علاقہ میں شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ کی ضمانت ہو۔

☆☆☆☆

مسلم پرسنل لا سے متعلق
پارلیمنٹ سے منظور شدہ
متفرق ایکٹ

[آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے چند سال پہلے ''مسلم پرسنل لا سے متعلق پارلیمنٹ سے منظور شدہ متفرق ایکٹ'' کے نام سے ایک مختصر کتابچہ شائع کیا تھا، اس کتابچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اسلام کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) کے میدان میں کیا کیا قانون سازی ہوئی ہے، ہندوستان میں اسلامی شریعت کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ان متفرق ایکٹ سے واقفیت بہت ضروری ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے شکریہ کے ساتھ یہ پورا کتابچہ اس کتاب میں شامل کیا جاتا ہے۔]

عتیق احمد بستوی

مسلم پرسنل لا سے متعلق پارلیمنٹ سے منظور شدہ متفرق ایکٹ

مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء

تعارف

برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان کے رواجی قوانین کو مسلم پرسنل لا پر کسی حال میں ترجیح نہ دی جائے، اس مسئلہ پر اخبارات اور جلسوں میں بھی شدت سے اظہار خیال کیا گیا، مسلمانوں کے رواجی قوانین کے تحت مسلم خواتین کا مرتبہ محض تحقیر اور بے توقیری کا ہے، مسلم خواتین کی تمام تنظیموں نے ان رواجی قوانین کی مذمت کی ہے کیونکہ یہ ان کے مفادات پر برا اثر ڈالتے ہیں، ان کا مطالبہ ہے کہ مسلم پرسنل لا (شریعت) کا اطلاق ان پر کیا جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ۲۶ ستمبر ۱۹۳۵ء کو قانون ساز اسمبلی میں مسلم پرسنل لا (شریعت) بل (نمبر ۳۹-۱۹۳۵) پیش کیا گیا، یہ بل سلیکٹ کمیٹی کو بھیجا گیا، سلیکٹ کمیٹی کی سفارشات کو شامل کر کے یہ بل دوبارہ قانون ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا۔

وجوہات ومقاصد کا بیان

ایک عرصہ سے برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان کے

رواجی قوانین کو مسلم پرسنل لاء کی جگہ نافذ نہ کیا جائے، اخبارات اور جلسوں میں بھی بار بار اسے دوہرایا گیا، مسلمانوں کی سب سے بڑی مذہبی تنظیم جمعیۃ علماء ہند نے بھی اس کی حمایت کی ہے اور تمام متعلقہ حکام کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ ایسا بل فوری طور پر پیش کیا جائے، رواجی قوانین کو یہ غلط نام دیا گیا ہے کیونکہ ان کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے اور اس میں بکثرت تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور مستقبل میں بھی وہ اعتبار اور قطعیت حاصل نہیں کر سکتے جو کہ ایک قانون کی خصوصیت ہوتی ہے، ان موروثی رواجوں کے تحت مسلم خواتین کا مرتبہ محض بے وقعتی کا ہے، خواتین کی تمام مسلم تنظیموں نے موروثی رواجوں کی مذمت کی ہے جن سے ان کے حقوق پر برا اثر پڑتا ہے، لہذا ان کا مطالبہ ہے کہ مسلم پرسنل لا (شریعت) کا اطلاق ان پر کیا جائے، مسلم پرسنل لا کے نافذ العمل ہونے سے انہیں خود بخود وہ مرتبہ حاصل ہو جائے گا جس کی وہ فطری طور پر مستحق ہیں، علاوہ ازیں اگر موجودہ بل پاس ہو گیا تو اس کا معاشرہ پر مفید اثر ہوگا کیونکہ اس سے عوام کے باہمی حقوق وفرائض میں واقفیت اور قطعیت پیدا ہوگی، مسلم پرسنل لا (شریعت) ایک ایسا ضابطہ ہے جو واقعی شکل میں موجود اور اتنا معروف ہے کہ اس کے وجود میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور نہ اس کا مسودہ مرتب کرنے میں زیادہ دشواری پیش آئے گی، جیسا کی موروثی قوانین کے سلسلہ میں آتی ہے۔

۱۹۳۷ء کا ۲۶ واں ایکٹ

قانون ساز یہ نے مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق بل پاس کر دیا اور ۷/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو اسے منظوری حاصل ہوگئی اور قانون کی کتاب میں اسے بعنوان مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء (۱۹۳۷ کا ۲۶ واں ایکٹ) کے طور پر درج کیا گیا، کیونکہ لفظ Moslem کو اب Muslim لکھا جاتا ہے، لہذا اب یہ انہی حروف تہجی کے مطابق مسلم (Muslim) پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء مانا جائے گا۔

☆☆☆☆

مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء

(۱۹۳۷ء کا ۲۶ واں ایکٹ)

ایکٹ جس کا مقصد مسلم پرسنل لا (شریعت) کا مسلمانوں پر نفاذ کرنا ہے، کیونکہ مسلمانوں پر مسلم پرسنل لا (شریعت) کے نفاذ کے ضوابط مرتب کرنا قرین مصلحت ہے، لہذا انہیں حسب ذیل طور پر قانون کی صورت میں مرتب کیا جاتا ہے۔

۱۔ مختصر عنوان اور دائرہ اثر

۱-اس ایکٹ کو مسلم پرسنل لا (شریعت) اطلاق ایکٹ ۱۹۳۷ء کہا جائے گا۔

۲-اس کا نفاذ پورے ہندوستان پر ہوگا (ماسوائے ریاست جموں وکشمیر)۔

۳۔کسی معاملہ میں (سوائے زرعی اراضی کے معاملات) میں موروثی ضوابط و رواج اس کے برعکس ہونے مثلاً وصیت کردہ حق جانشینی، خواتین کی خصوصی مملوکہ جائداد بشمول وہ جو ورثہ میں پائی ہو، یا کسی اقرار نامہ یا ہدیہ کے طور پر حاصل ہوئی ہو، یا پرسنل لا کے کسی دیگر ضابطے شادی، فسخ نکاح، بشمول طلاق، ایلاء ظہار، خلع اور مبارات، نان ونفقہ، مہر، ولایت، ہدیہ، وقف اور وقف کی جائدادیں اور اوقاف (ماسوائے خیراتی، یا خیراتی اداروں، اور خیراتی ومذہبی اوقاف) ایسے تمام کیسوں میں جن میں فریقین مسلم ہوں ان پر مسلم پرسنل لا (شریعت) کا اطلاق ہوگا۔

۲-بیان حلفی دینے کا اختیار

۱۔وہ شخص جو متعلقہ حاکم کو مندرجہ ذیل امور کی بابت مطمئن کر سکے۔

الف- یہ کہ وہ مسلمان ہے

ب- یہ کہ وہ انڈین کنسریکٹ ایکٹ ۱۸۷۲ء کے تحت کنسٹریکٹ (اقرار نامہ) کا مجاز ہے۔

ج- یہ کہ وہ اس خطہ کا رہنے والا ہے جہاں اس ایکٹ کا نفاذ ہوتا ہے۔

وہ ایک مقررہ فارم پر حاکم مجاز کے روبرو یہ بیان دے سکتا ہے کہ وہ اس ایکٹ کے ضوابط کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، لہذا اس پر اس کے نابالغ بچوں پر اور ان کی آئندہ نسل پر دفعہ (۲) کا اطلاق ہوگا، جیسا کہ ان ضوابط میں وصیت وواراثت وغیرہ سے متعلق امور کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

۲۔ اگر متعلقہ حاکم ذیلی دفعہ (۱) کے تحت بیان کو تسلیم کرنے سے انکار کردے تو وہ شخص اس حاکم کے روبرو اپیل کرسکتا ہے جسے ریاستی حکومت نے عام یا خصوصی حکم کے ذریعہ اس مقصد کے لئے مقرر کیا ہوا گر وہ حاکم مطمئن ہے کہ شخص مذکور کو ایسا بیان دینے کا اختیار ہے تو وہ افسر متعلقہ کو ہدایت کرسکتا ہے کہ وہ اس فارم کو بیان حلفی کے طور پر قبول کرے۔

۴۔ ضوابط بنانے کا اختیار

۱۔ اس ایکٹ کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے ریاستی سرکار ضوابط مرتب کرسکتی ہے۔

۲۔ مذکورہ بالا اختیارات پر اثر انداز ہوئے بغیر ریاستی حکومت مندرجہ ذیل امور سے متعلق ضوابط بنا سکتی ہے۔

(الف) اس اتھارٹی کا تقرر جس کے روبرو ایکٹ کے تحت بیان حلفی کا فارم پیش کیا جائے گا۔

(ب) بیان داخل کرنے کے لئے فیس مقرر کرنا اور ایکٹ کے تحت سرکاری فرائض کی انجام دہی کی غرض سے کسی شخص کی رہائش گاہ پر جانے کی فیس۔

(ج) وقت کا تعین کرنا جب کہ یہ فیس ادا کی جائے گی اور وہ طریقۂ کار جس کے مطابق انہیں عائد کیا جائے گا۔

۳۔ اس دفعہ کی مندرجات کے تحت مرتب کئے گئے ضوابط سرکاری گزٹ میں شائع کئے جائیں گے اور اس کے بعد ان کا نفاذ اسی طرح ہوگا جیسے وہ اس ایکٹ کا حصہ ہو۔

۴۔ اس ایکٹ کے تحت مرتب کردہ ضوابط کو ترتیب کے فوراً بعد ریاستی قانون سازیہ میں پیش کیا جائے گا۔

۵۔ بعض حالات میں عدالت کے ذریعہ فسخ نکاح (خلع ایکٹ ۱۹۳۹ء کے بعد یہ منسوخ ہوگا)۔

۶۔ تنسیخ- مندرجہ ذیل ایکٹوں کی درج ذیل دفعات اور ان کے تحت مرتب کردہ ضوابط کو منسوخ کردیا جائے گا چونکہ وہ اس ایکٹ کی مندرجات سے غیر مربوط ہیں۔

۱۔ بمبئی ضوابط ۱۱۸۲۷ ایکٹ ۱۸۲۷ کی دفعہ ۲۶۔

۲۔ مدارس سول کورٹ ایکٹ ۱۸۷۳ کی دفعہ ۱۶۔

۳۔ اودھ ایکٹ ۱۸۷۲ کی دفعہ ۳۔

۴۔ پنجاب لازا یکٹ ۱۸۷۲ کی دفعہ ۵۔

۵۔ صوبہ جات متحدہ لازا یکٹ ۱۸۷۵ کی دفعہ ۵۔

۶۔ اجمیر لازا یگولیشنز ۱۸۷۷ کی دفعہ ۴۔

☆☆☆☆

فسخ نکاح (خلع) ایکٹ ۱۹۳۹ء

تعارف

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کا نان ونفقہ ادا نہیں کرتا، یا اس سے علیحدگی اختیار کر کے اس کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے، یا اس سے برابر بُرا سلوک کرتا ہے یا اسے بے سہارا چھوڑ دیتا ہے، ایسے اور اسی قسم کے دیگر حالات میں فقہ حنفی میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ عورت عورت فسخ نکاح (خلع) کے لئے عدالت سے ڈگری لے سکے، ایسی کوئی گنجائش نہ ہونے کے سبب برطانوی ہندوستان میں مسلمان خواتین کو ناقابل بیان مصائب کا شکار ہونا پڑتا تھا، حنفی فقہاء نے اس واضح رائے کا اظہار کیا ہے کہ جہاں فقہ حنفی کے اطلاق سے مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں فقہ شافعی، مالکی اور حنبلی کا اطلاق کرنا جائز ہے، لیکن دیکھا یہ گیا کہ عدالتیں فقہ مالکی کا اطلاق کرنے سے ہچکچاتی تھیں، لہذا فسخ نکاح سے متعلق تمام قوانین کو یکجا کرنے کی غرض سے قانون ساز یہ (Legislature) میں فسخ نکاح بل پیش کیا گیا۔

وجوہات ومقاصد کا بیان

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرے، اسے نان ونفقہ ادا نہ کرے، اس سے برا سلوک کرے اور اسے بے سہارا چھوڑ کر اس کی زندگی کو عذاب بنا دے، ایسے اور اسی قسم کے دیگر حالات میں فقہ حنفی کے تحت ایک مسلم عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ عدالت سے فسخ نکاح کی ڈگری لے سکے، ایسی کوئی گنجائش نہ ہونے کے سبب برطانوی ہندوستان میں

ان گنت عورتوں کو ناقابل بیان مصائب کا شکار ہونا پڑتا تھا، حالانکہ حنفی فقہاء نے یہ بات واضح طور پر لکھی ہے کہ مالکی شافعی وحنبلی فقہ پر عمل کرنا جائز ہے، اس اصول پر عمل کرتے ہوئے علماء نے فتوے دئے ہیں کہ ان حالات میں جو اس بل کے حصہ اول کے کلاز (۳) کے تحت درج کئے گئے ہیں (اب ایکٹ کی دفعہ (۳) ملاحظہ کیجئے) اب ایک مسلم عورت عدالت سے فسخ نکاح کی ڈگری لے سکتی ہے، مولانا اشرف علی صاحبؒ نے کتاب الحیلۃ الناجزۃ میں اصول صراحت سے بیان کیے ہیں، انہوں نے فقہ مالکی کی ان دفعات کا مبسوط انداز میں جائزہ لیا ہے جن کا ہندوستان میں واقع صورت حال میں اطلاق کیا جا سکتا ہے، علماء کی بڑی تعداد نے اس کی تائید کی ہے جنہوں نے کتاب پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کی ہے، کیونکہ عدالتیں مسلم خواتین کے مقدمات میں فقہ مالکی پر عمل کرنے میں پس وپیش کرتی رہیں گی لہذا لاتعداد مسلم خواتین کو آلام ومصائب سے چھٹکارا دلانے کی غرض سے مذکورہ بالا اصول کو تسلیم کرنے اور اس کا نفاذ کرنے کے لئے قانون سازی ضروری ہے۔

فسخ نکاح سے متعلق ایک اور بات رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ برطانوی ہندوستان میں عدالتوں نے یہ فیصلے صادر کئے کہ ایک مسلمان عورت کے مرتد ہو جانے کی صورت میں نکاح فسخ ہو جاتا ہے، وکیلوں کی انجمن (بار) نے متعدد بار اس نظریہ کو چیلنج کیا ہے لیکن عدالتیں مسلم قانون کی غلط تشریح کے تحت دی گئی رولنگ کو بطور نظیر مان کر ایسے ہی فیصلے کئے جا رہی ہیں، علماء نے فتوے دئے ہیں کہ عورت کے مرتد ہو جانے کی صورت میں اس کا نکاح فسخ نہیں ہوتا، مسلم فرقے نے بھی عدالت کے ان فیصلوں پر اپنی انتہائی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے، اخبارات میں متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ عدالتوں نے جو غلطیاں کی ہیں ان کی اصلاح کے لئے قانون بنایا جائے لہذا اس بل میں شامل کرنے کے لئے کلاز (۵) (اب) ملاحظہ ہو دفعہ-۴) کی تجویز کی جاتی ہے۔

اس بل کے ذریعہ فسخ نکاح سے متعلق جملہ قوانین کو یکجا اور متحد کر دیا گیا ہے اس امید کے ساتھ کہ اس سے ہندوستانی مسلمانوں کی ایک پرانی ضرروت پوری ہو جائے گی۔

۱۹۳۹ء کا ایکٹ (۸)

فسخ نکاح کا بل اسمبلی میں پاس ہوگیا اور ۱۷/مارچ ۱۹۳۹ء کو اسے منظوری بھی حاصل ہوگئی اور قانون کی کتاب میں اسے فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء (۱۹۳۹ء کا آٹھواں ایکٹ) کے طور پر درج کیا گیا۔

☆☆☆☆

فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء

(۱۹۳۹ء کا آٹھواں ایکٹ)

مسلم قانون کے تحت مسلم خواتین کی شادی کو فسخ کرنے کے قانون کی تشریح اور یکجا کرنے کے لئے ایکٹ نیز مسلم شادی شدہ خاتون کے اسلام ترک کرنے کی صورت میں اس شادی پر مرتب ہونے والے اثرات کی بابت شکوک کا ازالہ ہوگیا یہ قرین مصلحت ہے کہ مسلم قانون کے تحت شادی شدہ خواتین کے فسخ نکاح سے متعلق قانون کی وضاحت کی جائے اور اسے یکجا کر دیا جائے اور شادی شدہ مسلم خاتون کے ترک اسلام کی صورت میں اس کے ازدواجی رشتہ کی بابت شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جائے، بنابریں حسب ذیل طور پر قانون بنایا جاتا ہے۔

ا۔ مختصر عنوان اور دائرہ اثر

(۱) اس قانون کو فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء کہا جائے گا۔

(۲) اس کا اطلاق پورے ہندوستان پر ہوگا سوائے ریاست جموں اور کشمیر۔

ریاستی ترمیم

پانڈیچری - دفعہ (۱) کے تحت ذیلی دفعہ (۲) کے بعد حسب ذیل اضافہ کیا جائے (اس شرط کے ساتھ کہ اس ایکٹ کی مندرجات کا نفاذ پانڈیچری کے ترک تعلق کرنے والوں پر نہیں ہوگا)۔ دیکھئے پانڈیچری (قانون کی توسیع ایکٹ ۱۹۶۸ء کی دفعہ (۳)۔

۲۔فسخ نکاح کی عدالتی ڈگری لینے کی وجوہات

ایک مسلم خاتون جس کی شادی مسلم قانون کے تحت ہوتی ہے وہ مندرجہ ذیل وجوہات واسباب میں سے کسی ایک یا متعدد اسباب کی بنا پر فسخ نکاح کے لئے عدالتی ڈگری لینے کی حقدار ہوگی۔

۱۔یہ کہ چار سال سے زیادہ مدت سے اس کے شوہر کے بارے میں کوئی پتا نہیں ہے۔

۲۔یہ کہ شوہر نے اسے نظر انداز کر دیا ہے اور دو سال سے نان ونفقہ نہیں دیا ہے۔

۳۔یہ کہ شوہر کو سات سال یا اس سے زیادہ کی سزائے قید ہوئی ہے۔

۴۔یہ کہ شوہر نے تین سال سے زیادہ مدت سے بغیر کسی معقول وجہ کے ازدواجی ذمہ داریاں ادا نہیں کی ہیں۔

۵۔اور یہ کہ شوہر شادی کے وقت جماع پر قادر نہ تھا (یعنی نامرد تھا) اور بعد میں بھی ویسا ہی رہا۔

۶۔یہ کہ شوہر دو سال سے مجنون ہے یا برص کے مرض میں مبتلا ہے یا مہلک پوشیدہ بیماری میں مبتلا ہے۔

۷۔یہ کہ جب اس کے باپ یا دیگر سرپرستوں (ولی) نے اس کی شادی کی تو اس کی عمر پندرہ سال سے کم تھی لہذا ۱۸ر سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہونے والی شادی منسوخ ہے۔

اس شرط کے ساتھ کہ ازدواجی تعلق کی تکمیل نہیں ہوئی ہو۔

۸۔یہ کہ شوہر اس پر ظلم کرتا ہے یعنی:

(الف) مار پیٹ کرنے کا عادی ہے یا اپنے برتاؤ سے اس نے اس عورت کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے خواہ اس برتاؤ میں جسمانی ایذا رسانی شامل نہ ہو۔

(ب) بدنام عورتوں سے تعلقات رکھتا ہے یا بدنامی کی زندگی گذارتا ہے۔

(ج) اسے غیر اخلاقی زندگی گذارنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(د) اس کی جائداد کو فروخت کرتا ہے اس پر اسے قانونی حقوق پر عمل کرنے سے روکتا ہے۔

(ہ) اسے اس کے مذہبی فرائض وشعائر کی ادائیگی سے روکتا ہے۔

(د) اگر اس کے ایک سے زیادہ بیویاں ہیں تو وہ قرآنی حکم کے مطابق اس سے مساوات کا سلوک نہیں کرتا۔

۹۔کوئی اور وجہ جو مسلم قانون کے تحت فسخ نکاح (خلع) کے لئے جائز تسلیم کی گئی ہو، بشرطیکہ:

۱۔جب تک سزا کے بارے میں قطعی فیصلہ نہ ہو جائے کوئی عدالتی ڈگری نہیں دی جائے گی۔

۲۔(۱) کے تحت مندرج سبب کی بنا پر دی گئی عدالتی ڈگری تاریخ اجراء سے چھ ماہ کی مدت تک نافذ نہیں ہوگی، اور اگر اس مدت کے دوران شوہر خود حاضر ہو جائے یا اپنے بااختیار ایجنٹ کے ذریعہ عدالت کو یہ یقین دلائے کہ وہ اپنی ازدواجی ذمہ داریاں نبانے کو تیار ہے تو مذکورہ بالا ڈگری خارج کر دی جائے گی۔

(۲) اوپر مذکور اسباب میں سے سبب (۵) کے تحت ڈگری جاری کرنے سے پہلے عدالت شوہر کی درخواست پر یہ حکم جاری کرے گی کہ وہ ایک سال کے اندر عدالت کو مطمئن کرے کہ وہ اب نامرد نہیں ہے اور اگر شوہر اس بارے میں عدالت کو مطمئن کر دیتا ہے تو اس وجہ کے تحت کوئی ڈگری نہیں دی جائے گی۔

۳۔اس مقدمہ میں جس پر دفعہ (۲) کی کلاز (۱) کا اطلاق ہوتا ہو شوہر کا اتا پتا نہ معلوم ہونے کی صورت میں اس کے ورثاء (متعلقین) کو نوٹس جاری کرنا۔

(الف) ان افراد کے نام اور پتے استغاثہ کی عرضی میں پیش کئے جائیں گے جو

عرضی دائر کرنے کی تاریخ کو شوہر کے انتقال کر جانے پر مسلم قانون کے تحت اس کے وارث قرار پاتے ہوں۔

(ب) ان لوگوں پر عدالتی سمن کی تعمیل کرائی جائے گی۔

(ج) مقدمہ میں ان لوگوں کو اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہوگا۔

اس شرط کے ساتھ کہ شوہر کے چچا اور اس کے بھائی اگر کوئی ہوں تو ان کو بھی فریق مقدمہ بنایا جائے گا خواہ ان کا شمار ورثاء میں نہ ہو۔

۴۔تبدیلیٔ مذہب کے اثرات

اگر کوئی شادی شدہ مسلم خاتون مذہب اسلام ترک کر دے یا اسلام چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب کو قبول کر لے تو اس سے خود بخود اس کی شادی کالعدم نہیں ہو جائے گی۔

اس شرط کے ساتھ کہ ترک مذہب یا تبدیلیٔ مذہب کی صورت میں عورت کو حق حاصل ہوگا کہ وہ دفعہ (۳) کے تحت فسخ نکاح کے لئے عدالت سے ڈگری حاصل کر سکتی ہے۔

اس مزید شرط کے ساتھ کہ اس دفعہ کی مندرجات کا اطلاق ایسی عورت پر نہیں ہوگا جس نے اسلام قبول کیا ہو یا اپنے پہلے مذہب کو دوبارہ قبول کیا ہو۔

۵۔مہر کے حق میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی

فسخ نکاح کے وقت مسلم قانون کے تحت ایک شادی شدہ خاتون کو اپنے مہر یا اس کے کسی جزء پر جو اختیارات حاصل ہیں اس ایکٹ کی مندرجات سے ان حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

☆☆☆☆

قاضی ایکٹ ۱۸۸۰ء

تعارف

فقہ کی کتاب ہدایہ میں قاضی کے اہم اختیارات کو کسی قدر وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، قاضی دراصل جوڈیشیل افسران ہوتے تھے، جن کا تقرر ریاست کی طرف سے کیا جاتا تھا اور انہیں جج یا مجسٹریٹ کہا جا سکتا ہے، اس ملک میں برطانوی اقتدار سے قبل قاضی کی ذمہ داریاں کچھ شرعی اور کچھ دنیاوی نوعیت کی ہوتی تھیں، برطانوی اقتدار کے بعد جب ججوں اور مجسٹریٹوں کا تقرر ہوا تو قاضی کا عدالتی عہدہ ختم ہو گیا تاہم برطانوی سرکار نے قاضیوں کی جوڈیشیل پوزیشن کو تسلیم نہ کرتے ہوئے قاضیوں کا عہدہ سرکاری طور پر ختم نہیں کیا، بعض ضوابط کے ذریعہ ریاستی حکومت کی طرف سے قاضی القضاۃ اور قاضی کا تقرر کیا گیا اور ان کے غیر جوڈیشیل ذمہ داریوں کو از روئے قانون تسلیم کیا گیا، ۱۸۶۴ء میں ایک ایکٹ (ایکٹ نمبر-۱۱) کے ذریعہ حکومت کی طرف سے قاضیوں کا تقرر اور ان کے غیر جوڈیشیل اختیارات کو منسوخ کر دیا گیا، لیکن اس ایکٹ سے ایک قسم کی دقت پیش آئی جس کا اندازہ ایکٹ پاس کرتے وقت نہیں کیا گیا تھا، لہذا مسلم فرقے کی مشکلات کا ازالہ کرنے کے لئے اسمبلی میں قاضی بل پیش کیا گیا۔

اسباب و مقاصد کا بیان

محمڈن لا کے تحت قاضی ایک جوڈیشیل افسر ہوتا تھا، اس کی ذمہ داریوں کا بیان ہدایہ میں قدرے وضاحت سے کیا گیا ہے، اس کا تقرر حکومت کی طرف سے کیا جاتا تھا اور

اسے ہمارے جج یا مجسٹریٹ کے مساوی سمجھا جاسکتا ہے، اس ملک میں برطانوی اقتدار سے قبل قاضی محمڈن لا کے تحت اپنی ذمہ داریوں کے علاوہ دیگر ذمہ داریاں بھی انجام دیتا تھا، اس کا کام جزوی طور پر شرعی اور جزوی طور پر دنیاوی ہوتا تھا ان ذمہ داریوں میں جائداد سے متعلق دستاویزات تیار کرنا، ان کی تصدیق کرنا، ان کی رجسٹری کرنا، نکاح پڑھانا اور دیگر رسوم وارکان کا ادا کرنا تھا، یہ واضح نہیں ہے کہ آیا یہ تمام ذمہ داریاں اس کے فرائض منصبی کا لازمی حصہ تھیں، غالباً ان رسوم وارکان کی انجام دہی قاضی کے سرکاری ملازم ہونے اور قانون کے تحت اس کی ذمہ دارانہ حیثیت کے سبب تھی اور قاضی ہونے کے ناطے اسے ان امور کی انجام دہی کے لئے زیادہ موزوں سمجھا جاتا تھا۔

دیسی حکمرانوں کے دور میں یہ قاضی کی پوزیشن تھی، برطانوی اقتدار آنے پر قاضیوں کی جگہ ججوں اور مجسٹریٹوں نے لے لی اور بطور جوڈیشیل، افسر قاضیوں کی حیثیت ختم ہوگئی، لیکن برطانوی سرکار نے قاضیوں کی جوڈیشیل حیثیت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی قاضی کا عہدہ ختم نہیں کیا، وقتاً فوقتاً ضوابط جاری کر کے ریاستی حکومت نے قاضی القضاۃ اور قاضیوں کا تقرر جاری رکھا اور ان کے غیر جوڈیشیل فرائض کو قانون کے تحت تسلیم کیا گیا، بنگال میں تو انہیں کچھ مزید ذمہ داریاں بھی سونپ دی گئیں، قانونی ضوابط کے تحت قاضیوں کی ذمہ داریاں کچھ اس قسم کی تھیں۔

۱۔ انتقال جائداد کی دستاویزات اور دیگر کاغذات تیار کرنا اور ان کی تصدیق کرنا۔

۲۔ نکاح پڑھانا اور طلاق کی کارروائی کی تکمیل کرنا۔

۳۔ مختلف مذہبی رسوم وارکان کی ادائیگی۔

۴۔ قرق کی ہوئی جائدادوں کی فروخت کی نگرانی کرنا، خیراتی اور دیگر قسم کی پنشن اور بھتوں کی ادائیگی کرنا۔

بعد کو کی گئی قانون سازی کے تحت اوپر درج پہلی اور آخری ذمہ داری ان مقاصد کے لئے خصوصی طور پر مقرر کردہ افسران کو سونپ دی گئی اور اب قاضیوں کے پاس کوئی کام

نہیں رہ گیا، لہذا ۱۸۶۴ء کے ایکٹ نمبر-۱۱ کے مطابق حکومت کی طرف سے قاضیوں کے تقرر سے متعلق تمام ضوابط منسوخ کر دئے گئے تاہم ان کے موروثی اور رسمی فرائض سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا اس مقصد سے ایکٹ میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا گیا جو حسب ذیل ہے۔

اس قانون کی کسی دفعہ کے تحت قاضی القضاۃ یا قاضیوں کو ان فرائض اور ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی جو محمڈن لا کے تحت انجام دینے کی ان سے درخواست کی جائے (ایکٹ نمبر-۱۱ کی دفعہ-۲) اس طرح ۱۸۶۴ء کے ایکٹ نمبر-۱۱ کے پاس ہونے سے یہ ثابت ہوگیا کہ مسلم فرقہ میں قاضی کی خاصی اہمیت ہے اور اس طرح اس کی بعض ذمہ داریاں بھی باقی رہ گئیں، اس سے پہلے اس کے عدالتی فرائض کے علاوہ جو اضافی ذمہ داریاں تھیں اب وہی اس کی اصل ذمہ داریاں بن گئیں اور کچھ علاقوں میں بعض مذہبی امور کی انجام دہی کے لئے قاضی کی حاضری ضروری سمجھی جاتی ہے۔

۱۸۶۴ء کے ایکٹ سے ایک مشکل پیش آئی جس کا اندازہ بل پاس کرتے وقت نہیں لگایا جاسکا، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا قاضی کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا تھا اور مدراس اور بمبئی ہائی کورٹوں کی جانب سے بھی یہ فیصلہ صادر کیا گیا ہے کہ قاضی کا تقرر سرکاری طور پر ہی ہونا چاہئے، لیکن ۱۸۶۴ء ایکٹ کے تحت حکومت نے قاضی کے تقرر کی ذمہ داری سے خود کو الگ کرلیا، ایکٹ کے مسودہ میں کہا گیا ہے کہ یہ قرین مصلحت نہیں ہوگا کہ سرکار قاضیوں کا تقرر کرے، اس طرح اب مشکل پیش آئی کہ حکومت جائز طریقوں سے کوئی تقرر نہیں کرسکتی، اس کے سبب مسلم فرقہ کو جو مشکلات پیش آرہی ہیں ان کی طرف مسلمانوں نے خصوصاً مدراس پریزیڈنسی کے مسلمانوں نے حکومت کی توجہ دلائی لہذا یہ محسوس کیا گیا کہ حکومت کی طرف سے دوبارہ قاضیوں کی تقرری کا عمل اپنے ہاتھ میں لینا ایک مناسب رعایت ہے جو مسلمانوں کو دی جانی چاہئے، پس اس مقصد کے لئے یہ بل تیار کیا گیا ہے، فی الحال اس کا نفاذ صرف مدراس میں ہی ہوگا کیونکہ وہاں اس کی زیادہ ضرورت محسوس کی جارہی ہے، تاہم اس میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر کسی جگہ کے مسلمان ایسا مطالبہ کریں تو وہاں کی

حکومت اس کا نفاذ کرسکتی ہے، اس سے قاضیوں کو قانونی حقوق یا فرائض حاصل نہیں ہوجاتے، اس کا مقصد محض مسلمانوں کے ایک مطالبہ کو پورا کرنا ہے کہ حکومت کی طرف سے قاضیوں کا تقرر کیا جائے، ان کی ذمہ داریوں کی بابت اس میں کچھ نہیں کہا گیا ہے وہ وہی ہوں گی جواب تک ہیں، اس کے کسی امکانی غلط استعمال کو روکنے کے لئے ایکٹ میں یہ استثنائی دفعہ شامل کردی گئی ہے، ''اس سے قاضی کو کوئی قانونی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے، اور شادی کے موقعہ پر اس کی حاضری لازمی نہیں ہوگی اگر وہاں اس کی حاضری مطلوب نہ ہو۔''

☆☆☆☆

قاضی ایکٹ ۱۸۸۰ء

(۹/جولائی ۱۸۸۰ء)

(۱۸۸۰ء کا ۱۲واں ایکٹ قاضی کے منصب پر افراد کی تقرری کا ایکٹ) چونکہ ۱۸۶۴ء کے ایکٹ نمبر-۱۱ کے ذریعہ (یہ ایکٹ ہندو اور مسلم لاء افیسرز اور قاضی القضاۃ اور قاضی کے عہدوں پر تقرری منسوخ کرنے اور سابقہ تقرر کو ختم کرنے کے لئے پیش کیا گیا تھا) یہ کہا گیا تھا کہ یہ بات قرین مصلحت ہے کہ قاضل القضاۃ یا شہر قصبہ پرگنہ قاضی کا حکومت کے ذریعہ کئے گئے تقرر کو منسوخ کردیا جائے، اس طرح اس ایکٹ کے تحت یہ تقرریاں منسوخ کردی گئیں، چونکہ ہندوستان کے بعض حصوں میں شادی وغیرہ کی تقریبات میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قاضی کی حاضری مطلوب ہوتی ہے، لہذا یہ امر قرین مصلحت سمجھا گیا کہ حکومت پھر سے قاضیوں کی تقرری کا اختیار حاصل کرے، چنانچہ اسی مقصد سے یہ ایکٹ بنایا گیا ہے، مختصر عنوان سے قاضی ایکٹ ۱۸۸۰ء کہا جائے گا۔

دائرہ اثر

فی الحال اس کا نفاذ ان علاقوں پر ہوگا جو کونسل گورنر قلعہ سینٹ جارج کی عملداری میں ہیں، لیکن دوسری صوبائی حکومتیں سرکاری نوٹیفکیشن جاری کرکے اپنے علاقے میں اس کا نفاذ کرسکتی ہیں۔

کسی مقامی علاقے میں قاضی کے تقرر کا اختیار

اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہو اور وہ حکومت سے قاضی یا قاضیوں

کے تقرر کا مطالبہ کریں اور حکومت اسے مناسب سمجھے تو وہ علاقے کے با اثر مسلمانوں کے مشورہ سے موزوں افراد کا بطور قاضی تقرر کرسکتی ہے، اگر کہیں پر یہ سوال پیدا ہو کہ کیا سرکار کی طرف سے اہل افراد کو قاضی کے منصب پر فائز کیا گیا تو اس تنازعہ کا حتمی فیصلہ صوبائی حکومت کرے گی۔

اگر کوئی قاضی اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت کا مرتکب ہو یا مسلسل چھ ماہ تک اس علاقہ سے غیر حاضر رہے، جہاں اس کے ذمہ قاضی کے فرائض انجام دینے کی ذمہ داری ہے یا کسی دوسرے علاقہ میں رہائش اختیار کرلے یا دیوالیہ قرار دیا جائے یا اپنا عہدہ چھوڑنا چاہتا ہو یا فرائض کی انجام دہی سے انکار کرے یا حکومت کی نگاہ میں ذمہ داریوں کے لئے نااہل قرار پائے یا جسمانی طور پر اپنے فرائض کی انجام دہی سے معذور ہو جائے تو حکومت اسے معطل یا برخاست کرسکتی ہے۔

نائب قاضی

اس ایکٹ کے تحت جس قاضی کا تقرر کیا گیا ہے وہ اپنی مدد کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ قاضی مقرر کرسکتا ہے جو اس علاقہ میں یا علاقہ کے کسی مخصوص حصے میں جس کا وہ قاضی ہے اپنے فرائض انجام دیں گے، قاضی اپنے نائبوں کو معطل یا برخاست کرسکتا ہے۔

اگر ایکٹ کی دفعہ-۲ کے تحت کسی قاضی کو معطل یا برخاست کیا جائے گا تو اسی کے ساتھ نائب قاضی بھی (اگر کوئی ہو) معطل یا برخاست شدہ سمجھے جائیں گے۔

اس ایکٹ کی مندرجات سے قاضیوں کو کوئی جوڈیشیل یا انتظامی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے، نہ کسی تقریب میں ان کی موجودگی لازمی ہوگی اور نہ کسی کو بطور قاضی کام کرنے سے روکا جائے گا۔

☆☆☆☆

مسلم خواتین (طلاق کی صورت میں حقوق کا تحفظ) ایکٹ ۱۹۸۶ء

تعارف

مقدمہ: محمد احمد خاں بنام شاہ بانو بیگم میں سپریم کورٹ نے فیصلہ صادر کیا کہ اگر مطلقہ عورت اپنی کفالت کرسکتی ہے تو عدت ختم ہونے پر نان ونفقہ کی ادائیگی کی شوہر کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی لیکن اگر عورت اپنے اخراجات کو برداشت نہیں کرسکتی تو اسے ضابطہ فوجداری ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت کارروائی کرنے کا حق حاصل ہوگی۔

مذکولا بالا فیصلے سے مطلقہ عورت کو نان ونفقہ دینے کی بابت مسلم شوہر کی ذمہ داریوں سے متعلق کچھ تنازعات پیدا ہوگئے، مذکورہ مقدمہ میں دئے گئے فیصلہ کو کالعدم کرنے کے لئے مسلم خواتین (طلاق کی صورت میں حقوق کی حفاظت) بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔

مقاصد و وجوہات کی بابت بیان

مقدمہ: محمد احمد خاں بنام شاہ بانو بیگم ودیگر (اے آئی آر ۱۹۸۵ء، ایس سی ۹۴۵) میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ اگرچہ مسلم قانون کے تحت ایک مسلمان شوہر اپنی مطلقہ عورت کو صرف عدت ختم ہونے تک نان ونفقہ دینے کا پابند ہے تاہم اس میں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت مندرجہ صورت حال پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے، عدالت نے فیصلہ دیا کہ مسلم لا کے مذکورہ بالا اصول کو ایسے کیسوں میں جہاں ایک مطلقہ عورت اپنی کفالت خود نہیں کرسکتی، اطلاق

کرنا غلط اور انصاف کے خلاف ہوگا، لہذا عدالت اس نتیجہ پر پہونچی کہ ایسے معاملات میں جہاں ایک مطلقہ عورت اپنی کفالت اپنے آپ کرسکتی ہو، وہاں عدت ختم ہونے پر نان ونفقہ کی بابت شوہر کی ذمہ داری ختم ہوجائے گی لیکن جو مطلقہ عورت اپنی کفالت کا بوجھ نہیں اٹھاسکتی اسے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت کارروائی کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

اس فیصلے کی وجہ سے مطلقہ عورت کو نان ونفقہ دینے کی ایک مسلم شوہر کی ذمہ داریوں کی بابت تنازعات پیدا ہوگئے ہیں، لہذا اس موقع پر طلاق کی صورت میں مسلم مطلقہ عورت کے حقوق اور اس کے مفاد کے تحفظ کی بابت صراحت کی جاتی ہے، اس بل میں مندرجہ ذیل دیگر امور کا بندوبست ہے۔

(الف) ایک مسلم مطلقہ عورت عدت کے دوران اپنے شابق شوہر سے اپنے لئے مناسب اخراجات اصول کرنے کی حقدار ہوگی، اور اگر اس پر اپنے ان بچوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی ہے جو طلاق سے پہلے یا طلاق کے بعد پیدا ہوئے ہوں تو ان بچوں کی تاریخ پیدائش سے دوسال کی مدت تک اسے ان بچوں کے لئے مناسب اخراجات ادا کئے جائیں گے، مہر اور ان تمام اثاثوں اور املاک پر بھی اس کا حق ہوگا جو اسے اس کے رشتہ داروں، سہیلیوں، شوہر اور شوہر کے رشتہ داروں سے ملے ہوں، اگر طلاق کے وقت اس عورت کو یہ فائدے حاصل نہیں ہوئے تو مجسٹریٹ کے روبرو استغاثہ دائر کرسکتی ہے کہ اس کے سابق شوہر کو ان اخراجات، مہر اور ان اثاثوں کی ادائیگی کے لئے حکم صادر کیا جائے۔

(ب) اگر ایک مسلم مطلقہ عورت عدت کے بعد اپنی کفالت کا بوجھ خود نہیں اٹھاسکتی تو مجسٹریٹ کو اختیار ہوگا کہ وہ اس مطلقہ عورت کے رشتہ داروں کو اس کے اخراجات کی کفالت کا حکم دے، یہ رشتہ دار اس تناسب سے اس کے خرچہ کا بار برداشت کریں گے جس تناسب سے اس عورت کی وفات پر مسلم قانون کے تحت اس کی جائداد کے وارث ہوں گے، اگر ان رشتہ داروں میں سے کوئی شخص (عورت/مرد) اپنے افلاس کے سبب خرچہ برداشت کرنے سے قاصر ہو تو مجسٹریٹ دیگر رشتہ داروں کو جو صاحب حیثیت ہوں حکم دے گا کہ وہ ان غریب

رشتہ داروں کے حصہ کا خرچہ بھی ادا کریں، لیکن اگر کسی مطلقہ عورت کے رشتہ دار نہ ہوں یا رشتہ دار ایسے صاحب حیثیت نہ ہوں کہ اس عورت کا خرچہ برداشت کرسکیں یا اپنے نادار رشتہ داروں کی طرف سے ادا کئے جانے والے حصہ کا بار ادائیگی برداشت کرنے کے قابل نہ ہوں تو مجسٹریٹ ریاستی وقف بورڈ کو حکم جاری کرے گا کہ اس مطلقہ عورت کو خرچہ کی ادائیگی کی بابت جو حکم جاری کیا گیا ہے اس کے مطابق خرچہ دے یا نادار رشتہ داروں پر عائد ہونے والے خرچہ کی رقم اس عورت کو ادا کرے۔

اس بل سے مندرجہ بالا مقاصد کا حصول مطلوب ہے

۱۹۸۶ء کا ایکٹ (۲۵)

مسلم خواتین (طلاق کی صورت میں حقوق کا تحفظ) بل پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پاس ہوا اور ۱۹/مئی ۱۹۸۶ء کو اسے صدر جمہوریہ کی منظوری حاصل ہوئی اور اسے صحیفہ قانون میں بعنوان مسلم خواتین (طلاق کی صورت میں حقوق کی حفاظت) ایکٹ (۱۹۸۶ء کا ۲۵ واں) کے طور پر شامل کیا گیا۔

☆☆☆☆

مسلم خواتین (طلاق ہونے پر حقوق کا تحفظ) ایکٹ ۱۹۸۶ء

(۱۹۸۶ء کا ۲۵ واں ایکٹ)

یہ ایکٹ ان مسلم خواتین کے حقوق کے تحفظ سے متعلق ہے جنہیں طلاق دے دی گئی ہے یا جنہوں نے اپنے شوہروں سے طلاق لے لی ہے، نیز ان امور سے متعلق جو اس سے متعلق ہوں یا ضمنی طور پر ابھریں یہ ایکٹ جمہوریہ ہند کی سینتیسویں سال میں پارلیمنٹ حسب ذیل طور پر مرتب کرتی ہے۔

۱۔ مختصر عنوان اور دائرۂ عمل

(۱) اس ایکٹ کو مسلم خواتین (طلاق ہوجانے پر حقوق کی حفاظت) ایکٹ ۱۹۸۶ء کہا جائے گا۔

(۲) صوبہ جموں وکشمیر کو چھوڑ کر پورے ہندوستان میں نافذ العمل ہوگا۔

۲۔ تعریف

اس ایکٹ میں جب تک کہ عبارت بصورت دیگر مطلوب نہ ہو۔

(الف) مطلقہ عورت سے مراد وہ مسلمان عورت ہے جس کی شادی مسلم قانون کے تحت عمل میں آئی تھی اور اب اسے طلاق دے دی گئی یا اس نے مسلم قانون کے تحت اپنے شوہر سے طلاق حاصل کر لی ہو۔

(ب) عدت کی مدت سے مراد ہے کہ مطلقہ عورت

(ب ''الف'') (اگر اسے ماہواری آتی ہو تو طلاق دئے جانے کی تاریخ سے تین

ماہواری کی مدت۔

(ب ''ب'') اگر ماہواری نہیں آتی ہے تو تین قمری مہینے جو طلاق دینے کی تاریخ سے شروع ہوں۔

(ب ''ج'') اگر طلاق کے وقت وہ حاملہ ہے تو طلاق اور وضع حمل یا حمل ساقط ہونے (جو بھی پہلے واقع ہو) کی درمیانی مدت۔

(ج) مجسٹریٹ سے مراد وہ مجسٹریٹ درجہ اول ہے جسے تعزیرات ہند ۱۹۷۳ء کے تحت اس علاقے میں جہاں وہ مطلقہ عورت رہتی ہے عدالتی امور کے اختیارات حاصل ہوں۔

(د) مقررہ سے مراد اس ایکٹ کے تحت مقرر کردہ قواعد۔

۳۔ مطلقہ عورت کا مہر اور دیگر جائدادیں (اثاثہ جات) جو بوقت طلاق اسے دئے جائیں گے اس وقت جو بھی قانون نافذ العمل ہو اس کی مندرجات کے باوجود ایک مطلقہ عورت کو حق حاصل ہوگا کہ:

(الف) عدت کے دوران اس کے سابق شوہر کی طرف سے اس عورت کو معقول نان ونفقہ خرچہ صرف کا بندوبست کرنا ہوگا۔

(ب) ان حالات میں جہاں اس عورت کو ان بچوں کی پرورش بھی کرنی ہے جو طلاق سے قبل یا بعد کو پیدا ہوئے ہوں تو سابق شوہر کو ان بچوں کی تاریخ ولادت سے دو سال کی مدت تک ان کی کفالت کے لئے بھی معقول اور مناسب بندوبست کرنا ہوگا۔

(ج) مہر کی رقم یا اس کے مساوی جو شادی کے وقت یا اس کے بعد باہمی رضامندی سے اسلامی قانون کے تحت ادا کرنا طے کیا گیا ہو۔

(د) وہ تمام اثاثہ جات جو شادی سے قبل شادی کے موقع پر یا شادی کے بعد اس عورت کو اس کے رشتہ داروں، سہیلیوں، شوہر یا شوہر کے کسی رشتہ دار یا دوست نے دئے ہوں۔

۲۔اگر طلاق دینے کے بعد شوہر اسے معقول خرچہ صرفہ نان ونفقہ نہیں دیتا یا مہر اور وہ املاک اسے واپس نہیں کرتا جن کا اوہر (ا-د) میں ذکر کیا گیا ہے تو وہ عورت ان کی ادائیگی کے لئے مجسٹریٹ کے روبرو استغاثہ دائر کرسکتی ہے۔

۳۔اگر مذکورہ ذیلی دفعہ (۲) کے تحت استغاثہ کی درخواست پیش کی گئی تو مجسٹریٹ اگر مطمئن ہے کہ:

(الف) مناسب وسائل ہوتے ہوئے بھی شوہر نے عدت کے دوران اس عورت کے لئے معقول خرچہ صرفہ، نان ونفقہ اور اس کے بچوں کی کفالت کا کوئی انتظام نہیں کیا اور اس کی ذمہ داری سے غفلت کی۔

(ب) اس کا مہر ادا نہیں کیا گیا ہے یا وہ املاک واثاثہ جات جن کا اوپر ذیلی دفعہ (ا) کی کلاز (د) میں مذکور ہے اس کے حوالے نہیں کئے گئے ہیں تو استغاثہ دائر کئے جانے کی تاریخ سے ایک ماہ کے اندر سابق شوہر کو حکم جاری کرے گا کہ وہ مطلقہ عورت کو مناسب اور معقول نان ونفقہ خرچہ صرفہ ادا کرے جو مناسب اور اس معیاری زندگی کے مطابق ہو جس کی وہ عورت شادی کے دوران عادی تھی، نیز شوہر کے وسائل کے مطابق بھی ہو، نیز مہر کی ادائیگی اور اوپر ذیلی دفعہ (ا) کی کلاز (د) کے تحت مذکور املاک واثاثہ جات کی ادائیگی کی جائے۔

اس شرط کے ساتھ اگر مجسٹریٹ مذکورہ مدت کے دوران استغاثہ کی درخواست پر کارروائی کو ناقابل عمل پائے تو وہ تحریری طور پر اسباب کی وضاحت کرکے اس مدت کے گذر جانے کے بعد اس درخواست کے معاملہ کو ختم کرسکتا ہے۔

۴۔اگر کوئی شخص جس کے خلاف ذیلی دفعہ (۳) کے تحت حکم جاری کیا گیا ہے، بغیر کسی معقول وجہ کے تعمیل حکم نہیں کرتا تو مجسٹریٹ تعزیرات ہند ۱۹۷۳ء میں جرمانے وغیرہ عائد کرنے کی مندرجات کے تحت مہر کی رقم یا نان ونفقہ کی رقم کی ادائیگی کے لئے وارنٹ جاری کرسکتا ہے اور اگر شخص مذکور اجرائے وارنٹ کے بعد کلی یا جزوی طور پر رقم ادا کرنے سے قاصر رہے تو اسے ایک سال تک قید کی سزا دے سکتا ہے یا اس مدت سے قبل تک کے لئے

جبکہ رقم کی ادائیگی کی جائے بشرطیکہ اس شخص کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے، یہ سزا مذکورہ تعزیرات کی دفعات کے تحت سنائی جائے گی۔

۴۔خرچہ کی ادائیگی کے لئے حکم جاری کرنا

(ا) اس ایکٹ میں مذکورہ بالا دفعات یا کسی دیگر قانون کی جو نافذ العمل ہو، کی مندرجات کے باوجود اگر مجسٹریٹ مطمئن ہے اور مطلقہ عورت عدت گذارنے کے بعد اپنا خرچہ خود برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے تو وہ ان رشتہ داروں کو جو اس عورت کی وفات پر اس کے ترکہ کے وارث ہوں گے یہ حکم جاری کرسکتا ہے کہ وہ عورت مذکور کو اس کی ضروریات اور اسی معیار زندگی کی مطابق جس کا تعین اس حکم میں کیا جائے، خرچہ ادا کریں، یہ خرچہ وہ رشتہ دار اس تناسب سے ادا کریں گے جس تناسب سے وہ اس عورت کے ترکہ میں حصہ دار ہوں گے۔

اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس مطلقہ عورت کے بچے ہوں تو مجسٹریٹ صرف ان بچوں کو حکم دے گا کہ وہ اس عورت کا خرچہ اٹھائیں اور اگر کوئی بچہ یا بچے یہ بار کفالت برداشت کرنے سے قاصر ہوں تو مجسٹریٹ اس عورت کے والدین کو حکم دے گا کہ وہ اس خرچہ کے کفیل ہوں۔

اس مزید شرط کے ساتھ کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک اپنی مالی بے بضاعتی کے سبب خرچہ کا اپنا حصہ دینے سے معذور ہے جس کا مجسٹریٹ نے حکم صادر کیا ہے تو اس امر کا ثبوت پیش کئے جانے پر وہ اس عورت کے ان دیگر رشتہ داروں کو جو مجسٹریٹ کے نزدیک صاحب حیثیت ہوں اس تناسب سے خرچہ ادا کرنے کا حکم جاری کرسکتا ہے جو وہ مناسب خیال کرے۔

(۲) اگر کوئی مطلقہ عورت اپنا خرچہ خود برداشت نہیں کرسکتی اور اس کے وہ رشتہ دار بھی نہیں ہیں جن کا حوالہ ذیلی دفعہ (ا) کے تحت کیا گیا ہے یا وہ رشتہ دار یا ان میں سے کوئی

خرچہ کی وہ رقم ادا کرنے کی حیثیت نہیں رکھتے جس کا مجسٹریٹ نے حکم جاری کیا ہے یا دیگر رشتہ دار خرچہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا جو مجسٹریٹ نے ذیلی دفعہ (۱) کے جملہ شرطیہ کے تحت مقرر کیا ہے تو مجسٹریٹ ریاستی وقف بورڈ کو جو وقف ایکٹ ۱۹۵۴ء کی دفعہ ۹/ کے تحت قائم کیا گیا ہے یا فی الوقت کسی اور قانون کے تحت قائم ہو، اور اس علاقہ میں کام کرتا ہو جہاں وہ مطلقہ عورت رہتی ہے، یہ حکم جاری کرسکتا ہے کہ وہ اس عورت کا خرچہ ادا کرے جس کا تعین مجسٹریٹ مذکور نے ذیلی دفعہ کے تحت کیا ہے یا اس رشتہ دار کے حصہ کی رقم ادا کرے جو اس کی ادائیگی سے قاصر ہے، یہ رقم اس طریقہ سے ادا کی جائے گی جو مجسٹریٹ متعین کرے۔

۵۔ ۱۹۷۴ء کی دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ کے تحت کارروائی کا اختیار

اگر دفعہ (۳) کی ذیلی دفعہ (۲) کے تحت دی گئی درخواست کی پہلی پیشی پر مطلقہ عورت اور اس کا سابق شوہر مشترکہ طور پر یہ علیحدہ علیحدہ حلف نامے یا کسی دیگر تحریری بیان جو مقررکردہ فارم پر داخل کیا گیا ہو یہ اعلان کریں کہ وہ تعزیرات ہند ۱۹۷۳ء (۱۹۷۴ء کا دوسرا ایکٹ) کی دفعہ ۱۲۵ تا ۱۲۸ کے تحت کارروائی چاہتے ہیں وہ یہ بیان عدالت میں پیشی کے دوران داخل کریں تو مجسٹریٹ اسی کے مطابق درخواست پر کارروائی کرے گا۔

تشریح: اس دفعہ کے تحت درخواست کی سماعت کی پہلی تاریخ سے مراد وہ تاریخ ہے جو مدعا علیہ کو حاضری کے لئے جاری کردہ سمن میں درج کی گئی ہو۔

۵۔ قواعد بنانے کا اختیار

اس ایکٹ کے مقاصد کی بجاآوری کے لئے مرکزی حکومت سرکاری گزٹ میں نوٹیفکیشن جاری کرکے قواعد مرتب کرسکتی ہے خصوصی طور پر اور اوپر مذکور اختیارات پر اثر انداز ہوئے بغیر، ان قواعد میں مندرجہ ذیل امور کا بندوبست ہوگا۔

(الف) حلف نامہ کا فارم یا کسی دوسری تحریری بیان کا فارم جو دفعہ (۵) کے تحت

داخل کیا جائے۔

(ب) اس ایکٹ کے تحت دائر کردہ درخواست پر کارروائی کا طریقہ جو مجسٹریٹ ان درخواستوں پر غور کرتے ہوئے بروئے عمل لائے، بشمول متعلقہ فریقین کو نوٹس جاری کرنا درخواست کی سماعت کے لئے تاریخ مقرر کرنا اور دیگر متعلقہ امور۔

(ج) کوئی دیگر معاملہ جس کو مقرر کیا جانا مطلوب ہو، یا مقرر کیا جائے، اس ایکٹ کے تحت مرتب کردہ ہر قاعدے کو جلد سے جلد پارلیمنٹ کے ہر ایک ایوان کے روبرو پیش کیا جائے گا جبکہ اس کا اجلاس مجموعی طور پر تیس دن کے لئے ہو رہا ہو خواہ یہ ایک سیشن پر مشتمل ہو یا دو، یا یکے بعد دیگرے ہونے والے سیشن ہوں اور اگر اوپر مذکور مسلسل سیشن کے فوراً بعد ختم ہونے والے سیشن سے قبل اگر دونوں ایوان ان قواعد میں کسی ترمیم پر متفق ہوں یا یہ فیصلہ کریں کہ قواعد نہ بنائے جائیں تو ان ضوابط کا نفاذ اس ترمیم شدہ شکل میں ہوگا یا پھر نہیں ہوگا جیسی بھی صورت حال ہو، تاہم ایسی کسی ترمیم و تبدیلی کا اس کارروائی پر اثر نہیں پڑے گا جو اس سے قبل اس ضابطہ کے تحت عمل میں آئی۔

۷۔ عبوری بندوبست

تعزیرات ہند ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۱۲۵ یا دفعہ ۱۲۷ کے تحت کسی مطلقہ عورت کی طرف سے دائرہ کردہ وہ ہر درخواست جو اس ایکٹ کے نافذ العمل ہونے کی تاریخ کو کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں زیر سماعت ہو تو اس ایکٹ کی مندرجات کے باوجود اور اس ایکٹ کی دفعہ (۵) کی مندرجات کی شرائط کے تحت مجسٹریٹ اس درخواست کا فیصلہ اس ایکٹ کے مطابق کرے گا۔

☆☆☆☆

کچی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء

(۱۹۳۸ء کا دسواں ایکٹ)

اس ایکٹ کے ذریعہ یہ طے کیا گیا ہے کہ ساری کچی میمن برادری پر وراثت اور جانشینی کے معاملات میں محمڈن لا کا اطلاق ہوگا۔

کیونکہ یہ مناسب ہے کہ تمام میمن برادری کو وراثت یا جانشینی کے معاملات میں محمڈن لا کے تحت لایا جائے، لہذا یہ ایکٹ حسب ذیل امور پر پاس کیا جاتا ہے۔

مختصر عنوان اور آغاز

اس ایکٹ کو کچی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء کہا جائے گا۔

۱۔اس کا نفاذ یکم نومبر ۱۹۳۸ء سے عمل میں آئے گا۔

۲۔کچی میمن برادری پر کچھ معاملات میں دفعہ (۳) کی شرائط کے تحت محمڈن لا کا اطلاق ہوگا، وراثت اور جانشینی کے معاملات میں کچی برادری پر محمڈن لا کا اطلاق ہوگا۔

۴۔استثناء-اس ایکٹ کے نافذ العمل ہونے سے پہلے واجب ہونے والے کسی حق، ذمہ داری، یا مقدمہ کی کارروائی یا اس کے حل پر اس ایکٹ کا اثر نہیں پڑے گا اور وہ کارروائی اور اس کے تصفیہ کے امور اسی طرح جاری رہیں گے گویا یہ بل پاس ہی نہیں ہوا ہے۔

☆☆☆☆

کچی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء

تعارف

کچی میمن برادری پر کچی میمن ایکٹ ۱۹۲۰ء کا نفاذ ہوتا تھا، لیکن اس برادری کا ایک چھوٹا طبقہ مسلسل مطالبہ کر رہا تھا کہ ان پر روایتی ضابطوں کا اطلاق ہونا چاہئے، یکسانیت لانے کی غرض سے یہ مناسب تھا کہ پوری کچی میمن برادری کو محمڈن لا کے تحت لایا جائے، لہذا اسمبلی میں کچی میمن بل پیش کیا گیا۔

اسباب ومقاصد کا بیان

کچی میمن ایکٹ ۱۹۲۰ء کو پاس ہوئے خاصی مدت گذر چکی ہے اور برادری کے کثیر افراد نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن ایک مختصر سی تعداد ایسے افراد کی بھی ہے جو اب بھی یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ روایتی قوانین کا نفاذ کیا جائے اس سے معاملات کے پیچیدہ ہونے کا اندیشہ ہے، لہذا یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے یہ بے حد مناسب ہوگا کہ پوری کچی میمن برادری کو محمڈن لا کے تحت لایا جائے گا، کچی میمن برادری کے لوگ اچھے مسلمان ہوتے ہیں اور ان کی عام خواہش یہ ہے کہ انہیں محمڈن لا کے تحت لایا جائے، اگر یہ بل پاس ہوگیا تو برطانوی ہندوستان میں کچی میمن برادری کے وراثت اور جانشینی سے متعلق امور کے حل میں یکسانیت پیدا ہوجائے گی، اس سے برطانوی ہندوستان کی عدالتوں میں مقدمات کا تصفیہ کرنے میں بھی بہت مدد ملے گی، کیونکہ تب وہ ایک منظور شدہ قانون کے تحت طے کئے جایا کریں گے جبکہ اس وقت ایسے مقدمات کا صحیح فیصلہ کرنے میں روایتی رسوم ورواج اور دستور

کے پیچیدہ راستوں سے گذرنا پڑتا تھا۔

لہذا یہ مناسب ہے کہ اس بل کو پاس کیا جائے۔

۱۹۳۸ء کا دسواں ایکٹ

کچی میمن بل قانون ساز یہ میں پاس ہوااور ۱۸/اپریل ۱۹۳۸ء کو اسے منظوری حاصل ہوئی اور قانون کی کتاب میں اسے دی کچی میمن ایکٹ ۱۹۳۸ء (۱۹۳۸ء کا دسواں ایکٹ)،((The Cutchi Memons Act,1938(10 of1938)) کے عنوان سے درج کیا گیا۔

☆☆☆☆

مصنف کتاب ایک نظر میں

نام : عتیق احمد

والد کا نام : حاجی محمد رفیق مرحوم

سن ولادت : ۱۹۵۴ء

تعلیمی لیاقت : دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت/سند افتاء

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء (تفسیر، حدیث، فقہ) ۱۹۸۰ء تا حال ۲۰۲۲ء

عہدے اور ذمہ داریاں:

(۱) سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی

(۲) سکریٹری مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

(۲) بانی وصدر معہد الشریعۃ لکھنؤ

(۳) رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ

(۴) رکن تاسیسی آل انڈیا ملی کونسل

(۵) رکن لیگل کمیٹی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

(۶) رکن تاسیسی المعہد العالی للقضاء والافتاء پھلواری شریف پٹنہ

(۷) رکن انسٹی ٹیوٹ آف انجیکٹیو اسٹڈیز دہلی

موبائل نمبر : 09839776083

مصنف کی چند دوسری تصنیفات

(۱) مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ شخصیت، افکار اور مکاتیب
(۲) علامہ محمد انور شاہ کشمیری - علوم و افکار
(۳) ہندوستان میں نفاذ شریعت
(۴) زکوٰۃ کے مصارف
(۵) زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک
(۶) تحقیق و تسہیل ازالۃ الشکوک، تصنیف حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (چار جلدیں)
(۷) تحقیق و تسہیل الحیلۃ الناجزۃ، تالیف حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
(۸) ہندوستان اور نظام قضا
(۹) ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کا مسئلہ
(۱۰) اصول مباحث (اجتہاد، عرف و عادت، ضرورت و حاجت وغیرہ اصول مباحث پر تحقیقی مقالات)
(۱۱) اسلامی نکاح
(۱۲) چند اصحاب عزیمت
(۱۳) دعوت اسلام - ایک اہم فریضہ

(۱۴) اسلامی سزائیں اور جرائم کی روک تھام
(۱۵) عیسائی مشنریز کی سرگرمیاں اور مسلمان
(۱۶) اسلام کا نظام میراث
(۱۷) حضرت علامہ شیخ رحمت اللہ کیرانویؒ مہاجر ملی - حیات و خدمات
(۱۸) دعوت فکر و عمل
(۱۹) طلاق --- کب؟ کیوں؟ اور کیسے؟
(۲۰) بابری مسجد کی شہادت، حقائق، واقعات، ذمہ داریاں
(۲۱) صحابی کی تعریف اور صحابہ کا مقام و مرتبہ کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ
(۲۲) عظمت صحابہ

☆☆☆☆

مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء
کے
مقاصد

۱۔ دور حاضر کے پیدا کردہ نئے مسائل نیز وہ قدیم احکام ومسائل جو بدلے ہوئے عالمی یا ملکی حالات میں از سر نو غور وخوض کے محتاج ہیں ان پر اجتماعی غور وخوض اور شرعی فیصلہ کی کوشش کرنا اور امت مسلمہ کو ان فیصلوں سے واقف کرانا۔

۲۔ دور حاضر میں جن مسائل اور سوالات پر سنجیدہ بحث وتحقیق کی ضرورت ہے ان کی فہرست سازی کرنا اور ان مسائل وسوالات پر محقق علماء وفقہاء اور باصلاحیت وحوصلہ مند فضلائے مدارس وجامعات سے کتابیں اور مضامین لکھوانا اور انہیں مختلف زبانوں میں شائع کرانے کی کوشش کرنا۔

۳۔ اسلام کی جن تعلیمات کے بارے میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں یا اعتراضات کئے جاتے ہیں ان موضوعات پر اطمینان بخش لٹریچر تیار کرنا اور پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اسے پھیلانے اور عام کرنے کی کوشش کرنا۔

۴۔ پوری دنیا اور خصوصا عالم عربی اور عالم اسلامی میں فقہ اور شریعت کے بارے میں جو تحقیقی ادارے یا فقہ اکیڈمیاں ہیں، ان کے سیمیناروں، کانفرنسوں اور تحقیقی کاموں سے واقف رہنے اور ان سے علمی رابطہ رکھنے کی کوشش کرنا اور ہندوستان کے ممتاز فقہاء وعلماء کو ان سے واقف کرانے کی کوشش کرنا۔

۵۔ اسلام کے عائلی قوانین (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ) کے بارے میں ایسی کتابیں اور مضامین تیار کرانا جن میں ان قوانین کی بھرپور وضاحت ہو، ان پر کئے جانے والے اعتراضات وشبہات کے اطمینان بخش جوابات ہوں، اور دوسرے عائلی قوانین سے ان کا موازنہ بھی کیا گیا ہو۔

۶۔ ہندوستان کی اعلی عدالتوں (سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ) کے مسلم پرسنل لا کے بارے میں دئے گئے مخالف شریعت فیصلوں کا قانونی اور شرعی جائزہ تیار کرانا اور اسے شائع کرانے کی کوشش کرنا۔

۷۔ دارالافتاء ندوۃ العلماء میں آنے والے اہم اور تحقیق طلب سوالات ومسائل کا تحقیقی جواب تیار کرنا۔

۸۔ دارالعلوم ندوۃ کے طلبہ میں فقہی ذوق ومزاج کو پروان چڑھانے کے لئے اہم فقہی موضوعات پر محاضرات، مقابلے، مذاکرے منعقد کرانا۔

۹۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کم از کم دو ہونہار فضلاء جن کی فقہ وافتاء میں اچھی صلاحیت ہو، انہیں معقول اسکالرشپ کے ساتھ تصنیفی تربیت کے لئے منتخب کرنا، اور ان سے فقہی موضوعات پر علمی وتحقیقی کام لینا تاکہ مستقبل میں وہ فقہی وشرعی موضوعات پر بہتر سے بہتر کام کرسکیں۔

۱۰۔ مذکورہ بالا مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے مختلف اقدامات کرنا، پروگرام بنانا، سیمینار اور کانفرنسیں منعقد کرانا، اسٹڈی گروپ تشکیل دینا، ورکشاپ منعقد کرنا، وغیرہ۔

☆☆☆☆